

مستقل اہمیت کی حامل معیاری اور گفتہ تحریریں

# سیارہ ڈائجسٹ

ستمبر 2014

لڑتے لڑتے ہو گئی گم  
ایک کی چونچ اور ایک کی دُم



**PDFBOOKSFREE.PK**

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور عظیم الشان پیشکش

# صدقات و خیرات نمبر

شائع ہو گیا ہے

قیمت: -/175

”کون ہے ایسا شخص جو اللہ تعالیٰ کو قرض دے تاکہ اللہ تعالیٰ اس کو بڑھا کر بہت زیادہ کر دے“ (القرآن)

☆..... قرآن وحدیث کی روشنی میں صدقہ خیرات کے احکامات اور مسائل

☆..... خیرات کرنے، صدقہ کرنے اور مفلسوں و ناداروں کو کھانا کھلانے

سے مال میں برکتیں اور اضافہ ہوتا ہے

☆..... غریبوں اور مسکینوں سے وہ سلوک کریں جو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے

☆..... ایمان افروز سچے واقعات سے مزین جن کو پڑھ کر آپ کی زندگی

میں انقلاب آجائے گا

☆..... ایک ایسی کتاب جو انشاء اللہ ہر گھر کی کامیابی اور فلاح کی ضمانت ہے

سیارہ ڈائجسٹ 240 ریواژ گارڈن لاہور۔

فون: 0423-7245412



# القرآن

بسم الله الرحمن الرحيم

## سورة الانعام

تم سے پہلے بہت سی قوموں کی طرف ہم نے رسول بھیجے اور ان قوموں کو مصائب و آلام میں مبتلا کیا تا کہ وہ عاجزی کے ساتھ ہمارے سامنے جھک جائیں۔ پس جب ہماری طرف سے ان پر سختی آئی تو کیوں نہ انہوں نے عاجزی اختیار کی؟ مگر ان کے دل تو اور سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کو اطمینان دلایا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو خوب کر رہے ہو۔ پھر جب انہوں نے اس نصیحت کو جو انہیں کی گئی تھی، بھلا دیا تو ہم نے ہر طرح کی خوشحالیوں کے دروازے ان کے لیے کھول دیئے۔ یہاں تک کہ جب وہ ان بخششوں میں جو انہیں عطا کی گئی تھیں خوب مگن ہو گئے تو اچانک ہم نے انہیں پکڑ لیا اور اب حال یہ تھا کہ وہ ہر خیر سے مایوس تھے۔ اس طرح ان لوگوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی جنہوں نے ظلم کیا تھا اور تعریف ہے اللہ رب العالمین کے لیے (کہ اس نے ان کی جڑ کاٹ دی)۔

(آیہ ۴۲ تا ۴۵) (حوالہ تفہیم القرآن از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

## الحديث

بسم الله الرحمن الرحيم

والدین تمہاری جنت اور جہنم ہیں

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے حضور ﷺ سے دریافت کیا ”والدین کا حق ان کی اولاد پر کیا

ہے۔“

آپ ﷺ نے فرمایا ”وہ تمہاری جنت اور جہنم ہیں۔“

یعنی والدین کے حقوق ادا کرو گے، ان کی خدمت کرو گے تو جنت کے مستحق ہو گے اور اگر ان کا حق نہ پہچانو گے تو جہنم میں جاؤ گے۔

ایک دوسری حدیث اور قرآن مجید میں ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ ماں کا درجہ باپ کے مقابلے میں بڑھا ہوا ہے۔ قرآن مجید میں ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تاکید کے معا بعد ان مصیبتوں اور زحمتوں کا ذکر ہوا ہے جو ماؤں کو حمل کے زمانے میں، دودھ پلانے اور پالنے کے زمانے میں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔

(بحوالہ: مختصر صحیح بخاری)



## اس شمارے میں.....

2 القرآن ضیاء القرآن قرآن ایک مکمل ضابطہ حیات ہے!

3 الحدیث ادارہ والدین تمہاری جنت اور جہنم ہیں:

14 دستک امجد رؤف خان دشنام طرازی کا بڑھتا ہوا حجان

61 کاش یہ ممکن ہوتا آسان تھ کنول ایک لڑکی کی کہانی، وہ لا چاری ختم کر کے اپنے پیروں پر کھڑی ہونا چاہتی تھی!

65 میرا کشمیر..... میرا عشق فرخ صابری ”سیارہ ڈائجسٹ“ کے قارئین کے لیے ”جنت“ سے لایا ہوا اک توشہ خاص! (ادارہ)

79 نور عطیہ زاہرہ ایک قوم کی کتھا، جس نے اپنے نور کو بھلا کر اندھیروں کو مقدر کر لیا تھا!

17

## ہم اور ہمارے سیاسی رہنما

ڑتے ڑتے ہو گئی ٹم  
ایک کی چونچ اور ایک کی دم  
سیارہ رپورٹ



محید نظامی..... وہ عہد موجودہ  
میں سچ کا استعارہ تھے!

26 (سعد اللہ شاہ)

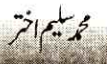


سلطان الہند خواجہ معین الدین اجمیری جو برصغیر کے عوام کے دلوں پر  
خواجہ غریب نواز کے نام سے شہرانی کرتے ہیں!



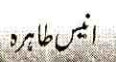
84 خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ  
پروفیسر غلام رسولؒ

ایک قاتل کے تعاقب اور انجام کی کہانی، پشتو ادب سے انتخاب!



93 ”عدالت“  
محمد سلیم اختر

ایک ثورت کی کہانی، وہ اپنے شوہر سے انتقام لینا چاہتی تھی!



129 وفاؤں کی قاتل  
انیس طاہرہ

معاشرے کی جھلک دکھاتے حقیقی واقعات، جن میں عقل والوں  
کے لئے عبرت کا سامان ہے!



139 کسی کی وفلی پر میرا گ  
نوشابہ اختر

ایک فوٹو گرافر کی کہانی جو رات کے اندھیرے میں قتل  
کے مناظر فلما تا تھا.....!



147 نیم شب.....!  
ایس۔ امتیاز احمد

”چھت کا سایہ..... موت لایا“

☆

58

تحریر: عارف محمود اہل

خواتین کا راز

☆ سیارہ کچن کا راز 168

شہر لاہور پر  
ایم اسلم

193

ستمبر 65ء کی جنگ میں لاہوریوں کی  
ہمت و حوصلہ کا آنکھوں دیکھا حال



ماہ ستمبر

135

حب الوطنی ایک جنوں.....!!

محسن علی



ایک فوجی کی کہانی، جو جذبہ  
حب الوطنی سے آشنا تھا

203

شوکت افضل

گمانِ وفا

ایک شخص کی دگدگاتی کہانی، جس نے  
جنتِ نظیر زندگی کا خواب دیکھا تھا!

حنّا اصغر

خواب

198



- 155 قانونی جرم یوسف جمال  
ایک وکیل کی زندگی کا انقلابی واقعہ، اُس نے کامیابی کا راز جان لیا تھا!
- 161 قصہ ایک شام کا جاوید بسام  
شرک ہومز کا دلچسپ واقعہ، اُسے اپنی قیادت شناسی کو جانچنے کا موقع ہاتھ آ گیا تھا!
- 172 بزم شاعری ادارہ  
باذوق قارئین کے کلام و انتخاب پر مبنی مقبول ترین سلسلہ!
- 178 شہنائی کے آنسو ابوضیا اقبال  
وہ اپنی زخمی ٹانگ لیے ایک ایک انچ بڑھنے لگا، اس نے ہاتھ لگا کر دیکھا، دھوئی خون میں لت پت ہو گئی تھی!
- 187 اسماء الحسنیٰ کامیابی کا راستہ پیر شاہ محمد قادری  
اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں سے آپ کے مسائل کا حل!

برسات میں پھلوں سے غذائیت  
38 اور رشفاحاصل کیجئے!  
126 ہائی بلڈ پریشر سے بچاؤ کی تدابیر  
صغیرہ بانو شیریں

حکیم راحت نسیم بوردی

ایک خطرناک مرض کے حوالے سے  
رہنما تحریر، جو انسان کا خاموش دشمن کہلاتا ہے!



حقیقت کہانی

97 ”اوہ وہ بدل گئی.....!“  
نواز خان

”وہ حوا کی بیٹی مرد کو حیران کرنا چاہتی تھی اور اس کے لیے کچھ بھی کر گزرتی تھی“

43 بچھو

جاوید رانی

جانوروں کے سوداگر کی کہانی، وہ ایک روز اپنے جال میں پھنس گیا تھا



جلد نمبر 51 - شمارہ نمبر 9 - ستمبر 2014ء

رکن آل پاکستان نیوز پیپر زسوسائٹی

www.facebook.com/sayaradigest  
Email: editorsayyara@yahoo.com  
sayyaradigest@gmail.com  
editorsayyara@hotmail.com  
Phone: 92-042-37245412  
Mobile: 0300-9430206

مستقل اہمیت کی حامل معیاری اور شگفتہ تحریریں

# سیارہ ڈائجسٹ

مدیر منتظم

مدیر اعلیٰ

کامران امجد خان

امجد رؤف خان

مدیر : محمد ثاقب

جویریہ کامران - رؤفی خان - فرحان امجد

سرکلشن منیجر : بشیر احمد

0333-4207684

خرم احمد خان -

نگران پرنٹنگ : خالد محمود

اللہ والا پرنٹرز شاہراہ قائد اعظم لاہور

طابع

0333-4207684

0300-4144781

0321-3758492

خرم احمد خان -

طارق محمود -

محمد عابد مرزا -

لاہور

کراچی

شعبہ اشتہارات

صغیرہ بانو شیریں رفیق غوری  
ریاض آفندی فیاض عمر عارف محمود اہل

مجلس مشاورت

امجد رؤف خان پبلشرز نے اللہ والا پرنٹرز سے چھپوا کر  
240 مین مارکیٹ ریواڑ گارڈن لاہور سے شائع کیا۔

قیمت  
80 روپے



معیار بھی لاثانی

نام بھی لاثانی



www.lasaniindustries.com



# عرق مہزل

## وزن گھٹانی صحت یابی

موٹاپے کو ہم ایک عرصہ تک صحت مندی سمجھتے رہے ہیں لیکن جدید تحقیق نے یہ ثابت کیا ہے کہ صحت اور موٹاپا دو الگ چیزیں ہیں موٹاپا نہ صرف بیماری ہے بلکہ بہت سی دیگر بیماریوں کی جڑ ہے لاثانی عرق مہزل ہر قسم کے موٹاپے کے لیے مفید ہے اس کو لاثانی فارما کی ریسرچ لیبارٹری کے تجربہ کار سٹاف نے جدید ریسرچ اور کامیاب ٹیسٹنگ کے بعد پورے اعتماد سے پیش کیا ہے مارکیٹ میں موجود دوسری ادویات سے ممتاز لاثانی عرق مہزل ہر قسم کے مبالغہ اثرات سے پاک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک بھر کے معالجین کی کثیر تعداد عرق مہزل پر بھرپور اعتماد کرتی ہے۔ اس کے اجزاء صحت یابی سے متعلق ہیں لیکن ان کو بہترین طریق اور تناسب سے موٹاپے کے علاج کے لیے پیش کرنے کا سہرا لاثانی کی ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ ٹیم کے سر ہے۔ لاثانی عرق مہزل کے استعمال سے موٹاپا ختم اور بہترین صحت حاصل ہوتی ہے۔ مریض کسی قسم کی کمزوری محسوس نہیں کرتا کیونکہ لاثانی عرق مہزل نہ تو جلاب آور ہے اور نہ ہی جھوک ختم کرتا ہے بلکہ طبعی طریقے سے جسم کی ساخت میں غیر ضروری تہہ جلی (موٹاپا) کو ختم کرتا ہے۔ مطلوبہ وزن کم کرنے کے بعد بھی اس کا استعمال وزن کو دوبارہ بڑھنے سے روکتا ہے اور آپ کو چاک و چوبند رکھتا ہے۔ لاثانی عرق مہزل کے استعمال کے ساتھ نچکائی سے پرہیز اور ورزش اس کے اثرات کو دو چند کر دیتے ہیں۔ جسمانی طور پر موٹاپے کی طرف مائل لوگ لاثانی عرق مہزل کے استعمال سے موٹاپے سے بچ سکتے ہیں۔

قرکیب استعمال:

بالغین: 30 ملی لیٹر (۱/۲ کپ) سے 20 ملی لیٹر (۱/۴ کپ) تین مرتبہ روزانہ

8 سال سے 13 سال تک:

15 ملی لیٹر (1/8 کپ) سے 30 ملی لیٹر (۱/۴ کپ) 3 مرتبہ روزانہ

عمومی خوراک: 20 ملی لیٹر (2 کھانے کے چمچ) 4 مرتبہ روزانہ

ہر قسم کے موٹاپے کی وجوہات کو کم کرنے کیلئے مؤثر دوا

فون: 042-36581200  
042-36581300  
فیکس: 042-36581400

پرائیویٹ  
لاثنی فارما

# آپ ادب نواز ہیں! آپ علم دوست ہیں!

ہم آپ کو سیارہ ڈائجسٹ کے تمام شمارے گھر بیٹھے

**520/-** پے

کی رعایت

بذریعہ رجسٹری ڈاک بھیجیں گے اور

آپ کو **520/-** روپے

کا فائدہ بھی ہوگا۔

**سیارہ ڈائجسٹ**

## سالانہ اخراجات کا تخمینہ

قیمت فی شمارہ: **80/-** روپے - سال بھر میں بارہ شماروں کی عام قیمت: **960/-** روپے

سال بھر کا ایئر میل رجسٹری ڈاک خرچ: **360/-** روپے - کل رقم: **1320/-** روپے

آپ صرف **800/-** روپے ہمیں ارسال کر دیں۔

سال بھر سیارہ ڈائجسٹ آپ کو گھر بیٹھے ملتا رہے گا۔

صرف یہ کوپن پُر کر کے حوالہ ڈاک کر دیجئے!



لیکن آپ اتنی  
رقم کیوں خرچ  
کریں

**اس پیشکش سے فوراً فائدہ اٹھائیں**

جناب منیجر صاحب۔ سیارہ ڈائجسٹ

براہ کرم مجھے ماہ..... سے سیارہ ڈائجسٹ ایک سال کیلئے جاری فرمادیں

**800/-** روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر ارسال کر رہا ہوں/ آپ مجھے **800/-** روپے کی

وی پی پی ارسال کر دیں۔ میں وصول کر لوں گا۔ نوٹ:- چیک قبول نہیں کیا جائے گا

نام..... پتہ.....

آپ یہ رقم اے ٹی ایم (ATM) اور منی ٹرانسفر کے دیگر طریقوں سے بھی ہمارے اکاؤنٹ نمبر 4-720 ایم سی بی

ریوازا گارڈن بینک کوڈ نمبر 1227 برانچ لاہور میں ٹرانسفر کر سکتے ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے رابطہ نمبر 042-37245412



## اظہار خیال



جبکہ واز خان ان سب باتوں سے بے نیاز ہیں۔ ایسے ہیرے قابل ستائش ہیں۔ والسلام  
(یاسمین کنول/پسرور)

## مشتاق احمد یوسفی کی لازوال تحریریں

محترم مدیر اعلیٰ احمد رؤف خان صاحب! السلام  
علیکم! سیارہ ڈائجسٹ اگست 2014ء کا ٹائٹل نظارہ  
کیجئے اللہ کی قدرت کا خوب سے خوب تر ہے۔ یقین  
کیجئے دل بہت خوش ہوا۔ اس کے بعد ”مشتاق احمد  
یوسفی“ کی لازوال تحریروں سے انتخاب سونے پر  
سہاگہ ہے۔ بہت بلند پائے کے رائٹر ہیں قاری کی  
نبض پر ہاتھ خوب رکھتے ہیں۔ پروفیسر غلام رسول  
نے بزرگان دین کے حالات زندگی کو جس خوبصورت  
اور اثر انگیز انداز سے تحریر کیا ہے۔ انہوں نے سیارہ  
ڈائجسٹ کو بلند مقام تک پہنچا دیا ہے۔ انتظار رہتا  
ہے۔ آخر میں گزارش کرنا چاہوں گا کہ کشف کے  
موضوع پر ایک نئی کہانی ”اللہ کے راز“ اشاعت کے  
لیے بذریعہ کوریئر سروس بھجوائی ہے۔ براہ مہربانی نوک  
پلک سنوار کر سیارہ ڈائجسٹ کی فریبی اشاعت میں  
شامل کر کے شکر یہ کا موقع دیں۔ والسلام  
(غلام نبی عارف)

## نواز خان

محترم جناب احمد رؤف خان! السلام علیکم! سیارہ  
ڈائجسٹ کا ہر قاری نواز خان صاحب سے ملنا۔ اُن کو  
دیکھنا اور اُن سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔ لیکن آپ نے  
اُسے نئی نویلی دہن کی طرح ہزاروں پردوں کے پیچھے  
چھپا کر رکھا ہے۔ ایسا کر کے آپ سیارہ ڈائجسٹ کے  
قارئین کے ساتھ بہت زیادتی کر رہے ہیں۔ آپ

## جادو ٹوٹنے کا خطرہ

محترم جناب ایڈیٹر صاحب! سدا خوش رہیں!  
السلام علیکم! اگست کا سیارہ خوبصورت اور دلکش سرورق  
کے ساتھ ملا۔ ”اللہ تعالیٰ کی قدرت کا نظارہ کیجئے“  
واقعی غور کرنا چاہیے۔ ایمان مضبوط ہوتا ہے دنیا کی  
حرص کم ہوتی ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کی تحریر واقعی  
لازوال ہے تم میری ہونڈھ کر احساس ہوا کہ صغیرہ  
بانو شیریں انجمنی رائٹر بھی ہیں، ہم صرف گھریلو ٹوکوں  
اور مفید باتوں کے حوالے سے انہیں جانتے تھے۔  
14 اگست کے حوالے سے ایس اقتیاز کی تحریر دریا  
سکھ زبردست رہی۔ جاوید احمد صدیقی کی ”ترتیب  
کا اثر“ بھی بہترین تحریر تھی۔ ”کالا جادو“ حافظ سعید کی  
خطرناک تحریر تھی۔ خطرناک اس حوالے سے کہ جادو  
کے بارے میں سننا پڑھنا سب خطرے سے خالی نہیں  
ہوتا ڈر خوف پریشانی کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ حال ہی  
میں میرے ایک عزیز اس طرح فوت ہو گئے ہیں  
تعویذوں کی معیاد شتم ہو چکی تھی اور وہ سوکھ سوکھ کر کاٹا  
بن چکے تھے اور آخر کار اسی حالت میں اللہ کو پیارے  
ہو گئے۔ مرحوم کی عمر صرف 37 سال تھی۔ ان کی تمام  
ڈاکٹری رپورٹ کلیئر تھیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت  
دے جو اس طرح کے جادو ٹوٹنے کرتے ہیں کہ انسان  
زندگی سے ہی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ ”گمان وفا“ شوکت  
افضل کی یادگار تحریر رہی، واقعی کہانی دلگداز ہے۔ نواز  
خان کی تحریر کا تو انتظار رہتا ہے اظہار خیال سے معلوم  
ہوا وہ شہرت نہیں چاہتے تصویر بھی شائع نہیں  
کروانا چاہتے اور انٹرویو بھی نہیں دینا چاہتے..... کیا  
بات ہے؟ اللہ تعالیٰ انہیں خوش رکھے سلامت رکھے۔  
ویسے دنیا تو شہرت کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہے،

کرتے ہوئے پرچے میں غزل لگا دیں اس کے ساتھ  
ہی اجازت چاہتا ہوں زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات  
ہوگی۔ والسلام

(محمد اسلم جاوید)

### سیاسی رہنماؤں کیلئے دُعا

جناب محترم مدیر صاحب! السلام علیکم! امید ہے  
مزارِ گرامی بخیر ہوگا! ماہ رواں کا ”سیارہ ڈائجسٹ“  
ہمارے سامنے ہے۔ اس بار خاص طور پر ٹائٹل بہت  
خوبصورت ہے۔ ٹائٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے بھی  
خوب رہے، مضامین اور غزلوں کا انتخاب لاجواب  
رہا۔ ہماری تحریروں کو جگہ دینے کا شکریہ، مزید مواد  
ارسال خدمت ہیں۔ پلیز قریبی اشاعت میں جگہ  
دیں۔ آپ کو اور دیگر شاف اور ”سیارہ ڈائجسٹ“  
کے تمام خوبصورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام  
خوبصورت بڑھنے والے قارئین کو دعا سلام۔

اللہ تعالیٰ ہمارے ملک کے حالات بہتر کرے  
اور سیاسی رہنماؤں کو ملک کے لیے ملکر کام کرنے کی  
توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

(ایس۔ امتیاز احمد / کراچی)

### فرد کی ذمہ داری

محترمی و مکرمی مدیر صاحب! السلام علیکم! اگست کا  
شمارہ رنگارنگ کی تحریروں لیکر آوارہ ہوا۔ ہر شمارہ پچھلے  
سے بہتر ہوتا جا رہا ہے۔ یہ آپ تمام لوگوں کی انتھک  
محنت اور مواد کا چٹا انتہائی عرق ریزی سے کرنے  
کا ثبوت ہے۔ ممتاز مزارِ نگار مشتاق احمد یوسفی کی  
تحریروں کا انتخاب انتہائی خوبصورتی سے کیا گیا تھا۔  
مزہ آگیا۔ تفرقہ بازی کے خوالے سے قلندر صاحب  
نے مولانا حضرات کا شکوہ کیا ہے مگر یہ بھی حقیقت  
ہے کہ یہ علماء کرام تو آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔  
اصل میں تو ہم عوام میں سے ہر ایک تو سدھرتا ہوگا۔

مہربانی کر کے کبھی کبھی اُن کی فوٹو کے ساتھ اُن کا مختصر  
سائٹلوپوشائع کرتے رہیں۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا  
تو بہت جلد قارئین سیارہ ڈائجسٹ کے ذہنوں میں  
نواز خان صاحب ایک حقیقی شخصیت کی بجائے ایک  
افسانوی شخصیت بن جائیں گے۔

(محمد کمال / مردان)

### انگوٹھی میں نگینے

مکرمی جناب امجد رؤف خان! السلام علیکم! آپ  
کی خیریت اور عافیت کے لیے نیک تمناؤں کے ساتھ  
دعا گو ہوں۔ چند دن ہوئے شہر ضروری کام کے سلسلے  
میں جانا ہوا، وہاں بک شال پر تازہ پرچہ دیکھ کر میرا  
دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ ایسا کامیاب ڈائجسٹ  
نکلانے پر میری جانب سے دلی مبارکباد قبول کریں۔  
اس مہنگائی کے دور میں ایسا خوبصورت اور معیاری  
تحریروں سے مزین جس کا اپنا ایک منفرد معیار ہے اس  
کے تمام سلسلے اپنی اپنی جگہ پر انگوٹھی میں نگینے کی طرح  
فٹ ہیں۔ ہر ماہ کے آخر پر ہمیں پرچے کا بڑی بے  
تابی سے انتظار ہوتا ہے۔ کافی عرصے کے بعد آپ کو  
خط تحریر کر رہا ہوں۔ معذرت خواہ ہوں۔ میں اس کا  
ایک پرانا قاری ہوں۔ اس بار بزمِ شاعری میں غزلیں  
اچھی تھیں دیگر تمام تحریریں بھی بہت اچھی تھیں۔ آپ  
نے کافی عرصے سے ہمیں نہیں کیا۔ ہم نے بھی ہمت  
کر کے آپ کو یاد کیا چند غزلیں ارسال کر رہا ہوں کسی  
قریبی شمارے میں جگہ دے دیں۔ امید ہے کہ آپ  
پہلے کی طرح میری حوصلہ افزائی کریں گے۔ بشرطیکہ  
آپ کا ہمارے ساتھ تعاون ہو خط سے آدمی ملاقات  
ہو جاتی ہے۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے اور صحت دے  
تحریر میں کوئی خامی ہو تو معذرت خواہ ہوں آپ کی  
زندگی میں سدا رنگ برنگے پھول مہکتے رہیں۔ خدا  
آپ کو اپنی اماں میں رکھے۔ اس دفعہ آپ ہمارا خیال

کراچی میں مقیم ہوں۔ ہر ماہ سیارہ ڈائجسٹ انتہائی رغبت اور شوق سے پڑھتا ہوں۔

اگر آپ اجازت عنایت فرمائیں تو بچوں کی کچھ اپنی کہانیاں یا بڑوں کے افسانے کہانیاں انشائیے روانہ کروں؟؟ الحمد للہ خود ای میل کمپوزنگ کر لیتا ہوں، عمر عزیز ۵۳ سال سے اوپر ہے، ایسوی ایٹ پروفیسر ہوں مگر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جوانوں سے بہتر ہوں۔ لکھنے لکھانے کا شوق چالیس سال سے زیادہ عرصہ سے جاری و ساری ہے، کالج کی لائبریری میں بھی سیارہ اور دیگر ڈائجسٹ منگواتا ہوں اور نسل نو کو پڑھنے پر مجبور کرتا ہوں۔ اگست کے شمارے میں جناب مشتاق احمد یوسفی، محترمہ صغیرہ بانو شیریں اور دیگر کی بہترین تحریروں نے متاثر کیا۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو ایمان و ایقان کی بہترین حالتوں میں رکھے، آمین مخلص۔

(پروفیسر ڈاکٹر مجیب ظفر انوار حمیدی / کراچی)

### معلوماتی سلسلے

محترم مدیر سیارہ ڈائجسٹ! السلام علیکم! سیارہ ڈائجسٹ سے میرا تعلق بہت پرانا ہے۔ شاید تیس سال سے زیادہ عرصہ سے یہ میرے زیر مطالعہ ہے۔ میں نے اس کے مختلف دور دیکھے ہیں اور اس بات کا گواہ ہوں کہ سیارہ ڈائجسٹ نے بھی اپنی اقدار اور اصولوں کی خلاف ورزی نہیں کی۔ دستک اور کورسوری کے صفات میں سیاسی موضوعات پر بھی ہمیشہ وطن اور قوم کے مفاد کو سامنے رکھ کر قارئین کی رہنمائی کی گئی۔ نہ کہ کسی خاص سیاسی جماعت کی طرف جھکاؤ دکھایا گیا۔ کہانیاں اور مضامین بھی بہت شاندار رہے ہیں۔ مگر کچھ عرصہ سے میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ سیارہ ڈائجسٹ میں معلوماتی سلسلے کچھ کم ہو گئے ہیں۔ زیادہ عرصہ کی بات نہیں جب اس

کیونکہ من حیث القوم ہر بندہ دل میں بغض، حسد، جلاپا، تکبر اور پھلتے پھولنے لوگوں کو دیکھ کر جل جانے کا زہم لیے ہوئے ہے۔ غلیظ سطح پر ہر طبقے کی اصلاح چاہیے اور اس کے لیے جب تک ہر شخص ہر فرد تعلیم کی طرف نہ آئے گا وہی مشور کیسے حاصل ہوگا۔ تعلیم ہی سے اچھے برے کی تمیز ہوتی ہے۔ جب پوری قوم اچھے کی طرف جائے گی تو ہر کوئی اچھائی ہی کا سوچے گا۔ اللہ تعالیٰ ایسا ہی کر دے (آمین)

دستک میں امجد رؤف صاحب نے نہایت گہمیر اور اصلاح طلب فیشن کا ذکر کیا ہے۔ یہ شوخ بازی یہ لالباہی پن اور قانون توڑ کے تکبر کرنے والے جب تک سختی سے ٹھیک نہ کیے جائیں گے پوری قوم کبھی بھی نہ ٹھیک ہوگی۔ تعلیم کا حصول اور پھر بغیر لالچ کے قانون پر سخت ترین عمل درآمد کروانے کا وقت نہ آئے گا تو یہ کیسے سب ٹھیک ہوگا۔ آپ کی درد مندانہ تحریر کا ش کام کر جائے اور معاشرہ بھی ایک بہتر سمت کی طرف رواں دواں ہو۔ تحریروں تو ایک سے بڑھ کر ایک ہیں مگر شوکت افضل، ایس اتنازا مدیحہ اصغر اور عارف محمود اہل کی تحریروں کو خراج تحسین پیش نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ ایک عدد اور کہانی ارسال ہے معیاری ہو تو ضرور جگہ دیجئے گا۔ تمام احباب مجلس کو بے حد ادب اور دعائیں۔ مخلص (جاوید احمد صدیقی)

### جوانوں سے بہتر

جناب محترم امجد رؤف خان صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ! سیارہ ڈائجسٹ میرے والد (مرحوم) سید انوار حسین حمیدی صاحب انتہائی شوق سے پڑھتے تھے اور اس میں لکھا بھی کرتے تھے۔ میں نے بچوں کے ادب پر اپنی انج ڈی کیا اور عرصہ سے ایک سرکاری کالج میں پڑھا رہا ہوں،



آیات بھی ہوتی ہیں۔ اس لیے اشتہارات شامل نہ ہوں تو بہتر ہے۔ صدقات و خیرات نمبر انتہائی اہم اور قابل قدر کاوش ہے۔ مجھے یہ خصوصی نمبر پڑھ کر پہلی بار صدقات کی اہمیت کا صحیح طور پر اندازہ ہوا کہ یہ کیسے آنے والی مشکلات اور مصائب کو ٹال دیتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ اور اولیاء اللہ نے ہمیشہ صدقہ و خیرات کی سنت پر عمل کیا اور اپنے مال کو پاکیزہ اور بابرکت بنایا۔

(ریاض ملک / لاہور)

☆ ریاض ملک صاحب! ہماری ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ اشتہارات جو کسی بھی اشاعتی ادارے کی بقا کے لیے ناگزیر ہیں ان کی اشاعت میں احتیاط سے کام لیں۔ تاہم انہیں مکمل طور پر بند کرنا ممکن نہیں ہے۔

### انتظار کی کیفیت

کمری امجد رؤف خان صاحب! السلام علیکم! سیارہ ڈائجسٹ اگست 2014ء کے شمارے میں شوکت افضل صاحبہ کی کہانی گمانی وفا پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ مگر جب کہانی کا اصل مزہ آنا شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ تو قسط وار کہانی ہے، یعنی اب اس کی اگلی قسط کے لیے آئندہ ماہ تک کے لیے انتظار کرنا پڑے گا۔ ایک عجیب انتظار کی کیفیت میں آپ نے جتلا کر دیا ہے۔ بہر حال شوکت افضل صاحبہ تک ہمارے جذبات پہنچا دیجئے کہ ان کی یہ کہانی بھی سابقہ کہانیوں کی طرح بے حد اثر انگیز ہے اور قاری کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ پچھلے کچھ شماروں سے قارئین پروف کی غلطیوں کی نشاندہی کر رہے تھے مگر اس بار غلطیاں نہ ہونے کے برابر ہیں جس پر آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

(شازیہ عابد / لاہور)

ماہ کے واقعات اور تنسیم اور صلحہ کے ترتیب شدہ الفاظ اور اُن کا مفہوم جیسے مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح ماضی میں بھی ”تج کو یہ ہے“ اور ”سوال جواب“ جیسے سلسلے شائع ہوتے رہے ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ ایسے سلسلے پھر شروع کیجئے تاکہ ہم جیسے پرانے قارئین کے ذوق کا سامان بھی ہوتا رہے۔ ویسے آپ جو آج کل کی نئی تحقیقات اور جدید معلومات کے حوالے سے مضامین شائع کر رہے ہیں وہ بھی بہت اچھے ہیں۔ نیز میں خاص طور پر ذکر کرتا چاہوں گا کہ سیارہ ڈائجسٹ نے ان دنوں نکوشنز میں جو معلوماتی اور پُرسپ چیزیں دینا شروع کی ہیں وہ بھی بہت کارآمد ہیں۔

(نعیم اللہ خان / لاہور)

☆ نعیم صاحب! آپ کی تہاویز کا بہت شکریہ، ہم ان پر جلد از جلد عمل کرنے کی کوشش کریں گے۔

### خصوصی نمبر اور اشتہار

جناب امجد رؤف خان صاحب! السلام علیکم! سیارہ ڈائجسٹ جو خصوصی نمبر شائع کرتا ہے اُن کی مقبولیت اور اہمیت کے بارے میں سب کو معلوم ہے۔ اس بار رمضان المبارک میں آپ نے صدقات اور خیرات نمبر شائع کر کے دین کے حوالے سے ایک اور عظیم الشان کاوش کی ہے جس کا یقیناً آپ کو اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر عظیم ملے گا۔ تاہم اس نمبر کا مطالعہ کرتے چند باتیں مجھے گراں گزریں۔ جن کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ اس نمبر میں بعض صفحات پر احادیث مبارکہ کا حوالہ دیا گیا ہے اور اُن کے بالکل سامنے اشتہارات شائع کیے گئے ہیں جن میں انسانی تصاویر شامل ہیں۔ میرے خیال سے یہ مناسب نہیں۔ آپ کم از کم خصوصی اسلامی نمبرز میں یہ اشتہار نہ دیا کریں۔ ان نمبرز میں بعض جگہ قرآنی





## دشنام طرازی کا بڑھتا رُوحان

”وہ سب سے بڑا چور ہے.....“ ”یہ سب لیرے ہیں، چور ہیں ڈاکو ہیں“ ”یہ کرپشن کا بے تاج بادشاہ ہے“ ”وہ غیر ملکی ایجنٹ ہے“ ”فلاں پلے بوائے ہے.....“ یہ سب اور اسی طرح کے دیگر الزامات و دشنام اب ہمارے ہاں عام معمول بنتے جا رہے ہیں۔ خاص طور پر سیاسی رہنماؤں میں یہ رُوحان تیزی سے فروغ پا رہا ہے اور وہ اپنے مخالفین کو بلا کسی خوف اور حدود و قیود کا خیال کیے ایسے ایسے ”خطابات“ سے نوازتے ہیں کہ مہذب معاشرے میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ سیاست کا میدان کارزار ایسا ہے کہ اس میں دو فریق ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور خود کو برتر و بہتر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر اس کوشش میں بھی چند اصولوں کا خیال رکھنا ضروری ہے، نہ کہ اقتدار کی ہوس میں سب کچھ بھول کر ہر حد پار کر لی جائے۔ پھر سیاست تو ایسی چیز ہے کہ اس میں ہم نے ماضی میں ایک دوسرے کو گالیاں دینے والوں کو تھوڑے ہی عرصے بعد ایک دوسرے کا قریبی ساتھی بننے دیکھا ہے۔ اس کی حالیہ مثالیں دیکھنی ہوں تو پیپلز پارٹی کے پچھلے دور میں میاں نواز شریف اور آصف علی زرداری کا اتحاد دیکھ لیجئے۔ ماضی میں میاں نواز شریف اور شہباز شریف، آصف زرداری کو ”مسٹر ٹین پرسنٹ“ اور ”کرپشن کا بادشاہ“ کہہ کر نکالتے رہے۔ اسی طرح آصف زرداری بھی میاں برادران کو ”آمریت کی پیداوار“ اور ”خاندانی سیاست کے چیمپئن“ کہا کرتے تھے۔ مگر پھر ”جمہوریت کی خاطر“ دونوں جماعتیں ایک دوسرے کے قریب آ گئیں تو اختلافات کے باوجود آصف زرداری میاں نواز شریف کو ”بڑے بھائی“ کہہ کر نکالنے لگے اور نواز شریف بھی انھیں احترام دینے پر مجبور ہوئے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہ دونوں رہنما سیاسی مخالفت میں اس دور نہ چلے جاتے کہ جہاں الفاظ ہمیشہ کے لیے نشتر بن کر یاد آتے اور تکلیف دیتے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کی عزت اُچھالتے ہوئے تمام حدود پار کر جانا کہاں کی دانشمندی ہے؟۔

اسی حوالے سے ایک دوسری مثال پیپلز پارٹی کے قائدین اور مسلم لیگ ق کے رہنماؤں کی ہے۔ محترمہ بینظیر بھٹو کی شہادت کے بعد آصف زرداری نے بینظیر بھٹو کے آخری خط کی روشنی میں جن افراد پر قتل کے

شبے کا اظہار کیا، اُن میں چودھری پرویز الہی بھی شامل تھے۔ کیونکہ مسلم لیگ ق سابق صدر جنرل (ر) پرویز مشرف کی اتحادی جماعت تھی۔ چنانچہ آصف زرداری اور پیپلز پارٹی نے مسلم لیگ ق کو ”قاتل لیگ“ کہا اور انتہائی سخت الفاظ استعمال کیے۔ یہی حال چودھری پرویز الہی اور چودھری شجاعت کا تھا جو آصف زرداری کو سرے محل کی کرپشن اور دیگر حوالوں سے لوٹ مار کے طعنے دیا کرتے تھے۔ مگر بعد ازاں جب مسلم لیگ ن کے خلاف سیاسی قوت کی ضرورت پڑی تو یہ دونوں جماعتیں ایک دوسرے کے قریب آ گئیں اور فطری اتحاد نہ ہونے کے باوجود آصف زرداری نے پرویز الہی کو ڈپٹی وزیر عظم کا عہدہ دیدیا۔

حالیہ انتخابات سے قبل مسلم لیگ ن کے قائدین آصف زرداری اور ان کی جماعت کے دیگر رہنماؤں کو ”علی بابا اور چالیس چور“ قرار دیتے رہے، یہی نہیں انھوں نے پیپلز پارٹی کے رہنماؤں پر ملک سے غداری اور وطن دشمنی کے سنگین الزامات لگا کر انھیں سڑکوں پر گھسیٹنے کا اعلان بھی کیا۔ مگر اقتدار میں آ کر عمران خان اور دیگر سیاسی مخالفین کے خلاف اپنی قوت برقرار رکھنے کے لیے میاں نواز شریف نے پیپلز پارٹی سے غیر علانیہ اتحاد برقرار رکھا اور ہر مشکل گھڑی میں آصف زرداری سے مشورہ کرتے رہے۔ بلکہ ایک موقع پر انھوں نے پیپلز پارٹی کو وزارتوں کی پیشکش کر کے حکومت میں شمولیت کی دعوت بھی دی تھی۔

عمران خان کی جماعت تحریک انصاف اور پاکستان مسلم لیگ ن اس وقت دو بڑے سیاسی حریف سمجھے جاتے ہیں۔ مگر بد قسمتی سے ان دونوں جماعتوں کے قائدین نے ماضی سے سبق سیکھنے کی بجائے وہی رویہ اپنایا ہے جو ان سے پہلے سیاسی مخالفین ایک دوسرے کے حوالے سے اپناتے رہے ہیں۔ یعنی ایک دوسرے کو غیر مہذب القابات سے نوازا جا رہا ہے اور اس مخالفت میں آئے روز شدت بڑھتی جا رہی ہے۔ مسلم لیگ ن کے رہنما تحریک انصاف کو ”ممی ڈیڈی پارٹی“ اور ”برگر پارٹی“ کا نام دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان لیگ کے رہنما عمران خان کو ”سیاسی طور پر نابالغ“ اور ”کھلاڑی“ کے نام سے پکارتے ہیں۔ خود میاں شہباز شریف بھی عمران خان کو غیر ملکی ایجنٹ اور جمہوریت کا دشمن قرار دے چکے ہیں۔ دوسری طرف تحریک انصاف کے قائد عمران خان نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ وہ اپنی تقریروں میں مسلم لیگ ن کو ”پنوار یوں کی جماعت“ اور میاں بردار ان کو ”مغل بادشاہ“ کہہ کر پکارتے ہیں۔ اس کے علاوہ مسلم لیگ ن کو ”کرپشن کے آرٹ کی ماہر جماعت“ کا نام بھی دے رکھا ہے۔ عمران خان وزیر عظم میاں نواز شریف پر ”امپاروں“ کو ساتھ ملا کر کھیلنے والا کھلاڑی بھی کہتے ہیں۔ اگر ان دونوں جماعتوں کے ماضی پر نظر ڈالی جائے تو عمران خان اور نواز شریف ایک دوسرے کے قریب اور آپس میں اتحادی بھی رہے ہیں۔ مگر اب سیاسی مخالفین بن کر دونوں جماعتوں کے رہنما جلے جلوسوں اور تقاریر میں ایک دوسرے کے لیے انتہائی غیر شائستہ زبان استعمال کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

یہی حال دیگر جماعتوں اور سیاسی قائدین کا بھی ہے۔ مولانا فضل الرحمان اور عمران خان کے درمیان بھی طنزیہ جملوں اور الزامات کی جنگ چلتی رہتی ہے اور دونوں رہنما ایک دوسرے کی ذات پر کچھز اُچھالتے

ہوئے کسی اصول کو خاطر میں نہیں لاتے۔ سابق وزیر اعلیٰ پنجاب چودھری پرویز الہی اور مسلم لیگ کے رہنماؤں کے درمیان بھی ایک دوسرے پر الزامات کا مقابلہ ہوتا رہتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل عمران خان اور ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین کے درمیان بھی خاصی سیاسی کشیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ اُس وقت دونوں جماعتوں کے قائدین نے ایک دوسرے کی ذات پر دل بھر کر کچڑا اچھالا تھا۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے صوبہ سندھ کے رہنماؤں اور ایم کیو ایم کے قائدین کے درمیان بھی سیاسی مخالفت میں اسی طرح کارروئیہ دیکھنے میں آتا ہے۔ سندھ اور کراچی پر اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے کے لیے یہ دونوں جماعتیں ایک دوسرے پر دہشت گردی، ناجائز اسلحہ رکھنے اور مسلح گروپ بنانے کے الزامات عائد کرتی ہیں اور سابق صوبائی وزیر ذوالفقار مرزا نے ایم کیو ایم کے رہنماؤں کے بارے میں جو زبان استعمال کی، اُسے کون بھول سکتا ہے۔ دوسری طرف ایم کیو ایم کے رہنما بھی پیپلز پارٹی کے رہنماؤں پر مختلف طرح کے الزامات عائد کرتے اور انھیں دشنام دیتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود ان دونوں جماعتوں کے درمیان شراکت اقتدار بھی جاری رہتی ہے۔

سیاسی رہنماؤں کے اس رویہ اور ان کی طرف سے اپنے مخالفین کو غیر مہذب ”نام“ دینے کا رجحان ان کی جماعتوں کے کارکنوں میں بھی منتقل ہو رہا ہے اور اب سیاسی مخالفین کے درمیان ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور عدم برداشت بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اس کا سب سے زیادہ اظہار سوشل ویب سائٹس پر دیکھنے میں آ رہا ہے۔ مسلم لیگ ان اور تحریک انصاف دونوں جماعتوں کے کارکنوں یا ان سے ہمدردی رکھنے والوں کی بڑی تعداد فیس بک اور ٹویٹر استعمال کرتی ہے۔ مگر ان دونوں جماعتوں کے حمایتی ایک دوسرے کے خلاف ایسی واہیات اور غیر مہذب زبان استعمال کرتے ہیں کہ جسے پڑھ کر سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ یہی نہیں اپنے مخالف سیاسی رہنماؤں کے خلاف جذبات کا اظہار کرنے کے لیے انتہائی بے ہودہ تصاویر اپ لوڈ کی جاتی ہیں۔ بعض لوگوں کا تو کام ہی شاید یہ رہ گیا ہے کہ وہ مخالف سیاسی رہنماؤں کی جھوٹی اور جعلی تصاویر تیار کرتے ہیں اور بلا کسی خوف کے انھیں اپ لوڈ کرتے اور پھیلاتے رہتے ہیں۔ بے شمار لوگ ان تصاویر کو سچ سمجھ لیتے ہیں۔ یہ ایک انتہائی خطرناک اور قابل تشویش رجحان ہے۔ جو دراصل قوم کو انتشار اور انارکی کی طرف لے جا رہا ہے۔

سیاسی رہنماؤں اور قومی دانشور و مفکرین کو اس بارے میں فوری طور پر سوچنا اور ایک ضابطہ اخلاق تیار کرنا چاہیے۔ جس پر تمام سیاسی جماعتوں اور ان کے حمایتیوں کو عمل کرنے کا پابند بنایا جائے۔ سوشل میڈیا کو بھی اس ضابطہ اخلاق کے دائرے میں لایا جائے تاکہ ملک میں انتشار اور انارکی کے بجائے باہمی اتحاد اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا رویہ فروغ پا سکے۔

(امجد رؤف خان)



# ہم اور ہمارے سیاسی رہنما

لڑتے لڑتے ہو کبھی ٹھم  
ایک کبھی چونچ اور ایک کبھی دم

سیارہ ڈائجسٹ



## ہم اور ہمارے سیاسی رہنما

لڑتے لڑتے ہو گئی تھم

ایک کی چونچ اور ایک کی ڈم

ہمارے ملک میں گزشتہ کئی ہفتوں سے ایک سیاسی ڈرامہ چل رہا ہے جس کے کردار اتنا شور شرابہ کر رہے ہیں کہ ہمارے ملک کا ہر شہری پریشان ہو کر رہ گیا ہے۔ ہر کوئی سوچ رہا ہے کہ اس ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ اس کا انجام کیا ہوگا؟ ہم کس طرف جا رہے ہیں؟ ملک پہلے ہی اندھیروں میں ڈوبا ہوا ہے، مہنگائی کے عذاب میں ہر شہری پریشان ہے۔ کاروبار بند ہو رہے ہیں۔ سڑکیں ویران ہو رہی ہیں۔ لوگ اپنے گھروں میں بند ہو کر ٹی وی اور اخباروں میں ہر روز بُری سے بُری خبریں دیکھ اور پڑھ رہے ہیں۔ اس ساری صورت حال میں ہمارے سیاسی لیڈر اپنے ہی راگ الاپ رہے ہیں انہیں عوام کی پریشانی کا کوئی احساس نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اکثر سیاسی لیڈر کرپٹ اور اقتدار کے بھوکے ہیں۔ وہ اقتدار میں آکر عوام کی خدمت کرنے کی بجائے پیسہ بنانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ ایسے لوگ ملک کی کیا خدمت کریں گے؟ اس ملک کو کیسے ترقی دیں گے جن کے خود قول و فعل میں استقدر تضاد ہے۔ وہ آج کچھ کہتے ہیں کل کرتے کچھ اور ہیں حتیٰ کہ حکومت وقت بھی آج کچھ سوچتی ہے، دوسرے دن اس سے الٹ کام کرتی ہے۔ ایک دن اس کا حکم ہوتا ہے کہ ہم طاہر القادری کو ماڈل ٹاؤن سے اٹھنے نہیں دیں گے۔ دوسرے دن کسی کے اشارے پر تمام کنشیز ہٹا کر ان کو جانے کی اجازت دے دیتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حکومت بھی کسی اور کے اشاروں پر ناچتی ہے۔ ایک طرف تمام شرکاء جلوس کا کھانا بند کر دیتی ہے۔ دوسرے دن کھانا خود پہنچاتی ہے۔ کبھی پورا شہر بند کر دیتی ہے۔ پٹرول پمپس بند کر دیتی ہے۔ لوگ اپنے گھروں میں محصور ہو جاتے ہیں۔ ایسے فیصلے شاید دشمن بھی نہ کریں جو ہمارے حکمران اپنی عوام کے حق میں صادر فرماتے ہیں۔ حکومت، قیوتوں اور ٹیکسوں میں اضافہ ایسے فخر سے صادر فرماتی ہے جیسے اپنی عوام سے ہی تجارت کر رہی ہو۔ آپ خود اندازے لگائیے کہ ایسی سیاسی قیادت ملک کی ترقی کیسے کرے گی۔ ہم خود اپنے لوگوں کے ہاتھوں برباد ہو رہے ہیں۔ ہم پر باہر سے کوئی ظلم نہیں کر رہا، ہم خود پر ظلم کر رہے ہیں۔ آپ تمام سیاسی لیڈروں کو دیکھ لیں۔ سب اندر سے ایک جیسے ہیں۔ ان میں ایک بھی ایسا لیڈر یا پارٹی آپ کو دکھائی نہیں دے گی جو عوام کی خدمت دل سے کرنا چاہتی ہو۔ ہمارے ملک میں ہر ادارہ دوسرے ادارے کے خلاف اور لڑائی میں مصروف ہے۔ حتیٰ کہ میڈیا میں بھی چینل ایک دوسرے کے خلاف دکھائی دیتے ہیں۔ آپ کسی ایک چینل کو سن کر صحیح صورت حال کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ آپ ایک چینل کی خبر کو سچا نہیں جان سکتے کیونکہ ان کی باگ ڈور کوئی اور چلاتے ہیں۔ جو ہر خبر



کو اپنے حساب سے دکھانا چاہتے ہیں۔ ایک چینل آپ کو جلوس کی تعداد دس ہزار بتائے گا جبکہ دوسرا مخالف چینل اس کی تعداد کو لاکھوں میں بتائے گا۔ جہاں ملک کی صورت حال یہ ہو وہاں ملک کا ہر شہری پریشان نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا۔

### سیاسی ہلچل

گزشتہ کئی ہفتوں سے جاری سیاسی ہلچل، افراتفری اور شور شرابے کے بعد تحریک انصاف اور عوامی تحریک کے آزادی اور انقلاب مارچ حکومت سے اجازت ملنے پر الگ الگ قافلوں کی صورت میں لاہور سے اسلام آباد پہنچ گئے، جہاں دوسرے علاقوں سے آنے والے جلوس بھی ان میں شامل ہوتے رہے اور انہیں وفاقی دارالحکومت کے مخصوص مقامات پر جلے کرنے کی اجازت بھی مل گئی۔ حکومت نے اپنے خلاف ہونے والے ان احتجاجی مارچوں کی اجازت دینے میں جہاں سیاسی بالغ نظری اور مثبت جمہوری طرز عمل کا مظاہرہ کیا وہاں اس فیصلے میں ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین، گورنر سندھ اور گورنر پنجاب نے بھی نہایت اہم کردار ادا کیا۔ جبکہ دونوں جماعتوں کے لیڈر عمران خان اور ڈاکٹر طاہر القادری حکومت کا تختہ الٹے بغیر اسلام آباد سے واپس نہ جانے کے اعلانات کرتے رہے لیکن آئین اور پارلیمنٹ کی بالادستی پر یقین رکھنے والی سیاسی جماعتوں، پارلیمانی رہنماؤں اور رائے عامہ کے مختلف حلقوں کو توقع تھی کہ حکومت کے اس اقدام، لاہور ہائیکورٹ کے فیصلے سپریم کورٹ کے عبوری حکم اور جماعت اسلامی سمیت بیچ بچاؤ کرائوالی بعض دوسری شخصیات کی مصالحتی کوششوں سے ماحول میں گرما گرمی بے چینی اور بے یقینی کی کیفیت ختم کرنے میں مدد ملے گی۔ عقل سلیم غالب آئے گی اور سیاسی مسائل کا سیاسی حل تلاش کر لیا جائے گا۔ لاہور ہائیکورٹ نے اپنے فیصلے میں وزیراعظم اور الیکشن کمیشن کے ارکان کے استعفوں، پارلیمنٹ کی تحلیل اور فیکو کرپشن کی حکومت قائم کرنے کے مطالبات کو غیر آئینی قرار دیا ہے۔ قانونی ماہرین کے مطابق اب ان مطالبات پر اصرار کا کوئی جواز نہیں البتہ ایک دوسرے سے الگ رائے رکھنے والوں کے درمیان مکالمہ اور مذاکرات کے ذریعے متنازع مسائل کا حل جمہوریت کا بنیادی تقاضا ہے۔ ادھر سپریم کورٹ نے ایک عبوری حکم جاری کیا ہے جس کے تحت ریاستی اداروں اور ایجنسیوں کو کسی قسم کے مداخلت آئین اقدامات سے روک دیا گیا ہے۔ اس سے تصادم اور محاذ آرائی کے خطرات کم ہو جائیں گے۔ اختلافی امور طے کرنے کے حوالے سے جماعت اسلامی کے امیر سراج الحق کا پانچ نکاتی فارمولا بھی قابل غور ہے۔ سراج الحق خیر پختونخوا حکومت میں تحریک انصاف کے اتحادی ہونے کی وجہ سے حکومت اور عمران خان کے درمیان پل کا کام انجام دے رہے ہیں۔ تحریک انصاف ان کے ذریعے حکومت کے ساتھ رابطے میں رہی ہے اور آئندہ بھی یہ عمل جاری رہنے کی توقع ہے۔ اپنے فارمولے میں وہ موجودہ صورت حال کے سیاسی حل پر زور دیتے ہیں تاکہ آئین اور جمہوریت بچ جائے۔ ان کی یہ بھی تجویز ہے کہ 2013 کے انتخابات کے حوالے سے سپریم کورٹ کا جوڈیشل کمیشن جلد تشکیل دیا جائے۔ دھاندلی والے حلقوں میں ووٹوں کی دوبارہ گنتی کرائی جائے اور الیکشن کمیشن کی تشکیل نو کی جائے۔ اگرچہ عمران خان کا کہنا تھا کہ وہ بیچ جیت کر یعنی حکومت گرا کر ہی



واپس جائیں گے جس سے کسی اورائے آئین عمل کا تاثر ابھرتا تھا لیکن ان کے نائب شاہ محمود قریشی کہتے رہے کہ معاملات کا سیاسی حل نکالنے کی کوشش کی جائے گی اور سیاسی حل یقیناً آئین کی حدود سے باہر نہیں ہو سکتا۔ حکومت کے لئے یہ ایک اچھا پیغام تھا۔ ڈاکٹر طاہر القادری نے بھی مارچ شروع ہونے سے قبل اپنی جماعت کا دس نکاتی ایجنڈا جاری کیا جس میں غیر آئینی طریقے سے حکومت یا پارلیمنٹ کی بساط لپیٹنے کی کوئی بات نہیں کہی گئی۔ اس سے ملک میں انارکی پیدا ہونے کے خدشات کی نفی ہوتی ہے جو نیک شگون ہے۔ عمران خان اور طاہر القادری اپنی تقریروں میں جس انتہا پسندی کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں سیاسی مبصرین کے مطابق وہ اپنے کارکنوں کا حوصلہ بلند رکھنے اور حکومت پر دباؤ بڑھانے کا حربہ تھے جو عموماً سیاسی لیڈروں کا طریقہ ہے۔ اس لئے امید رکھنی چاہئے کہ موجودہ بحران کا قابل عمل حل نکل آئے گا۔ یہ سیاسی قیادت کی آزمائش کا وقت ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت اور اس سے برسر پیکاری جماعتیں محل و بر دباری سے کام لیں اور ملک کے وسیع تر مفاد کو مقدم رکھتے ہوئے مذاکرات کے ذریعے معاملات یکسو کرنے کی کوشش کریں۔

### علامہ طاہر القادری کا انقلاب

علامہ طاہر القادری کا جلوس جب لاہور سے روانہ ہوا تھا تو میڈیا والوں کا کہنا تھا کہ اس میں آٹھ سے دس ہزار لوگ شریک تھے۔ اس جلوس نے بڑے ہی منظم طریقے سے اپنا سفر کا آغاز کیا تھا۔ راستے میں گجرات سے جوہدری پرویز الہی اور جوہدری شجاعت تقریباً تین چار ہزار لوگوں کو لے کر اس میں شامل ہو گئے اور یہ جلوس اپنا سفر طے کرتا ہوا اسلام آباد پہنچ گیا۔ شروع میں شیخ رشید بڑے متحرک نظر آئے وہ مولانا طاہر القادری اور عمران خان میں صلح کرانے اور اُن کے مشترک طور پر جلوس نکالنے کے حامی تھے۔ چونکہ مولانا طاہر القادری کا ایجنڈا عمران خان کے مطالبات سے مختلف تھا اس لیے دونوں میں صلح نہ ہو سکی۔ مولانا طاہر القادری انقلاب لانے کے لیے پرعزم تھے وہ اس تمام سسٹم کو بدلنا چاہتے ہیں۔ وہ اس جمہوریت کے خلاف ہیں جو آج کل ملک میں رائج ہے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اس سسٹم میں جو لوگ منتخب ہو کر آتے ہیں وہ سب سے کرپٹ ہیں۔ اس لیے یہاں انصاف اور صحیح جمہوریت نہیں ہے۔ وہ اس تمام سسٹم کو لپیٹ دینے کے حق میں انقلاب کی باتیں کرتے ہیں۔

بہر حال انہوں نے اسلام آباد پہنچ کر اپنے خطاب میں دس نکاتی ایجنڈا CHARTER OF DEMAND پیش کر دیا جس کی پہلی شرط یہ تھی کہ شریف برادران استعفیٰ دیں اور اُن کو منہاج القرآن کے شہداء کے الزام میں گرفتار کیا جائے باقی شرائط میں ملک میں معیشت، خوشحالی اور انصاف کے لیے اُن کی شرائط تھیں۔ اس کے لیے انہوں نے حکومت کو 48 گھنٹوں کی مہلت دی تھی۔ یہ مہلت ختم ہونے کے بعد طاہر القادری نے اپنی اتحادی جماعتوں کے ساتھ ملک بھر میں دھرنوں اور شاہراؤں کو بند کرنے کا اعلان کیا اور کہا کہ اب وہی ہوگا جو عوام کا فیصلہ ہوگا۔ اُن کے جلوس اور دھرنے میں جو بات نمایاں تھی اور جس کی سب نے تعریف کی وہ یہ تھی کہ اُن کے ورکرز اُن کے پیروکار اپنے لیڈر سے بہت زیادہ

Committed نظر آئے اور انتظامی معاملات میں بھی وہ لوگ بڑے ڈسپلن تھے۔ ایک اور بات جو سب لوگوں نے محسوس کی وہ مولانا طاہر القادری کا فن خطابت ہے۔ پاکستان میں شاید ہی ایسا کوئی مقرر ہو جو مسلسل کئی کئی گھنٹے خطاب کرے اور اُن کی آواز میں شروع سے لے کر آخر تک وہی گرج چمک برقرار رہے۔ الفاظ کے چناؤ اور آواز کا تال میل اُن کی تقریر کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ اس عمر میں ماشاء اللہ اُن کی صحت کی بھی داد دینا پڑتی ہے۔ وہ بغیر تھکاوٹ اور پریشانی کے مسلسل بولتے جاتے ہیں اور ہر کوئی سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ خداداد صلاحیت ہے اور شاید اُن کی خوراک کیسی ہوگی جو گریسوں میں بھی کوٹ اور ٹوپی پہن کر کئی کئی گھنٹے اپنے لوگوں سے خطاب کرتے رہتے ہیں۔ اُن کے جلوس اور دھرنے میں صرف اُن کی تحریک کے لوگ ہی شامل تھے اور اُن کا تعلق پاکستان کے مختلف علاقوں سے تھا۔ باقی پاکستان کی عام عوام میں وہ ہرگز مقبول نہیں نہ ہی عام لوگ اُن کی تقریر کو سننے یا اُن سے متاثر ہو کر آئے تھے۔ ہمارے ملک کی تمام سیاسی پارٹیوں نے نہ تو اس انقلاب کی حمایت کی نہ تعاون کیا اور نہ ہی شمولیت اختیار کی۔ سوائے چوہدری برادران کے، جن کی مقبولیت آج کل پاکستان میں سیاسی طور پر بہت کم ہو گئی ہے۔

پینلرز پارٹی کے دور حکومت میں بھی انہوں نے ایک ایسا ہی جلوس اور دھرنہ دیا تھا مگر چند روز کے بعد ایک سمجھوتہ کر کے کینیڈا روانہ ہو گئے تھے۔ ہمارے خیال میں اسی لیے لوگ اُن پر اعتبار نہیں کرتے۔ جو لوگ اُن سے مذہبی طور پر متاثر ہیں بلکہ اُن کے پیروکار ہیں جن کا تعلق منہاج القرآن سے ہے وہ لوگ مولانا طاہر القادری کو بہت پسند کرتے ہیں اور پھر و مرشد کی طرح اُن کی عزت اُن کا حکم بجالانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

### عمران کا آزادی مارچ

عمران خان کے آزادی مارچ کے اعلان سے پاکستان میں ایک سیاسی ہلچل اور طوفان برپا ہو گیا۔ عوام پریشان ہو گئے، ہر کوئی سوچنے لگا اگر عمران خان چار پانچ لاکھ لوگوں کو لے کر اسلام آباد پہنچ گیا تو کیا ہوگا۔ کاروباری حضرات نے کام بند کر دیا۔ عوام نے گھروں سے نکلتا بند کر دیا۔ 14 اگست آگیا، سڑکیں ویران ہونے لگیں۔ عمران کے گھر زمان پارک کے باہر تحریک انصاف کے کارکن اکٹھے ہونے لگے۔ ہر ایک کی زبان پر تھا کہ ملک میں کیا ہونے والا ہے؟ ہر کوئی تعداد کے بارے میں اپنے ذہن پر زور دینے لگا۔ دن آہستہ آہستہ گزرنے لگا۔ آخر شام کے وقت عمران خان اپنے جلوس کے ساتھ نمودار ہوئے اور آہستہ آہستہ اُن کا کاررواں چلنے بلکہ ریٹنگ لگا۔ لاہور سے نکلتے نکلتے صبح ہو گئی۔ اگلے دن 9 بجے کے قریب جلوس گوجرانوالہ پہنچ سکا۔ گوجرانوالہ میں جلوس پر نواز لیگ کے حامیوں نے پتھراؤ کیا تو سارے ملک میں سراسیمگی پھیل گئی۔ لوگ ڈرنے لگے کہ جلد ہی ملک میں کچھ ہونے والا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ حکومت نے فوری اقدام کیے اور حالات پر قابو پایا۔ اس کے بعد جلوس اپنی منزل کی طرف تیزی سے بڑھنے لگا اور خبروں کے مطابق مشاورت کے بعد عمران خان کو جلوس سے الگ کر کے جلد اسلام آباد پہنچا دیا گیا۔ لاہور

سے نکلتے ہوئے اور گوجرانوالہ تک کافی تعداد میں لوگ عمران خان کے ساتھ مگر حکمت عملی تبدیل کرنے پر جلوس کے شرکاء کی تعداد پندرہ ہزار کے قریب باقی رہ گئی تھی۔ گوجرانوالہ سے اسلام آباد کے راستے میں لوگ زیادہ تعداد میں شامل نہیں ہوئے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ رات بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ لوگ ڈر بھی رہے تھے کہ جلوس کے ساتھ حکومت جانے کیا سلوک کرے۔

دوسری طرف وزیر اعلیٰ خیبر پختونخوا اپنے ساتھ دو سے چند ہزار لوگوں کو لے کر اسلام آباد میں انتظار کر رہے تھے۔ پہلی رات عمران خان نے بڑے جوشیلے انداز میں تقریر فرمائی۔ اُن کا مطالبہ تھا کہ نواز شریف صاحب استعفیٰ دیں اور حکومت ختم کر کے مڈ ٹرم الیکشن کرائے جائیں اور اس دوران ایک ٹیکو کریٹ حکومت قائم کی جائے۔ الیکشن کمیشن کو بھی ختم کر دیا جائے کیونکہ یہ سب کچھ الیکشن میں دھاندلی کی پیداوار ہے۔ جلوس کے ساتھ نوجوان بھی بڑے جوشیلے نظر آ رہے تھے۔ یہاں پر عمران خان نے ایک بہت بڑی غلطی یہ کی کہ جلوس کے بعد اپنے گھربنی گالہ چلے گئے اور جاتے ہوئے کہہ گئے کہ اگلے دن 3 بجے دوبارہ جلوس ہوگا۔ اُن کے جانے کے بعد سارا مجمع منتشر ہو گیا اور اُن کے دھرنے کی جگہ کوئی بھی موجود نہ رہا۔ عمران کے ساتھی ہوٹلوں یا اپنے گھروں کو چلے گئے۔ تقریر کے دوران تیز بارش بھی ہو رہی تھی۔ عمران کی تقریر کے دوران لوگ بارش میں بھگتے رہے۔ اگلے دن یہ خبر بھی نشر ہو گئی کہ عمران خان بیمار ہو گئے ہیں۔ اخباروں میں لوگوں نے یہ بھی تنقید کی کہ عمران کو اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر اکیلے اپنے گھر نہیں جانا چاہیے تھا۔

دوسرے دن بھی عمران خان رات آٹھ بجے تشریف لائے اور انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں آپ کے ساتھ یہاں اسلام آباد میں سوؤں گا اور اُس وقت تک گھر نہیں جاؤں گا جب تک نواز شریف مستعفی نہیں ہو جاتے۔ انہوں نے دو تین گھنٹے بیچ پرسو کر بھی گزارے مگر اچانک اٹھے اور اپنے گھر چلے گئے اور یہ کہہ گئے کہ اگلا دن فائنل ہے ہم ریڈ زون میں داخل ہو جائیں گے۔ اس اعلان کے بعد پاکستانیوں میں سراسیمگی پھیل گئی کہ اتوار کو ضرور کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔ چھٹلوں پر بھی مختلف تجزیے نشر ہونے لگے۔ ہر کوئی اپنی رائے دے رہا تھا۔ لیکن حضرات اپنا اپنا راگ الاپ رہے تھے۔ عمران خان صاحب مزے سے اپنے گھر آرام فرما رہے تھے۔ عوام کو یہ بات بُری محسوس ہوئی کہ تمام پاکستان کے کاروبار کو بند کرا کے یہ سیاسی لوگ خود آرام فرما رہے ہیں۔

### عمران کا سول نافرمانی کا اعلان

چیرمین تحریک انصاف عمران خان نے اپنے خطاب میں حکومت کی کرپشن کا ذکر کرنے کے بعد سول نافرمانی کی تحریک کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ عوام تاجر ٹیکس اور یوٹیلیٹی بلز ادا کرنا بند کر دیں۔ ہم وزیراعظم کو دودن کی مہلت دیتے ہیں کہ وہ استعفیٰ دیں ورنہ کارکن میرے بس میں نہیں ہوں گے۔ یہاں آزادی مارچ کے دھرنے کے تیسرے روز خطاب کرتے ہوئے عمران خان نے کہا کہ میں اپنے 18 سال سے جاری مشن کی سب سے اہم تقریر کرنے جا رہا ہوں۔ میری تقریر سننے کے بعد اگر آپ نے اس پر عمل کر لیا تو نیا پاکستان



بننے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ آج میں اپنے کارکنوں کو امتحان میں ڈالنے لگا ہوں مجھے امید ہے کہ میرے کارکن اس امتحان میں پاس ہونگے۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی انتشار کی وجہ سے فوج کو اتار پڑے، فوج آگئی تو ملک پیچھے چلا جائے گا، ملک اندھیرے میں ہے نواز شریف قرض لیکر ملک چلا رہے ہیں۔ یہ رہے تو ملک کا مستقل اندھیرے میں رہے گا۔ یہ ملک کو مزید مقروض کر دیں گے۔ نواز شریف نے ملک کا قانون توڑا، جوں کو خریدنا، انتخابات میں الیکشن کمیشن کو خریدنا اور لفظہ جرنلزم شروع کی۔ انہوں نے جرنیلوں کو بھی خریدنے کی کوشش کی۔ مجنم ٹھکی کو خریدا، جس نے بھی نواز شریف کا احتساب کرنے کی کوشش کی اسے خرید لیا گیا، نواز شریف کے بچوں نے بھی کرپشن شروع کر دی ہے۔ شریف برادران ملک کا پیسہ باہر بھیج رہے ہیں۔ پارلیمنٹ، اسمبلی اور وزیراعظم سب جعلی ہیں۔ وزارت داخلہ مجھے کہتی ہے کہ مجھے پنجابی طالبان مار دیں گے اگر خود کش حملے میں مارا گیا تو اللہ میرے گناہ معاف کر دیگا۔ انہوں نے سول نافرمانی کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ جب تک نواز شریف استعفیٰ نہیں دیتے عوام بجلی، پانی، گیس کے بل اور تمام ٹیکس ادا کرنا چھوڑ دیں۔ تا جبر بھی ٹیکس اور بل دینا چھوڑ دیں اگر ٹیکس دیا تو پیسہ نواز شریف کھا جا۔ نواز شریف وزیراعظم رہے تو پاکستان کا مستقبل کبھی روشن نہیں ہو سکتا۔ پاکستان میں انصاف کا نظام شریف برادران کو نہیں پکڑ سکتا اب قوم فیصلہ کرے گی کہ ان کا کیا کرنا ہے۔ انہوں نے حکومت کو دودن کی ڈیڈ لائن دیتے ہوئے کہا کہ اگر نواز شریف دو دن میں مستعفی نہ ہوئے تو کارکن ریڈ زون میں داخل ہو جائیں گے۔ جمہوریت پر یقین رکھتا ہوں، سول بیورو کرپسی اور سرکاری ملازم نواز شریف کی ملازمت سے خود کو آزاد کریں، اگر عوام اب بھی نہ اٹھے تو کبھی ظلم سے نجات نہیں پائیں گے۔ ملکی عدالتیں، قانون، نیب، شریف برادران کو نہیں پکڑ سکتے۔ میں آج سے ٹیکس اور بجلی و گیس کے بل نہیں دوں گا۔ دودن اسی کنٹینر پر رہوں گا اور یہیں سوؤں گا۔ کرپٹ وزراء کی کرپشن کی داستانیں سنائیں گے اور ان کو ننگا کریں گے۔ میں نے چودھری ثار سے وعدہ کیا ہے کہ ریڈ زون میں داخل نہیں ہوں گے لیکن اگر دو روز تک مطالبہ پورا نہ ہوا تو چودھری ثار سے معذرت کر لیں گے۔ وزیراعظم ڈیل کرنے کے لیے بندے نہ بھیجئے اب وقت ختم ہو گیا۔ چودھری ثار بھی فیصلہ کر لیں کہ آپ بادشاہت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا جمہوریت کے حامی ہیں۔ میں اگر وزیراعظم بنا اور عوام پر ظلم کیا تو میرے خلاف بھی سول نافرمانی کی جائے۔ عوام اب دودن تک صبر کریں، شام کو ہم یہاں دھرنے کے مقام پر آئیں گے اور آزادی کا جشن منائیں گے۔ ہمارے پاس دو راستے تھے ایک سونامی یہاں سے نکلے اور وزیراعظم ہاؤس سے نواز شریف کو نکال دے لیکن اس سے پولیس کے معصوم ہلکار مارے جائیں گے میں سمجھتا ہوں کہ پولیس ہلکاروں کے بیوی بچے ہیں انہیں کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ موجودہ حکمرانوں کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی جائے۔ لگ رہا ہے کہ اثالیس گھنٹوں کے اندر ہم میچ جیت کر یہاں سے چلیں جائیں گے۔ نواز شریف کا بیٹا لندن میں آٹھ کروڑ پاؤنڈ کے گھر میں رہتا ہے جبکہ قوم بھوکو مر رہی ہے۔ نئے پاکستان میں کرپٹ سیاستدانوں کی گنجائش نہیں ہوگی۔ عمران مقابلہ کرنے آیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے میری ٹریننگ کروائی ہے میں نے کھیلوں کے گراؤنڈ میں مقابلہ

کرنے کی ٹریننگ لی ہے اور ہر مقابلہ کرنے کی ہمت ہے۔ قبل ازیں ایک بیان میں عمران خان نے کہا عوام اپنا فیصلہ سنا چکے ہیں۔ نواز شریف اقتدار سے علیحدہ ہو جائیں۔ ٹویٹر پیغام میں انہوں نے کہا عوام کو انتخابات میں دھاندلی قبول نہیں، لوگوں کے جھوم نے تحریک انصاف کے مارچ میں شرکت کر کے نواز شریف کو انتخابات میں دھاندلی کا ثبوت دے دیا۔ لوگ جانتے ہیں کہ نواز شریف ریٹرننگ افسران، گمران حکومت کو خریدنے، اور بیچ فلسفہ میں ملوث ہیں وہ انہیں قبول نہیں کرتے۔ آئی این پی کے مطابق عمران خان نے مارچ میں شریک خواتین کارکنوں سے بدتمیزی کا سخت نوٹس لیتے ہوئے اپنے کارکنوں کو خبردار کیا ہے کہ خواتین سے کوئی بدتمیزی نہ کی جائے، ان کا مکمل احترام کریں۔ ایک انٹرویو میں چیئرمین پی ٹی آئی نے کہا لکھ کر دینے کے لیے تیار ہوں کہ نواز حکومت ایک دو ہفتوں کی مہمان ہے۔ انشاء اللہ ملک کا اگلا وزیراعظم بنوں گا۔ کے پی کے میں ہمارے خلاف جلسے ہو جائے تو اگلے دن ایکشن کرادوں گا۔ فضل الرحمان کو جب چاہیں خرید لیں۔ وہ دین پر سیاست کر رہے ہیں۔ ان کی قیمت 2 یا 3 وزارتیں ہیں۔ عمران خان نے دھرنے سے رات گئے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ حکمرانوں نے تمام قانونی دروازے بند کر دیے ہیں۔ تحریک انصاف کسی صورت ذلیل نہیں کرے گی۔ دودن بعد ہم ایک ناجائز حکومت، ناجائز پارلیمنٹ اور ناجائز وزیراعظم کو قبول نہیں کریں گے۔ دودن بعد ہم ریڈ زون جائیں گے کنٹینر ہمارا راستہ نہیں روک سکتے۔ اسلام آباد پولیس بھی راستہ نہ روکے ہم انہیں آزاد کرانے آرہے ہیں ہم کوئی توڑ پھوڑ نہیں کریں گے۔ عمران خان نے حکومت کو جو ڈیڈ لائن دی تھی اُس سے ایک روز قبل پی ٹی آئی کے رہنما شاہ محمود قریشی نے تحریک انصاف کی طرف سے اسمبلیوں سے استعفیٰ دینے کا اعلان کیا مگر کے پی کے میں جہاں اُن کی حکومت ہے وہاں استعفیٰ نہیں دیئے گئے۔ یہ سطور لکھتے تک اسلام آباد میں کشیدگی بدستور جاری ہے۔

یہ سیاسی ڈرامے اور تماشے قوم کو کیا سبق دے رہے ہیں وہ یہ دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے حکمرانوں کی حکومت کرنے کا انداز ہمارے سیاسی لیڈروں کا اقتدار چھیننے کا انداز کیسا ہے؟ جو کسی قانون اور آئین کی پاسداری نہیں کرتے عوام میں کیا احساس اُجاگر کر رہے ہیں کہ عوام بھی اپنے لیڈروں کو دیکھ کر پاکستان میں قانون کی پاسداری نہ کریں۔ اُن کو بھی قوانین کی خلاف ورزی کرنے کے لیے کھلی چھٹی ہونی چاہیے۔ پاکستان کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے کہ پاکستان میں انصاف اور قانون کا بول بالا نہیں ہوا۔ امیر کے لیے آزادی ہے۔ سب قانون غریب عوام کے لیے ہے۔ اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ جب تک پاکستان میں قانون سب کے لیے برابر نہیں ہوگا۔ ہر کوئی قانون کا مذاق ہی اڑائے گا۔ وہ نہ تو اچھا انسان اور نہ ہی اچھا شہری بلکہ نہ اچھا پاکستانی ہو سکتا ہے۔ دنیا میں وہی قومیں ترقی کرتی ہیں جو اپنے ملک میں انصاف قائم کرتی ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لیڈروں کو ہدایت دے کہ وہ اچھے رہنما بنیں تاکہ قوم بھی اُن کے نقش قدم پر چل سکے۔ (آمین)





# مجید نظامی..... وہ عہد موجودہ میں سچ کا استعارہ تھے!

(سعد اللہ شاہ)

سیارہ رپورٹ





## مجید نظامی .....

وہ عہد موجودہ میں سچ کا استعارہ تھے!

(سعد اللہ شاہ)

صحافت کے میر کاررواں اور نظریہ پاکستان کے محافظ مدیر و معمار روزنامہ نوائے وقت جناب مجید نظامی 27 رمضان المبارک (بمطابق 26 جولائی 2014) کی شب اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ اللہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی وفات سے صحافت کے میدان میں پیدا ہونے والا خلاء کبھی پُر نہ ہو سکے گا۔ مجید نظامی اُن گنے چنے لوگوں میں سے تھے جنہوں نے نظریہ پاکستان کو ساری عمر سینے سے لگا کر رکھا اور اس کی آبیاری کی۔ انہوں نے پاکستان کے مفادات اور اس کے قیام کے مقاصد کو ہمیشہ مقدم جانا اور انہی کی روشنی میں نوائے وقت کو پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کا پاسبان بنایا۔ صحافت، نظریہ پاکستان اور مملکت خداداد پاکستان کے لیے مجید نظامی کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

ذیل کی سطور میں، جناب مجید نظامی کی زندگی اور ان کی یادوں کے حوالے ایک یادگار اثر ویو پیش کیا جا رہا ہے:

تاریخ میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو تاریخ لکھتے ہیں اور دوسرے وہ جو تاریخ بناتے ہیں۔ نیز افراد کو تین طبقوں میں بھی تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ بڑے لوگ جو نظریات کو حرزِ جاں بناتے ہیں، اوسط درجے کے اشخاص، جو واقعات کو موضوعِ سخن کرتے ہیں اور نچلے رینک میں رہنے والے جو شخصیات پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ میں نے مجید نظامی صاحب پر قلم اس لیے اٹھایا کہ وہ شخصیت نہیں ایک نظریہ تھے۔ وہ تاریخ بنانے والے مجاہد پاکستان تھے جنہوں نے نظریہ پاکستان کو اپنے رگ و پے میں اُتار لیا۔ وہ قائد اور اقبال کے افکار میں زندہ رہے۔ وہ عملی طور پر تحریک پاکستان سے وابستہ رہے اور اسی داستان کا تسلسل تھے جسے مجید نظامی نے تحریک کی صورت حقیقت بنادیا۔ مجید نظامی مرحوم مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن کے بانی تھے۔ انہوں نے قائد اعظم کے کہنے پر اخبار کا اجرا بھی کیا جس کی موجودہ صورت نوائے وقت ہے اور معمار مجید نظامی تھے۔ گویا وہ شمع جو مجید نظامی مرحوم نے روشن کی تھی اسے مجید نظامی نے طوفانی آندھیوں میں بھی بجھنے نہیں دیا، بلکہ بقول سعدیہ قریشی:-

بلند اور ہوئی ہے مرے چراغ کی کو

ہوائے تند کو اتنا جواب کافی ہے

قائد کا غیر متزلزل ارادہ، پختہ یقین اور پیہم عمل جناب مجید نظامی کے پیش نظر رہا۔ اقبال کی دُور اندیشی،

فکری گہرائی اور بلند پروازی ان کے تخیل کو انجنت لگاتی رہی۔ ان کے سامنے اس پاکستان کے خدوخال تھے جس کا خاکہ قائد اور اقبالؒ کی سوچ کا آئینہ دار تھا۔ وہ منزلوں سے بے نیاز اسی راستے کے مسافر بنے جہاں پیہم سفر ہی کامیابی کی دلیل ٹھہرتا ہے۔ جہاں کے نقوش یا خون آلودہ ہوتے ہیں۔ کوئی کشش، لالچ یا دلکشی انہیں اپنی طرف راغب نہ کر سکی۔ کوئی دھمکی، خوف یا مصلحت انہیں اس صراطِ مستقیم سے نہ ہٹا سکی جس پر چل کر ان کے بڑوں نے یہ پاک دھرتی حاصل کی تھی۔

منزلیں ان کا مقدر کہ طلب ہو جن کو

بے طلب لوگ تو منزل سے گزر جاتے ہیں

یہ لوگ منزلوں سے ماورا ہوتے ہیں، منزل خود انہیں تلاش کرتی ہے۔ حمید نظامی صاحب بیمار ہوئے تو شورش کاشمیری نے مجید نظامی صاحب کو لندن فون کیا کہ فوراً پاکستان پہنچیں۔ چنانچہ کچھ ایسا ہی ہوا ان کے آنے پر حمید نظامی نے آنکھیں کھولیں اور کہا کہ ”تم آگئے اچھا کیا“ اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گئے مگر اپنی تعلیمات کے روپ میں ہمارے درمیان موجود رہے۔ سارا بوجھ مجید نظامی کے کندھوں پر آن پڑا ان کے سوا اور کوئی یہ ذمہ داری اٹھانے کا متحمل بھی نہیں تھا۔ یہ دلیری اور جرأت کا معاملہ تھا۔ ایک تحریک مقصد اور نظریہ کو لے کر آگے چلتا تھا۔ رفتہ رفتہ ابنِ القوتوں نے سر اٹھایا اور اس ملک کے لیے بربادی کا باعث بننے لگے۔ مادرِ ملت جیسی عظیم ہستی کو بے فیض اور احسان فراموش ایوب خاں جیسے لوگوں نے ”کارنر“ کر دیا۔ بدترین دھاندلی کے ذریعے بانی پاکستان کی جاں نثار ہمشیرہ کو ہرا دیا گیا۔ مجید نظامی صاحب نے ہمیشہ مادرِ ملت کو پوری آب و تاب کے ساتھ زندہ رکھا۔ قیام پاکستان کے بعد استحکام پاکستان اور دفاعِ اساس پاکستان کا کارخیز نوائے وقت کے حصے ہی میں آیا۔

حقیقت یہ ہے کہ مجید نظامی اور ان کے رفقاء نے اس ملک کو اپنا گھر سمجھا کیونکہ وہ اسے بنانے والوں میں شامل تھے اور گھر کی قدر تو گھر والا ہی جانتا ہے۔ وہ قائد اور اقبالؒ کی فکری اساس کے وارث تھے اور اپنے اندر حوصلہ رکھتے تھے کہ وہ اس کی حفاظت کر سکیں۔ ایک مرتبہ نواب آف کالا باغ نے مجید نظامی سے کہا تھا ”اوپر خدا ہے اور نیچے ایوب خاں اگر اس نے مجھے کہا کہ تو میں نوائے وقت بند کردوں گا اور تم میں اگر ہمت ہو تو اس پالیسی کو جاری رکھنا“ مجید نظامی صاحب نے کہا ”آپ مجھے باہت ہی پائیں گے“۔ وقت نے ثابت کیا کہ وہ کسی لمحے کسی بھی آمر اور جابر کے سامنے نہیں جھکے۔ ایوب خاں نے صحافیوں سے بات کرتے ہوئے ایک مرتبہ کہا تھا کہ وہ اپنے گریبانوں میں جھانکیں۔ مجید نظامی صاحب نے اٹھ کر انہیں روکا اور کہا کہ وہ تو اپنے گریبان میں جھانکتے ہیں تو اپنا سرِ فخر سے اونچا محسوس کرتے ہیں۔ ایوب نے کہا کہ ان کے مخاطب نظامی صاحب نہیں۔ مجید نظامی نے کہا کہ آئندہ وہ متعلقہ شخص کو مخاطب کر کے بات کیا کریں۔

مجید نظامی صاحب بہادر تھے اور انہیں کسی بھی شخص میں یہ صفت اچھی لگتی تھی۔ اسی باعث انہوں نے طویل جیل کاٹنے والے آصف زرداری کو بھی مردِ حر کا خطاب دیا۔ یارِ لوگوں نے مجید نظامی کے دیئے ہوئے اس خطاب کو اٹھالیا اور خوب خوب چرچا کیا۔ نظامی صاحب نے نواز شریف کے سوال کے جواب میں کہا تھا کہ اگر وہ بھی سرورِ مل میں رہنے کی بجائے پاکستان میں زرداری کی طرح جیل کاٹنے کو وہ انہیں بھی مردِ حر کہتے۔

ایشی دھماکے جیسے نازک موقع پر جبکہ بہت سے ایڈیٹر ایشی دھماکے کے خلاف باتیں کر رہے تھے، انہوں

نے نواز شریف کو پیغام دیا تھا کہ وہ جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دھماکہ کر دیں وگرنہ لوگ ان کا دھماکہ کر دیں گے۔ انہوں نے جنرل ضیاء سے کہا تھا کہ وہ کرکٹ ڈپلومیسی کے تحت بھارت جانے کے لیے تیار نہیں۔ ہاں اگر ٹینکوں پر بیٹھ کر جانا ہے تو ٹھیک ہے۔ انہوں نے نواز شریف کو قائد ثانی کہنے والوں کو بھرے جلے میں روک دیا تھا اور کہا تھا کہ نواز شریف تحریک استقلال میں تھے لہذا وہ اصغر خاں ثانی تو ہو سکتے ہیں قائد ثانی نہیں۔ ایسی باتیں وہی کہہ سکتا ہے جن کا ظاہر باطن ایک ہو اور اسے کسی کا خوف نہ ہو۔

گچی بات تو یہ ہے کہ مجید نظامی کی کاوشوں سے نوائے وقت پاکستان کی پہچان بن گیا۔ نوائے وقت اور پاکستان یک جان دو قالب ہیں۔ مجید نظامی کے سینے میں پاکستان دھڑکتا تھا، سبز ہلالی پرچم ہمارے مشور کو گنبد خضریٰ سے مماثلت دیتا ہے۔

نوائے وقت کی پالیسی نظریہ پاکستان پر استوار ہے اس کی بنیاد کلہ طیبہ لا الہ الا اللہ ہے کہ اصغر سوداوی مرحوم نے تو تحریک کے دوران ہی لکھ دیا تھا:-

پاکستان کا مطلب کیا..... لا الہ الا اللہ

کچھ بدخوابوں اور مذہب بے زار لوگوں نے پاکستان کی تخلیق کو مٹھوک بنانے کی کوشش بھی کی۔ یہ بد بخت اور لعنتی اب بھی موجود ہیں جن کے خیال میں قائد اعظم اس ملک کو سیکولر دیکھنا چاہتے تھے۔ مجید نظامی صاحب نے نوائے وقت کے پلیٹ فارم سے ایسے گستاخوں کو ہمیشہ مدلل اور بھرپور جواب دیا کہ مسلمان لا الہ الا اللہ کے نعرے پری سبکا ہوئے تھے اور پاکستان کو حاصل کرنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ مسلمان آزادانہ طریقے سے اپنے مذہبی فرائض پورے کر سکیں۔ ہم نے بحیثیت مسلمان قوم یہ ملک حاصل کیا، اس قوم کا تشخص اور پہچان اس کے سوا کیا ہے کہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں اور حضور کی سیرت کو رہنما بناتے ہیں۔ اس پیغام کو پھیلانے کا بیڑہ نوائے وقت نے اٹھایا۔ نوائے وقت کا ماٹو ہی جابر حکمران کے سامنے کلمہ حق کہنا رہا ہے اور کلمہ حق کیا ہے وہی تو ہے لا الہ الا اللہ۔

مجھے ہے حکم ازاں لا الہ الا اللہ

کبھی غور کیا جائے تو مجید نظامی صاحب سے وابستہ نوائے وقت، پھول، ندائے ملت اور فیملی اپنے معنی کے اعتبار سے راست فکر لیے ہوئے ہیں۔ نوائے وقت ہے تو یہ وقت کی آواز ہے، وقت کا ہے اسے جھٹلانے والا صفحہ ہستی سے مٹ جاتا ہے۔ ”پھول“ خوشبو ہے اس رسالے کا باطن بھی مہک رہا ہے اور پڑھنے والے کے مشام جاں کو معطر کرتا ہے۔ ندائے ملت تو قوم کی پکار ہے کہ یکجہتی اور بھائی چارہ ملت کے لیے از بس ضروری ہے۔ فیملی نام ہی سے اجتماعیت کا تصور دیتا ہے۔ ایک ایسا میگزین جسے فیملی میں بیٹھ کر پڑھا جاسکے۔ یہ سارے نام ظاہر اور باطن ہر دو حوالے سے مجید نظامی صاحب کی شخصیت کے عکاس ہیں۔ ان کے ارد گرد ان کے رفقاء بھی ایک کلیسی کی طرح تھے۔ یہ لوگ پاک وطن کے لیے اب بھی غنیمت ہیں۔

ہیں ابھی شہر میں ناموس پہ مرنے والے

جینے والوں کے لیے اتنا سہارا ہی سہی

مجید نظامی صاحب کے نظریاتی عمل کا پھیلاؤ وقت ٹی وی اور نظریہ پاکستان ٹرسٹ کی شکل میں اپنا دائرہ کار وسیع کر چکا ہے۔ وقت ٹی وی الیکٹرانک میڈیا میں اساس پاکستان کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اسلامی اقدار و



روایات کو سامنے رکھ کر اپنے پروگرام تکمیل دے رہا ہے۔ اس محاذ پر ان کی جرأت مند اور ذہین بنی رمیضہ اس شیخ کو روشن کیے ہوئے ہیں، جو پاکستان کے لیے امید کی نشانی ہے۔ وقت کے پروگرام سنجیدہ ہوتے ہیں اور ایک خاص مقصد کے تحت کردار سازی کر رہے ہیں۔ نظریہ پاکستان ٹرسٹ جسے مجید نظامی اور ان کے دیرینہ ساتھی ڈاکٹر رفیق احمد نے قائم کیا، پاکستانی اذہان کا ایک بڑا انووم ہے جہاں سے دشمن کے چراپیگنڈہ کا جواب دیا جاتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ اس ملک کے بچوں کی کردار سازی کر رہا ہے۔ یہاں بچوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ ان کی تربیت کے لیے ورکشاپس اور دوسرے پروگرام ہوتے ہیں۔ حقیقت میں یہ ادارہ پاکستان کا صحیح ٹھنک نینک ہے۔ ان پر تحریک پاکستان کے اغراض و مقاصد سے لے کر استحکام پاکستان کی ضرورت کے حوالے تک ذہن تیار کیے جاتے ہیں تاکہ آگے چل کر وہ محبت وطن پاکستانی ثابت ہوں۔ ان کو قائد اور اقبال کی تعلیمات کی روشنی میں تعلیم دی جاتی ہے۔ تاکہ وہ پاکستان کا پرچم سنبھالیں اور چلتے پھرتے پاکستان نظر آئیں:

آنکھ میں روشن چاند ستارا دل میں سبز اُمنگ  
آؤ چلیں ہم پرچم لے کر اک دوچے کے سنگ

مجید نظامی صاحب کا یہ انٹرویو پبلک آئیڈیہ کی ٹیم نے 12 جنوری 2010ء بجے ان کے گھر پر کیا۔ ساتھ آمنہ الفت محمد زاہد مہیاں احتشام جمیل شامی اور عمران شادو تھے۔

شام رات میں ڈھل رہی تھی، ہوا میں خشکی تھی۔ ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا جہاں بیٹن کرے کو گرم کر چکے تھے۔ یہ ڈرائنگ روم کم سٹڈی روم تھا کہ ہر طرف شیف کتب سے بھرے ہوئے تھے، ظاہر ہے مجید نظامی صاحب کا اڈر ہنا پچھونا ایسا ہی ہو سکتا تھا۔ یہی حرف شناسی تو حق شناسی کی راہ دکھاتی ہے۔ حق سچ اور خوبصورتی ہی اصل حقیقتیں ہیں۔ مجید نظامی صاحب آئے۔ چائے منٹھائی، کھجوریں اور باتیں، تین گھنٹے گزرنے کا احساس تک نہیں ہوا۔ اپنے عہد کا ایک عظیم صحافی جنہیں اہل دانش نشانِ جمہوریت لکھتے ہیں وہ صحافت کے شاہسور اور سچ کے علمبردار تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ہماری سنہری اقدار و روایات کی آبرو قائم رکھے ہوئے تھے۔ وہ ایک بالکل نئے ساتھ ہمارے ساتھ بیٹھے دریا کی روانی سے اپنی کہانی سنار ہے تھے اور ہم ہمہ تن گوشِ سماعت کر رہے تھے۔ ان کے تاثر سے سمندر کی گہرائی کا احساس ہوتا تھا اور پھر بولنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس سمندر کے اندر طوفان بھی ہیں اور اس سمندر کے ساحل پر سپہیاں بھی پڑی ہیں جن کے اندر آب و دِرموتی بھی ہیں۔ مجید نظامی صاحب کی میزبانی سے انتہائی اپنائیت محسوس ہوئی۔ شاید اس لیے کہ وہ ہمارے دل کی باتیں کر رہے تھے وہ پاکستان کی تخلیق سے لے کر اس کے استحکام کی دعا تک ایک جذبے میں ڈھلے ہوئے لگ رہے تھے۔ میں نے کہا کہ چائے کا وقفہ ہو جائے۔ کہنے لگے کوئی بات نہیں بات بھی چلتی رہے۔ میں نے کہا ”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہ تو سوئے ادب ہے۔“ وہ مان گئے اور پھر آف دی ریکارڈ یعنی انٹرویو سے ہٹ کر باتیں ہونے لگیں۔ انہوں نے بتایا کہ مٹھائی کے ساتھ کھجوریں مدینہ سے آئی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ان کی بیٹی رمیضہ نے 22 عمرے کیے ہیں اور یہ کہ انہوں نے پانچ حج اور ان گنت عمرے کر رکھے ہیں۔ یہ اللہ کا کرم ہے وہ اس وقت بھی مدینے سے بلاوے کے منتظر تھے۔ ظاہر ہے جو مکہ اور مدینہ سے اس قدر جڑا ہوا ہو وہ اقبال کی طرح کیوں نہ کہے گا:

سرمہ ہے میری آنکھ کی خاکِ مدینہ و نجف

مجید نظامی صاحب قتلِ شفاؑی کے مندرجہ ذیل شعر کی عملی شکل تھی۔

اب جس کے جی میں آئے وہی پائے روشنی

ہم نے دل جلا کر سرعام رکھ دیا

مجید نظامی صاحب کھلی کتاب کے مانند تھے جس کا ہر باب واضح اور صاف تھا۔ ہر حرف ان کے معانی و مقاصد سے لبریز ہے۔ وہ لگی لپٹی کے بغیر ہر بات صاف صاف کہہ دینے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ وہ بصارت سے بعسیرت تک سب کچھ کسی کو دان کیے ہوئے تھے وہ کہ جس نے انہیں اس کام کے لیے چنا تھا۔ یہ تو فی فریضہ سالہا سال سے ادا ہو رہا تھا۔ ہر قسم کے نامساعد اور مشکل حالات میں بھی وہ کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ کتنے لوگوں کو انہوں نے اس میدان میں رہنے کے رموز سکھائے اور معتبر بنایا۔ کتنے لکھنے والوں کی ذہنی آبیاری کی اور کتنے پھٹے ہوؤں کو راہ دکھائی۔ وہ خود ایک چراغ کی طرح جل رہے تھے۔ یہ تو ہمارے سوچنے کی بات ہے کہ:

جو روشنی نہ رہے گی تو کیا کرو گے تم

تمہارا سایہ تلک ساتھ چھوڑ جائے گا

ہماری روشنی ہمارا نظریہ پاکستان ہے کہ جس کا منبع و محور نور علی نور ہیں جس کا کعبہ بیت اللہ ہے۔ قائد نے یہی تو کہا تھا کہ وہ پاکستان کو اسلام کی تجربہ گاہ بنانا چاہتے ہیں۔ افسوس صد افسوس کہ ہمارے حکمرانوں نے اسے مغرب کی چراگاہ بنا ڈالا۔ نظامِ تعلیم کو برباد کر دیا۔ پرویز مشرف کے دور میں تو انتہائی ہو گئی کہ انہوں نے امریکہ کے ایجنڈا کے تحت ہمارے دو قومی نظریہ پر حملہ کیا۔ وہی نظریہ جسے مجید نظامی سینے سے لگائے ہوئے تھے اور جو نوائے وقت کی روح ہے۔ مجید نظامی تو جہاد کے داعی تھے اور بقول ان کے جہاد کے نام سے دشمنانِ اسلام کی جان جاتی ہے۔ اسی لیے بد بخت آمر مشرف کے دور میں زبیدہ جلال اور قاضی جاوید نے کوشش کی کہ جہاد کا حوالہ تعلیم سے گول کر دیا جائے اور تعلیم کو غیر ملکی این جی اوز کے حوالے کر دیا جائے جبکہ مجید نظامی صاحب نے اس رویے کے خلاف سخت احتجاج کیا اور کہا کہ دو قومی نظریہ ہی پاکستان کی اساس ہے۔ پاکستان کے باب میں یہ نظریہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور اسے ہر سطح پر پڑھانا ضروری ہے۔ اپنے انٹرویو کے دوران نظامی صاحب نے جہاد پر زور دیا کہ یہی ایمان کی روح ہے اور غیر مسلم اسی سے ڈرتے ہیں۔ اس کے بغیر کشمیر کبھی آزاد نہیں ہوگا۔ اس کے بغیر ہندو بنیا ہمارے پاکستان کو ریگستان میں بدل دے گا۔ انہوں نے کہا کہ امن کی آشا کے نام پر لوگوں کو دھوکے دے رہے ہیں وگرنہ پراپیگنڈہ کرنے والے سب کچھ سمجھتے ہیں کہ ہندو نے گجرات کے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ مسلمانوں سے بھری ٹرین جلادی بامبری مسجد شہید کردی، کشمیر میں قتل عام کیا جو ان سے بن پڑا وہ انہوں نے ضرور کیا اور پھر امن کی آشا کیا مذاق ہے یہ اپریل فول جیسا مذاق ہے۔ یہ ہمارے شہیدوں کی توہین ہے۔ ابھی دیکھیے آئی سی ایل کے لیے کھینے والے کھلاڑیوں کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے سب کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔ ہندو ذہن کو مسلمانوں کی صرف تذلیل مقصود ہے۔ ہمارے کھلاڑیوں کو آئندہ کے لیے توبہ کر لینی چاہیے۔ نظامی صاحب نے کہا کہ وہ ہمارے کشمیریوں کو شہید کر رہے ہیں اور ہمارے دریاؤں کو ریگستان بنا رہے ہیں اور ساتھ ساتھ امن کی آشا والا ڈرامہ بھی کر رہے ہیں۔ نظامی صاحب کی ہر بات دونوں اور برجستہ ہوتی تھی۔



# سیارہ ڈائجسٹ کے عظیم الشان اسلامی نمبرز

## آثارِ قیامت نمبر

قرآن وحدیث کی روشنی میں علاماتِ قیامت اور آخرت اور حیاتِ بعد از موت کا احوال (قیمت: 175 روپے)

## اخلاق رسول نمبر

حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاکیزہ زندگی کے پاکیزہ واقعات چھپتل دستاویز (قیمت: 175 روپے)

## صحابہ کرام نمبر

ان عظیم سہیلوں کی کہانی، جنہوں نے دلت العالمین کی محبت میں زندگی بسر کی (قیمت: 175 روپے)

## فہم دین نمبر

اسلامی زندگی اور عبادات کے بنیادی مسائل کا حل قرآن وحدیث کی روشنی میں (قیمت: 175 روپے)

## دعا نمبر

دعا تقدیر بدل دیتی ہے حدیث رسول (قیمت: 175 روپے)

## قص القرآن نمبر

ان واقعات کا مجموعہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی کو اس امت کو بتلانا ضروری سمجھے (قیمت: 175 روپے)

## حقوق العباد نمبر

حقوقِ فاضل انسانی بیان کرتا ہے جو مسیح پر عمل کرے ہی سچے مسلمان بن سکتا ہے (قیمت: 175 روپے)

## والدین نمبر

والدین کے فضائل حقوق اور فاضل اخلاقیات کا تاریخی دستاویز..... ہر گھر کی ضرورت (قیمت: 175 روپے)

## رسول نمبر

سیرت پاک پر ایک جامع دستاویز (دو جلدوں میں - قیمت: 350 روپے)

## عکس سیر نمبر

حضرت محمد مصطفیٰ کی حیاتِ طیبہ یعنی مقدس مقامات پر سفر (قیمت: 275 روپے) 450 عکس

## خلفائے راشدین نمبر

اسلام کی سر بلندی کیلئے خلفائے راشدین کی بے مثال قربانیوں کا ذکر (قیمت: 175 روپے)

## انبیائے کرام نمبر

پیغمبرانِ خدا کی حیاتِ طیبہ جاوداں کے روح پروردہ کرے (قیمت: 175 روپے)

## معجزات رسول نمبر

سرور کونین کی زندگی کے دوران وقوع پذیر ہوئے عظیم معجزات و معجزات چھپتل دستاویز (قیمت: 175 روپے)

## صحابیات نمبر

100 سے زائد صحابیات کا تذکرہ جنہوں نے رسول اکرم سے بیعت کی (قیمت: 175 روپے)

## حج عمرہ اور زیارات نمبر

حج اور عمرہ کی دلچسپی کا طریقہ آسان اور عام فہم میں اہم مسلمات کی تشہیدی اور دستاویز (قیمت: 175 روپے)

## لاذلل اسلامی واقعات نمبر

رسولِ خدا، خلفاء راشدین، صحابہ کرام اور صالحین کی زندگیوں کے ایمان افروز واقعات (قیمت: 175 روپے)

## قرآن نمبر

ایمان افروز عقل پرور اور عمل آفرین پیشکش (تین جلدوں میں - قیمت: 525 روپے)

## ادبیائے کرام نمبر

اللہ کے برگزیدہ بندوں کی ایمان افروز داستانیں (چار جلدوں میں - قیمت: 700 روپے)

## فرمان رسول نمبر

عاشقانِ رسول کی خدمت میں ایک بے مثال تحفہ (قیمت: 175 روپے)

## ازواجِ مطہرات نمبر

اہم بات المؤمنین کی پاک زندگی کے واقعات، جو آج تک کیلک جگہ انکھینے کی جاسکے (قیمت: 200 روپے)

## قرآنی وظائف نمبر

ہماری آپ کی اور ہر گھر کی پریشانیوں، الجھنوں، مشکلات کے حل کیلئے وظائف (قیمت: 175 روپے)

## اسلامی حکایات نمبر

دلچسپ اور پُر اثر طرزِ تحریر میں قوتِ ایمانی سے سرشار سبق آموز حکایات کا مجموعہ (قیمت: 175 روپے)

## توبہ نمبر

توبہ کی حقیت کے دروازے کھلتے ہیں سہرے واقعات سے مزین توبہ کے آداب، فضائل (قیمت: 175 روپے)

## شرعی احکام نمبر

عملیات سے معاملات تک اور معاشرت سے لیکر سببیت تک مکمل ضابطہ حیات (قیمت: 175 روپے)



مجید نظامی صاحب کے مزاج میں سادگی بدرجہ اتم موجود تھی۔ وہ اپنی اصل سے مکمل جڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے بدلتی ہوئی اقدار سے ہرگز اثر قبول نہیں کیا۔ ان کے رشتے ناتے اور تعلق داریاں بھی دیر پا مضبوط تھیں۔ انکے ساتھ ملازم کئی برس سے ان کے پاس تھے۔ ان کے دیرینہ خدمت گزار منیر سے بات ہو تو وہ نصف صدی کے قریب کی تعلق داری کا ذکر ہوتا ہے۔ وہ کسی ملازم کو نہیں نکالتے تھے اور اگر کوئی لالچ میں آکر چھوڑنا چاہے تو اسے روکتے بھی نہیں تھے۔ انہیں اپنے اوپر اور ادارے پر مکمل اعتماد تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ کسی کے آنے جانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اصل میں نوائے وقت میں نظریاتی شخص ہی چل سکتا ہے۔ یہاں بلیک میلنگ یا زبردست کا گز نہیں۔

مجید نظامی صاحب میں ایک نہایت پیاری معصومیت بھی نظر آتی تھی کہ وہ زور درخ تھے۔ وہ فوراً راضی بھی ہو جاتے تھے۔ بے پناہ محبت کرتے تھے تو انتہاؤں پہ چلے جاتے تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر قدیر خان کو محسن پاکستان کا خطاب دیا اور ان کی رہائی کا اشتہار مسلسل چھاپا اور حکومت کے کہنے پر اشتہار کی اشاعت بند نہ کرنے پر اپنے اشتہار بھی بند کروائے۔ ان کی رہائی کے لیے وقت ٹی وی کا قاعدہ مہم چلاتا رہا۔ بوجہ ڈاکٹر قدیر خاں کسی دوسرے اخبار میں لکھنے لگے تو ہلکے سے ملال کے بعد مجید نظامی صاحب اس طرح ان کا ذکر کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی خبریں اسی شان کے ساتھ نوائے وقت میں چھپ رہی ہیں۔ یہ بڑے آدمی کی نشانی ہوتی ہے کہ فوراً رنجش بھلا دیتا ہے۔ میں نے گزارش کی کہ وہ میرے کالج یعنی اسلامیہ کالج سول لائنز آکر طلباء کو لیکچر دیں۔ یہ کالج ان کا پہلا کالج بھی ہے۔ پرنسپل راء جلیل خواہش کرتے ہیں کہ چھ ہزار بچے انہیں سننا اور دیکھنا چاہتے ہیں۔ نظامی صاحب نے کہا کہ وہ ضرور اور ضرور آئیں گے۔ یہی نسل تو ہے جس میں سے حمید نظامی اور مجید نظامی جیسے شخص اور بے باک لوگ پیدا ہوں گے۔ تبھی اس ملک کی تقدیر بدلے گی یقیناً عہد موجود میں وہ جگہ کا استعارہ تھے۔

انٹرویو پینٹل:-

سعد اللہ شاہ: آمنہ الفت، محمد زاہد میاں، احتشام جمیل شامی، عمران شانور۔

سوال: سانگلہ ہل سے لاہور تک کے سفر کے بارے میں آپ کیا بتائیں گے؟

مجید نظامی: میں 13 اپریل 1928ء کو پنجاب کے شہر سانگلہ ہل میں پیدا ہوا۔ میرا تعلق متوسط طبقہ کے ایک دین دار گھرانے سے ہے۔ میرے والد میاں محمد دین صابن کا کاروبار کرتے تھے جبکہ والدہ گھر کی ذمہ داریاں پوری کرنے کے بعد اپنا زیادہ وقت قرآن مجید کی تلاوت میں گزارتی تھیں۔ میری عمر اڑھائی سال تھی جب میرے والدہ کا انتقال ہو گیا۔ میں نے میونسپل بورڈ سانگلہ ہل کے پرائمری سکول سے ٹاٹ پر بیٹھ کر پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ 1944ء میں ہندو ہائی سکول لاہور سے میٹرک کیا۔ 1946ء میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور سے ایف اے کیا۔ حمید نظامی مرحوم نے اپنے ایک دوست کے کہنے پر مجھے اکاؤنٹس کی تعلیم کے لیے ہیلہ کالج لاہور داخل کروادیا۔ میں نے دو سال وہاں گزارے مگر میری فیلڈ اکاؤنٹس تھی ہی نہیں۔ چنانچہ میں حمید نظامی کو بتاتے بغیر گورنمنٹ کالج لاہور چلا آیا۔ میں نے بی اے اور ایم اے سیاسیات یہیں سے کیا۔ ایم اے میں میرا تھیسس پریس آف پاکستان تھا۔ 1937ء میں حمید نظامی مرحوم نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنیاد رکھی اور بانی و صدر منتخب ہوئے وہ اس وقت اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے سٹوڈنٹ تھے۔ اس

تحریک نے اس قدر زور پکڑا کہ 23 مارچ 1940ء کو قائد اعظم محمد علی جناح کے حکم پر پندرہ روزہ نوائے وقت کا اجراء ہوا۔ 15 نومبر 1942ء کو نوائے وقت ہفت روزہ ہوا اور 22 جولائی 1944ء سے نوائے وقت روزنامہ کی صورت میں شائع ہونے لگا۔

سوال: نوائے وقت کے ساتھ وابستگی کے ابتدائی عہد کو یاد کر کے کیا محسوس کرتے ہیں؟

مجید نظامی: میں نے ساری زندگی اسی دشت میں گزاری ہے۔ 8 بیڈن روڈ لاہور ہمارے گھر میں نوائے وقت کا دفتر تھا۔ میں پرچہ بھی تہہ کرتا تھا اور پوسٹ کرنے کے لیے چٹیں بھی لگاتا تھا۔ اس کے بعد نوائے وقت کے لیے سر رہا ہے اور ادارتی شذرے بھی لکھتا تھا۔ 1954ء میں میں ایم اے سیاسیات کا امتحان دے کر لندن چلا گیا۔ میں وہاں 8 سال تک نوائے وقت کا نامہ نگار بھی رہا۔ میں نوائے وقت کے لیے شروع میں سینما ہال میں فلموں کے اشتہار بھی لاتا رہا۔ 1962ء میں مجید نظامی کی وفات پر میں لاہور آ گیا اور نوائے وقت کی باگ ڈور سنبھالی۔ مجید نظامی اپنی زندگی میں مجھے ایڈیٹر مقرر کر گئے تھے۔ پھر جب میں نے حالات کا جائزہ لیا تو مجھے ہر طرف اندھیرا نظر آیا۔ اخبار کے انتظامی اور مالی حالات اچھے نہیں تھے۔ یہاں ایوب خاں کا مارشل لاء بھی تھا۔ مجید نظامی کے لیے یہ ممکن ناقابل برداشت تھی۔ مجید نظامی اس مٹن کا شکار ہوئے اس لیے انہیں مارشل لاء کا پہلا شہید بھی کہا جاتا ہے۔

سوال: فوجی حکومت کے دوران اخبارات انتہائی اہمیت اختیار کر جاتے ہیں اور ان کا کردار منفی اور مثبت؛ شدید اثرات مرتب کرتا ہے۔ ایوب خاں کے اوکین مارشل لاء کے دوران نوائے وقت اور آپ کا کیا کردار رہا؟

مجید نظامی: نواب کا لا باغ فاتحہ خوانی کے لیے ہمارے گھر 16 ٹیبل روڈ پر تشریف لائے۔ اس کے بعد ایک دفعہ میں انہیں ان کے گورنر ہاؤس ملے گیا۔ نواب آف کالا باغ تیس ترین لوگوں میں سے تھے۔ تھوڑی سی بے تکلفی ہوئی تو وہ مجھے کہنے لگے۔ میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا فرمائیے۔ تو وہ کہنے لگے دیکھیے آپ کے بھائی نے جو پالیسی چھوڑی ہے اگر آپ اسے جاری نہیں رکھتے تو (پھر یہ مردانگی نہیں ہوگی) یہ بات انہوں نے مجھے پنجابی میں کہی۔ میں نے ان سے کہا نواب صاحب آپ فکر نہ کریں یہ پالیسی انشاء اللہ جاری رہے گی اور میں نے اس پالیسی کو جاری رکھا۔ ایوب خان نے نوائے وقت کے اشتہار بند کروا دیئے۔ ایوب اس وقت دباؤ ڈالتے مگر لیکن ہم بھی عادی ہوتے گئے۔ میرا خیال ہے ایوب خاں کا دور مارشل لاؤں کا بدترین دور تھا۔ بہر حال ایوب خاں مرحوم کے ساتھ ہماری پہلی میٹنگ کراچی میں ہوئی، وہ ہمارے سامنے کرسی پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے فرمایا آپ لوگوں کو شرم آنی چاہیے۔ اپنے گریبان میں منہ ڈالیں۔ میں اس وقت سب سے نوجوان ایڈیٹر تھا۔ میں نے کہا جان کی امان ہے! وہ مسکرائے اور کہا امان ہے۔ میں نے کہا مجھے کس بات پر شرم آنی چاہیے آپ بتا سکتے ہیں؟ وہ کہنے لگے کہ آپ بیٹھ جائیں، میرا اشارہ آپ کی طرف نہیں تھا۔ میں نے کہا فیلڈ مارشل صاحب آئندہ آپ جب بات کریں تو اس کی طرف اشارہ کر کے بات کریں کہ تمہیں شرم آنی چاہیے تم یہ کر رہے ہو۔ آپ کو ہم سب کو نہیں کہنا چاہیے تھا۔ خیر انہوں نے بڑی مشکل سے مجھ سے چچا چھڑایا اور کہا

آئندہ ایسا ہی ہوگا۔

سوال: بھٹو صاحب سے آپ کی ملاقاتیں ہوتی رہیں اس حوالے سے بتائیں گے؟

مجید نظامی: ذوالفقار علی بھٹو کو ایوب خاں نے وزارت خارجہ سے الگ کیا تو میں اور زید اے سلہری انہیں ملنے گئے، کچھ بات یہ ہے کہ بعد میں انکشاف ہوا کہ سلہری صاحب کا تو مشن ہی کچھ اور تھا۔ بھٹو صاحب سے چائے پر گپ شپ کے دوران میں نے کہا بھٹو صاحب آپ پریشان نہ ہوں، آپ نوجوان ہیں ابھی آپ کے لیے بہت وقت پڑا ہے آپ وزارت کی بجائے اپوزیشن میں آئیں۔ اپوزیشن کو تیار کریں اور ایوب خاں کا مقابلہ کریں۔ وہ تیار ہو گئے چنانچہ وہ لاہور آتے رہے۔ گپ شپ ہوتی رہی۔ ہمارے دفتر کے نیچے ہیکو ریسٹورنٹ میں ہماری ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ یوم حید نظامی ان کی صدارت میں وائی ایم سی اے میں منایا جائے چنانچہ پہلا جلسہ ان کا لاہور میں میں نے کروایا۔ اتارش تھا کہ ٹریفک جام ہو گیا۔ جلسہ ختم ہوا تو ہم نے انہیں سڑکیں لگا کر ٹیلا گنبد والی سائڈ سے نکالا۔ انہی دنوں ڈاکٹر مبشر حسن نے مجھ سے ایک خط مانگا کہ میں بھٹو صاحب کو ملنا چاہتا ہوں مجھے تعارفی خط دے دو۔ چنانچہ نے انہیں خط دے دیا۔ اللہ جانے انہوں نے کیا کیم کی، وہ بھٹو صاحب سے ملے اس کے بعد پیپلز پارٹی بنی اور ان کے گھر کنوینشن ہوا اور پیپلز پارٹی کے سیکرٹری جنرل بن گئے لیکن آپ جانتے ہیں کہ انہوں نے بطور وزیر خزانہ ملک کی معیشت کا کس طرح بیزا غرق کیا۔ بھٹو صاحب کا دور ہمارے لیے بڑا دلچسپ رہا وہ ہمارے دوست بھی رہے اور مخالف بھی۔

سوال: نوائے وقت کے مکمل طور پر آپ کی دسترس میں آنے کا پس منظر کیا تھا؟

مجید نظامی: 69ء کے آخر کی بات ہے میری بھابھی میرے بھتیجے (عارف نظامی) کو لے کر نوائے وقت کے آفس آگئیں اور کہنے لگیں ”آج سے میں آفس میں بیٹھا کروں گی“ میں نے کہا ٹھیک ہے ”تشریف لائیں“ میں اسی دن آفس چھوڑ کر چلا گیا۔ چونکہ میرا اوڑھنا کچھ نواہی صحافت تھا اس لیے میں نے اپنے دو چار دوستوں سے قرضہ لیا اور پرانی اتارکلی میں عدائے ملت کے نام سے اپنا روزنامہ اخبار شروع کر دیا۔ میری بھابھی، عارف نظامی اور بڑے بھائی جب اخبار سنبھال نہ سکے تو میرے پاس آئے۔ عارف اور شعیب کہنے لگے ”چچا جان آپ آئیں نوائے وقت کو آپ ہی چلا سکتے ہیں“ میں نے کہا ”آپ جو چاہتے ہیں مجھے لکھ دیں“ چنانچہ 71ء میں 2 لاکھ 35 ہزار روپے ادا کر کے میں نے نوائے وقت ڈیپیکریشن اور پیشانی ان سے خریدی اور پھر پالیسی وہی رکھی جو آج بھی قائم ہے۔

سوال: بھارت اور پاکستان کے درمیان خوشگوار تعلقات کی کوششیں ہوتی رہتی ہیں۔ دونوں جانب سے خیر سگالی و فدا آتے رہتے ہیں آپ انڈیا کے غلو ص نیت کو کس زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں؟

مجید نظامی: انڈیا ہمارا بھی دوست نہیں ہو سکتا، انڈیا نے ہی پاکستان کو دودھوں میں تقسیم کرایا۔ ان کے کمانڈر خود تسلیم کر چکے ہیں کہ ہم نے پاکستان کو توڑا۔ میں سمجھتا ہوں انہوں نے کشمیر کے ذریعے پاکستان کو ریگستان بنانے کی ٹھان رکھی ہے۔ بھارت کشمیر کے دریاؤں پر 26 ڈیم بنا چکا ہے لیکن ہم ابھی تک کچھ نہ کر سکے۔ ہمارے دریا خشک ہو رہے ہیں لاہور میں پانی بہت ہی نیچے جا چکا ہے لیکن ہم ابھی تک کوئی حکمت عملی وضع نہیں کر سکے۔ قوت بازو کے بغیر ہم کشمیر حاصل نہیں کر سکتے۔ ہماری قوم میں قوت بازو بہت اور قوت ایمانی کی



ضرورت ہے۔

سوال: آپ کے پیچھے عارف نظامی کے ساتھ آپ کے اختلافات کی نوعیت کیا ہے؟

مجید نظامی: عارف نظامی کو 2 لاکھ 35 ہزار روپے دینے کے بعد بھی میں نے بطور رپورٹر اپنے ساتھ رکھا۔ میرا خیال تھا کہ عارف نظامی اور رمیضہ مل کر نوائے وقت سنبھال لیں گے۔ رمیضہ میری (لے پاک) بیٹی ہے۔ میری بیگم کی بھانجی کی بیٹی ہے، بہت ذہین اور لائق بیٹی ہے۔ رمیضہ گرانٹر سکول کے بعد اے لیول کے لیے لندن چلی گئی۔ وہاں بی اے اور دیگر تعلیم حاصل کی۔ میری بیگم نے وفات سے قبل اپنے شیئرز رمیضہ کے نام کر دیے۔ میں نے بھی اپنے بہت سے شیئرز رمیضہ کو ٹرانسفر کر دیے۔ عارف کے پاس بھی کچھ شیئرز تھے اور عارف مجھ سے تین لاکھ روپے سے زائد تنخواہ بھی لے رہے تھے مگر رمیضہ کو شیئرز ملنے کے بعد وہ کچھ اور ہی سوچنے لگے۔ ہمارے دوستوں سے ملے اور اپنے حصے کی بات کرنے لگے، مختصر یہ کہ عارف نظامی سے میرا ڈیڑھ کروڑ میں سودا ہو گیا لیکن بعد میں وہ اس سودے کو خیر باد کہہ گئے اور مجھے ایک نہایت ہی قابل اعتراض خط لکھا جو باپ کے برابر چچا کو نہیں لکھا جاتا۔ ذکھ اس بات کا ہے کہ اتنی محبتوں کے بعد بھی عارف نے ہائی کورٹ میں ہمارے خلاف کیس دائر کر دیا ہے۔ اعتراض احسن کو وکیل کیا ہے لیکن ہم جانتے ہیں فتح حق اور سچ ہی کی ہوگی۔

سوال: مسلم لیگ کو آپ نے متحد کرنے کی کوشش کی لیکن اس کوشش کے باوجود مسلم لیگ ایک نہ ہو سکے اس کی کیا وجہ ہے؟

مجید نظامی: مجید نظامی ایم ایس ایف کے بانی اور پہلے صدر تھے۔ میرا مشن اب بھی وہی ہے جو مجید نظامی کا تھا۔ میں اب بھی مسلم لیگ کو قائد اعظم ہی کی جماعت سمجھتا ہوں۔ یہ قن اور ف نہیں۔ مسلم لیگ تو ایک ہی ہے۔ خواجہ رفیق کی بری پرسنل رفیق مجھے ساتھ لے گئے، وہاں لوگ نواز شریف کے لیے قائد اعظم عافی زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے، وہاں مجھے بھی خطاب کا موقع ملا۔ میں نے کہا کہ نواز شریف قائد اعظم عافی ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ ان کی پہلی جماعت مسلم لیگ نہیں بلکہ تحریک استقلال تھی اور لیڈر اصغر خاں۔ اور میرا یہی ایمان ہے کہ مسلم لیگ ایک ہی ہونی چاہیے چار چار نہیں۔ میں نے ملک کی خراب صورتحال کو دیکھ کر مسلم لیگ کے تینوں سربراہان کو ایوان نظریہ پاکستان بلایا۔ نواز شریف اور چوہدری شجاعت حسین خود تشریف لائے اور پیر پگڑا صاحب نے اپنا نمائندہ بھیجا۔ سب سے مثبت کردار مسلم لیگ فکشنل پیر پگڑا کا تھا۔ باقی دونوں کے ذاتی اختلافات کی وجہ سے مسلم لیگ ایک نہ ہو سکی۔ میں نے کہا کہ مقابلہ ق لیگ اور ن لیگ کریں گے اور کامیابی کی بوٹی پیپلز پارٹی کی چیل لے اڑے گی۔

سوال: ایسی دھماکے کے حوالے سے حکومت پاکستان نے آپ کو اعلیٰ ایوارڈز سے نوازا ہے۔ ہمارے قارئین کی معلومات کے لیے اختصار کے ساتھ بیان فرمائیں۔

مجید نظامی: 21 مئی 1998ء میں وزیر اعظم نواز شریف نے مدیران اخبارات و جرائد سے ہندوستان کے ایسی دھماکے کے جواب میں پاکستان کے رد عمل کے بارے میں تبادلہ خیال کیا تو میں نے انہیں مشورہ دیا بلکہ مطالبہ کیا کہ میاں صاحب دھماکہ کر دیں ورنہ قوم اور ہم آپ کا دھماکہ کر دیں گے۔ ایسی دھماکہ کے سلسلے میں مجھے قومی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے بڑے سول ایوارڈز نشان امتیاز سے نوازا۔ اس سے

پہلے ستارہ پاکستان اور ستارہ امتیاز بھی مل چکا ہے۔

سوال: معرکہ کارگل میاں نواز شریف اور جنرل پرویز مشرف کے درمیان وجہ تازہ بنا۔ آپ سینئر صحافی کی حیثیت سے کیا رائے رکھتے ہیں؟

مجید نظامی: میں حلفاً کہتا ہوں کہ کارگل جنگ کے پرویز مشرف ذمہ دار ہیں۔ میری پرویز مشرف سے کئی ملاقاتیں ہوئیں میں نے ملک کے اہم ایڈیٹرز پر ان کی توجہ دلانے کی بہت کوشش کی مگر پرویز مشرف ہمیشہ ملک میں بگاڑ کا باعث بنے رہے۔

سوال: ہر اخبار ایک پالیسی کے تحت چلتا ہے جو دوسرے اخبارات کے مطابق بھی ہو سکتی ہے اور مخالف بھی۔ آپ نوائے وقت کی پالیسی کے بارے میں کیا کہیں گے؟

مجید نظامی: نوائے وقت کی پالیسی ہمیشہ ہی دوسرے اخبارات سے مختلف رہی ہے۔ ہم نے آج تک کسی انڈین اداکارہ کی تصویر شائع نہیں کی۔ اگر مجھے پتہ چل جائے تو میں ایسا کرنے والے کو جرمانہ کرتا ہوں۔ جب تک میرے علم میں نہیں ہوتا، علمہ اپنا لوج تکتا رہتا ہے جب مجھے پتہ چل جائے، میں انہیں فارغ کر دیتا ہوں انڈین پالیسی کی حمایت کرنے والے اور صرف پیسے کے لیے لکھنے والے کالمسٹ کی نوائے وقت میں کوئی جگہ نہیں۔ ہمارا ڈوڑھنا چھوٹا ہی نظریہ پاکستان کی اساس ہے۔ ایسی ہی پالیسی ہم نے وقت ٹی وی کے لیے رکھی ہے۔ انڈین چینلوں پاکستان میں بین ہونے چاہئیں۔ انڈین اخبارات یہاں نہیں آتے انڈین چینلوں بھی نہیں چلنے چاہئیں۔

سوال: صحافت کی دنیا میں ایک اصطلاح 'زرد صحافت' رائج ہے۔ آپ اس کا پس منظر اور پیش منظر کیسے بیان کریں گے؟

مجید نظامی: لفافہ جزلزم اصل میں زرد صحافت ہے۔ یہ چیز پارٹیشن سے پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے، بھٹو دور میں بھی اخبارات کو ایک لفافہ جاری کیا جاتا تھا لیکن الحمد للہ نوائے وقت ہمیشہ محفوظ رہا۔ ایک وزیر اعظم کے گھر مشہور کالمسٹ کو بھٹو بھی ملتا تھا اور بوتل بھی۔ بعض کالمسٹ کا کہنا ہے کہ بوتل کے بغیر ہم کالم لکھ ہی نہیں سکتے لیکن نوائے وقت میں ایسے صحافیوں اور کالم نگاروں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

سوال: آپ کی زندگی کے کوئی یادگار واقعات جو آپ ہم سے شیئر کرنا چاہیں؟

مجید نظامی: بچپن خان نے ایک بار ایڈیٹرز کو دعوت دی پنڈی میں مجھ پر اور دوسرے ایڈیٹرز پر ان دنوں مقدمے چل رہے تھے۔ کوثر نیازی مرحوم اس زمانے میں ابھی ایڈیٹر تھے۔ وہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے بچپن خان سے کہا کچھ ایڈیٹرز پر جو مقدمے چل رہے ہیں انہیں واپس لے لیں۔ بچپن خان نے کہا یہ معافی مانگ لیں میں انہیں چھوڑ دیتا ہوں۔ کوثر نیازی نے کہا چونکہ ہال میں خاموشی ہے۔ آپ سمجھیں کہ انہوں نے معافی مانگ لی ہے۔ میں کھڑا ہو گیا، میں نے کہا جنرل صاحب معافی کس بات کی، وہ کہنے لگے یہ جو آپ نے جرم کیا ہے مارشل لاء کورٹ میں آپ کے خلاف مقدمہ چل رہا ہے۔ اگر تم معافی نہیں مانگتے تو جاؤ مقدمہ لڑو میں نے کہا کہاں؟ انہوں نے کہا مارشل لاء کورٹ میں۔ میں نے کہا کہ مارشل لاء نہ مارشل لاء ہے، نہ کورٹ، کورٹ ہے۔ پھر ہم نے مقدمہ فیس کیا اور لڑا مگر معافی نہیں مانگی۔ بچپن خان سے اسی وجہ سے ناراض تھا اور اسی ناراضگی میں ان سے ایوارڈ لینے بھی نہیں گیا۔ ایک دفعہ ہم ان کے گھر چائے پر مدعو تھے ہم

چائے پی رہے تھے انہوں نے دراز کھولا اور ستارہ امتیاز میرے گلے میں ڈال کر کہا ”بچو! ہن تے قابو آیاں  
ایں ناں۔“

دوسرا واقعہ ہندوستان کے حوالے سے ہے جب سے پاکستان بنا، بھارت نے پاکستان کو تسلیم نہیں کیا۔ ہر موقع پر پاکستان کی دشمنی اور مخالفت کی ہے۔ جرنل ضیاء الحق جب اپنے دور اقتدار میں ”کرکٹ ڈپلومیسی“ کے تحت بھارت جا رہے تھے تو انہوں نے مجھے بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ اس پر میں نے انہیں جواب دیا ”اگر آپ ٹینکوں پر بیٹھ کر جانے کے لیے تیار ہیں تو میں ساتھ چل سکتا ہوں ورنہ آپ معذرت سمجھیں۔“

سوال: مجسٹ پاکستان ڈاکٹر قدیر خاں کے بارے میں ملکی اخبارات و جرائد میں بہت کچھ لکھا گیا نوائے وقت کا کردار بھی نمایاں رہا۔ آپ نوائے وقت اور ڈاکٹر خان کے تعلق پر کیا روشنی ڈالیں گے۔

مجید نظامی: ڈاکٹر قدیر کی رہائی کا اشتہار ہم کئی سالوں دیتے رہے۔ ان کے لیے نوائے وقت کے صفحات حاضر تھے مگر شاید پیسے میں زیادہ کشش ہے وہ رہائی کے بعد ہماری محبتوں کو بھول کر کسی اور اخبار کے لیے کالم لکھ رہے ہیں۔ مجھے اور ڈاکٹر قدیر کو اکٹھے نشان امتیاز ملا تھا۔

سوال: آپ صحافی ذمہ داریوں کو ایک تسلسل کے ساتھ بھارے ہیں آپ علیل بھی ہوئے حتیٰ کہ بائی پاس آپریشن سے بھی نزرے کچھ اس کے بارے میں بتائیے۔

مجید نظامی: جی ہاں میں تین بار بائی پاس کروا چکا ہوں، ایک کے بعد ہی ڈاکٹر ریٹ کا مشورہ دیتے ہیں۔ لیکن اللہ کا کرم ہے کہ میرا عزم اب بھی جواں ہے۔ ایک حساب سے یہ میری چوتھی زندگی ہے شاید اللہ پاک نے مجھ سے کوئی اور بڑا کام لیتا ہے جو ابھی تک اس کی خاص عنایات ہیں مجھ پر۔

سوال: عوامی سطح پر ملکی حالات مختلف اوقات میں مختلف رویوں کو جنم دیتے ہیں آپ اس حوالے سے کیا کہیں گے؟

مجید نظامی: جسے پتہ ہی نہیں رویہ کیا ہوتا ہے جس کا مسئلہ آٹا، دال اور روٹی ہے۔ جو قطاروں میں لگ کر چینی خریدتا ہے۔ جس کے لیے دو وقت کی روٹی بچوں کو کھلانا مشکل ہے، اسے رویے کا کیا علم ہے۔ رویہ تو اوپر کی سطح پر لوگ نوٹ کرتے ہیں غریب غرباء کا اس سے کیا واسطہ۔

سوال: اپنے صحافی تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں قوم کو کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

مجید نظامی: قوم کے نام پیغام میں یہی کہوں گا کہ قائد اعظم نے آپ کو ہجوم سے قوم بنایا تھا آپ قوم سے ہجوم نہ بنیں۔

ہم نے یہ ملک اسلام کے نام پر بنایا تھا۔ دو قومی نظریہ ہمیں یہی درس دیتا ہے کہ ہم دو قومیں ہیں۔ ایک ہندو اور ایک مسلمان۔ ہم نے قائد کے عہد کو بھلا دیا۔ اس عہد کو بھائیں ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔ اقبال کی فکر کو لے کر آگے بڑھیں۔ اللہ ہمیں توفیق دے۔ یہ ہمارے اعمال کی سزا ہے۔ ہمیں اللہ کی طرف سے سزا مل رہی ہے اس نازک صورت حال میں ہمیں اجتماعی توبہ کرنی چاہیے۔ بے شک وہ معاف کرنے والا ہے۔  
(بھکرہ: پاکستان آئینہ میگزین)





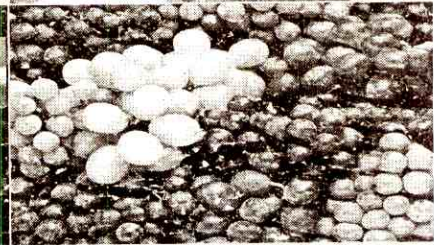
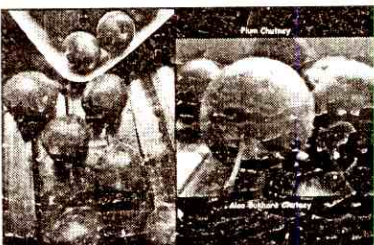
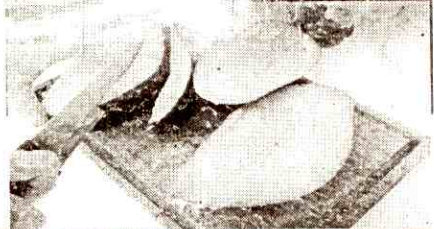
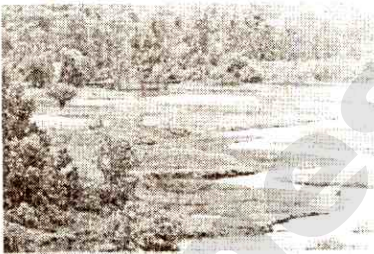
# برسات میں پھلوں کے غذائیت اور شفا حاصل کیجئے!

صغیرہ بانو شیریں

برسات میں پھلوں کا اپنا ہی مزہ ہے، آموں کی بہار چائمن کی سوغات، انگوروں کے سرخ سبز پیلے خوشے، سرخ و سفید انار ہرے اور پیلے امرود، آلو بخارے، آڑو، سردا، گرما وغیرہ وغیرہ قدرت کے انمول تحفے ہیں۔ نہ صرف جسم کو غذائیت فراہم کرتے ہیں بلکہ امراض میں بھی مفید ہیں۔

ہے۔ برسات میں آموں کی بہار ہوتی ہے۔ اسے طریقے سے کھایا جائے تو انسانی صحت کو قائم رکھتا ہے۔ صالح خون بناتا ہے۔ سوکھے سڑے جسم کو سڈول تو انا کرتا ہے۔ قبض کو دور کرتا ہے۔ پاکستان

پھلوں کا بادشاہ آم ہے، دیکھا جائے تو اس کی ایک ہزار سے زیادہ اقسام پوری دنیا میں چھائی ہوئی ہیں۔ سرخ، ہرے، اورنج اور پیلے ریلے آم کے جہاں اپنے اپنے رنگ ہیں وہاں ذائقہ بھی مختلف



نکالتا ہے۔ اسی لیے یرقان میں بھی مفید ہے۔ میٹھے آم کا تھوڑا سا رس پتلے دہی میں ملا کر پینے سے پیٹ کے امراض میں اور سانس کے مریضوں کو فائدہ ہوتا ہے۔ مردانہ کمزوری میں بھی آم مفید ہے۔ حکیم حضرات مختلف ادویہ کیساتھ آم کے رس میں مچون اور آم پاک بناتے ہیں جو کمزوری کو دور کر دیتا ہے۔ آم کھانے کے بعد دودھ پانی میں ملا کر مکی لسی پی جائے تو آم کی گرمی زائل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح آم کھا کر چند جانتیں کھائی جائیں تو آم کا ضرر نہیں ہوتا۔ آم کو کھانے سے پہلے اچھی طرح دھونا چاہیے۔ آم پکانے کے لیے اس میں دوا کی پڑیا رکھی جانی ہے جو ہریلی ہوتی ہے آم دھو کر پانی میں بھگوئیے پھر انہیں فریج میں رکھ کر ٹھنڈا کریں۔ آم کا حلوہ بھی خاص طریقہ سے بنتا ہے۔ غورتوں اور مردوں کے لیے بہت اچھا ہے۔ بانجھ مرد و عورت بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ آم کے اوپر سیاہ نشان ہوتا ہے۔ اسے ہٹا کر صاف کر کے آم چوسنا یا کاٹنا چاہیے تاکہ نقصان نہ ہو۔ اس سے گلے میں خراش ہوتی ہے۔ آم کے پتے، گٹھلی، کچے آم سب فائدہ مند ہیں۔ وٹامن اے کی وافر مقدار اس میں موجود ہے۔ جس سے یہ آنکھوں کے لیے بھی فائدہ مند ہے۔ اندھرتا بھی اس کے کھانے سے دور ہوتا ہے۔ آنکھوں کے اور امراض میں بھی آم کھانے سے شفا یاب ہوتے ہیں۔

آم کا اچار ڈالا جاتا ہے۔ کٹھا اور میٹھا اچار مختلف طریقوں سے بنتا ہے۔ حیدر آبادی آم کا اچار بے حد کٹھا ہوتا ہے۔ آم کی میٹھی چٹنی سرکہ میں بنتی ہے۔ آم کا گڑ انبہ بنتا ہے۔ سوچی میں کٹے آم ڈالا کر گڑ کے ساتھ پکاتے ہیں۔ نرم پتلا سوچی کا کٹھ میٹھا گڑ انبہ کھا کر مزہ آ جاتا ہے۔ بٹلہ دیل میں آم کا شیرہ پوری پر ڈال کر سکھایا جاتا ہے یہ آم رس سوکھ کر

میں انور رٹول دھیری چونسہ لنگڑا سندھڑی، طوطا پری وغیرہ لوگوں میں بہت پسند کیے جاتے ہیں۔ یہ غذا کے ساتھ ساتھ دوا کا بھی کام انجام دیتا ہے۔ عام طور پر خواتین اور نوجوان لڑکوں کو شکایت ہوتی ہے چہرے پر رونق نہیں۔ مرچھایا ہوا چہرہ لگتا ہے، کام کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ کئی آم ایک مکمل غذا ہے اس میں وٹامنز بیٹا کیروٹین انٹی آکسیڈنٹ موجود ہیں۔ گلوکوز بھی ہے پانی بھی۔ اس میں موجود پوٹاشیم ہمارے دل کی دھڑکن کو اعتدال میں رکھتا ہے۔ فاسفورس، فولاد، کیلشیم وغیرہ جسم کو توانائی دیتے ہیں۔ بچوں کی نشوونما کے لیے بہترین غذا ہے۔ چہرے کی رونق اور وزن بڑھانے کے لیے زمانہ قدیم سے طیب آم اور دودھ تجویز کرتے ہیں۔ اس کا بنا ہوا ملک ہیک بھر پور توانائی دے کر خسن میں اضافہ کرتا ہے۔ چہرے پر چمک آتی ہے۔ خواتین اپنی بڑھتی ہوئی عمر میں آم کھا کر عمر رسیدگی کے اثرات دور کر سکتی ہیں۔ آم کا سکولش، چٹنی، مربہ، جیم بھی بنتا ہے۔

آم کھانے سے دل مضبوط ہوتا ہے۔ فالج اور گردوں کے امراض میں بھی مفید ہے۔ اسی طرح ضعف دماغ کو دور کرتا ہے۔ یادداشت کمزور ہو رہی ہو تو آم کھانے سے فائدہ ہوتا ہے۔ آم غلغلو بھی پتلا کر کے خارج کرنے میں مدد دیتا ہے۔ بار بار پیشاب آئے۔ بلا اختیار پیشاب نکل جائے جب بھی فائدہ دیتا ہے۔ جدید تحقیق بھی آم کی معترف ہے۔ اسکن اور پروٹینٹ گلیٹڈ کے کینسر کو روکتا ہے۔ بڈیوں اور پیپیریوں کے امراض میں بھی مفید ہے۔ نیند نہ آتی ہو بے خوابی ہو۔ قوت کی کمی ہو تو آم کھانے سے آرام آتا ہے۔ ہارمونی نظام اور تولیدی نظام کو بھی درست کرتا ہے۔ اس کے کھانے سے پیشاب بھی کھل کر آتا ہے۔ جسم سے ساری کثافت



کچھ لوگوں کو سرچکرانے کی شکایت ہوتی ہے۔ دیرینہ قبض رہتا ہے۔ کان بچتے رہتے ہیں۔ وہ ناشتہ میں روزانہ آلو بخارے کھائیں تو صحت ہوگی۔ حاملہ خواتین کی طبیعت کھانے کی طرف مائل نہیں ہوتی۔ وہ آلو بخارے کھائیں۔ بھوک لگے گی۔ ایک پاؤ آلو بخارے میں دو روٹیوں کے برابر طاقت ہوتی ہے۔ کمزوری ہو، بیماری سے صحت یاب ہوئے ہوں۔ تو آلو بخارے غذا میں شامل کرنے سے کمزوری دور ہو جاتی ہے۔ پرانے طبیب کہتے تھے آلو بخارے کا موسم جیسے ہی شروع ہو تو چند دانے روزانہ کھانے سے بیماریاں نزدیک نہیں آتیں۔ جب تک آلو بخارے دستیاب ہوں ان کو ضرور کھائیں تاکہ صحت برقرار رہے۔

مٹانہ میں گرمی ہو، خون کی تیزابیت بڑھ جائے۔ پیٹ میں ہر وقت گیس کی شکایت رہے۔ قبض دور نہ ہوتا ہو۔ صبح اٹھ کر بد مزہ ڈکار آتے ہوں تو صبح کے وقت آلو بخارے کھانے سے پندرہ بیس دن میں یہ شکایت دور ہو جاتی ہے۔ برسات میں گرمی کی شدت سے بدن میں خارش، کھجلی ہو جاتی ہے۔ ایسے میں دو بار دن میں آلو بخارے کھانے اور شربت عتاب پینے سے فرق پڑ جاتا ہے۔ آلو بخارے کا مرہ اور جیم بھی بنتا ہے۔ سوکے آلو بخارے کی مٹھی چٹنی خوش ذائقہ بھوک لگانے والی ہوتی ہے۔ اب تو شادی بیاہ کے کھانے کے ساتھ بھی رکھی جاتی ہے۔ آلو بخارے اور املی کا شربت گرمی کو دور کرتا ہے۔ اس کا شربت بھی بنتا ہے۔ موسم میں ضرور کھائیں۔

### انگور

بازار میں ہرے انگور زردی مائل انگور سیاہ انگور کے کچھے نظر آتے ہیں۔ ان کی کئی قسمیں ہیں۔ سندرخانی انگور لوگ محاس اور ذائقہ کے لیے پسند

پاڑ کی طرح ہوتی ہے اور اس کے ٹکڑے کاٹ کر بازار میں بھی فروخت کیے جاتے ہیں۔ ان کا اپنا ہی منفرد ذائقہ ہوتا ہے۔ بڑے شوق سے لوگ کھاتے ہیں۔

اب تو کیک پر بھی آم سٹاؤٹ کے لیے لگائے جاتے ہیں۔ آم کی آکس کریم پسند آتی ہے۔ کسٹرڈ میں ریپلے آموں کا اور ہی مزہ ہے۔ پہلے دھوتوں میں آم ٹھنڈے کر کے تیلے کاٹے جاتے تھے۔ دودھ کی موٹی بالائی لے کر قوتوں پر لگا کر اس پر اور آم کے تیلے رکھ کر برف میں ٹھنڈے کیے جاتے ہیں۔ بالائی اور آم کی یہ میٹھی ڈش امراء کے ہاں بہت مقبول تھی۔ جسے کھانے سے لطف آتا تھا۔ آج بھی فریزر میں رکھ کر بالائی کے ساتھ آم ٹھنڈے کر کے کھائے جاتے ہیں۔

### آلو بخارا

برسات میں سرخ آلو بخارے نظر آتے ہیں پک کر سیای مائل ہو جاتے ہیں، برسات میں اس پھل کو جسم و جان قلب و دماغ کی تسکین سمجھا جاتا ہے۔ اس کا مزاج سرد ہے۔ برسات میں جس اور گرمی سے بُرا حال ہو جاتا ہے۔ ایسے میں چند دانے آلو بخارے کے کھالیے جائیں تو طبیعت سنبھل جاتی ہے۔ ٹھنڈے آلو بخارے جسم کی گرمی ڈائل کرتے ہیں دل جگر کو قوت دیتے ہیں مزاج کا چڑچا پن دور کرتے ہیں گرمی کی وجہ سے سر میں درد ہو رہا ہو۔ بے چینی بڑھ جائے، مٹی، تے، بد معنی ہو کچھ کھانے پینے کو دل نہ چاہے۔ قبض ہو، تو آلو بخارے کھانے سے طبیعت سنبھل جاتی ہے۔ اکثر لوگ جگر کی گرمی کی شکایت کرتے رہتے ہیں وہ آلو بخارے کھائیں بلڈ پریشر نہ ہو تو کالامک نہیں کر ہلکا سا چمڑک کر کھانے سے جگر معدے کو تقویت ملے گی، ہائی بلڈ پریشر میں بھی آلو بخارا بہت مفید ہے۔



بار پلانے سے فائدہ ہوتا ہے۔ انکور کا مربہ بنتا ہے۔ جن بچوں کو سبقت یاد نہ ہوتا ہو حافظہ کمزور ہو ان کو چھ بھر کشمش اور تین سے پانچ بادام رات کو پانی میں بھگو کر صبح کھلانے سے حافظہ تیز ہوتا ہے۔ اس کا پانی بھی پی لیتا چاہیے۔ سنڈ وانی، بلیک پرنس انکور میٹھے خوش ذائقہ ہوتے ہیں۔ آپ موسم میں انکور ضرور کھائیں۔ چاٹ میں کسٹر ڈالیں ڈالیں۔

### امروہ

برسات میں امروہ نظر آتے ہیں گورائے ہوئے میٹھے پیلے امروہ سب کو پسند ہیں۔ گلابی رنگ کے امروہ، ہرے امروہ دکانوں میں بچے ہوتے ہیں۔ اسے آپ غریبوں کا پھل کہہ سکتے ہیں۔ اس میں بیٹا کیروٹین، کیلشیم، فاسفورس، فولاد، پوٹاشیم، چکنائی، نشاستہ، وٹامن سی موجود ہے۔ امروہ خود تو ہانسم نہیں مگر ہاضمہ کو درست رکھنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ دل کو تقویت دیتا ہے۔ موم ہونے کی وجہ سے دل کی تکالیف میں ڈاکٹر بھی امروہ کھانے کی ہدایت کرتے ہیں۔ اکثر برسات میں امروہ میں کیڑے پڑ جاتے ہیں۔ امروہ کاٹ کر دیکھ لیں، اندر سے خراب تو نہیں۔ پھر کھائیے ورنہ نقصان ہوگا۔ سردیوں میں امروہ میں خرابی نہیں ہوتی مگر برسات کے موسم میں اکثر پودوں میں کیڑے لگ جاتے ہیں۔ دانٹوں مسوڑھوں کی بیماریوں، دانٹوں سے بدبو اور خون کا نکلنا ناک سے نکسیر بہنے میں امروہ وٹامن سی کی وجہ سے غذا اور دوا سمجھا جاتا ہے۔ یادداشت کی کمی ہونے لگے۔ الزائمر جیسا مرض لاحق ہو تو دوا کے ساتھ ساتھ آپ امروہ کا استعمال کریں۔ قدرت کے اس بھرپور تحفہ سے فائدہ اٹھائیے۔

ہمارے ہاں عام طور پر امروہ کی چاٹ بنتی ہے۔ اس میں نمک کالا نمک مرچ لیموں چمڑک دیتے ہیں۔ چاٹ سالہ تھوڑی سی چینی بھی ملائی جاتی ہے۔ عمر

کرتے ہیں اس میں کیلشیم اور پوٹاشیم فاسفورس وٹامن اے بی ڈی وغیرہ شامل ہیں۔ کچے انکور کھنے ہوتے ہیں مگر پک کر ان میں ذائقہ اور محاس آ جاتی ہے۔ پیاس کی شدت ہو تو انکور کھانے سے ختم ہوتی ہے۔ انکور ہمارے جسم کو نہ صرف طاقت دیتا ہے بلکہ عمدہ اور صالح خون بھی پیدا کرتا ہے۔ جسم کی تھکاوٹ اور ناتوانی کو دور کرتا ہے۔ سوکھے ہوئے انکور کو کشمش کہتے ہیں اس طرح بڑے انکور سے مٹھ پورے سال دستیاب ہوتی ہے۔ کمزور لوگ انکور کھا کر جسم کو فربہ کر سکتے ہیں۔ انکور کا سرکہ بنتا ہے۔ جو طبی فوائد سے بھرپور ہوتا ہے۔ خواتین کی اندرونی بیماریوں میں انکور کام دیتا ہے۔ اس کے کھانے سے لیکوریا جیسے امراض بھی صحیح ہو جاتے ہیں۔ اس میں انکور کا رس نکال کر پلاتے ہیں۔ اس میں اگر تھوڑا سا شہد ملا لیا جائے تو اور بھی فائدہ ہوتا ہے۔

کچھ لوگوں کے جسم میں عجیب سی بدبو رچ جاتی ہے۔ لوگ پاس بیٹھتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ یہ بدبو برسات میں زیادہ ہو جاتی ہے۔ انکور کے موسم میں چار چھچھ انکور کا رس اور چھ چھچھ گلاب کے عرق ملا کر پورے جسم پر نہانے سے پہلے لگایا جائے اور دو تین ہفتہ پابندی کی جائے تو بدبو ختم ہو جاتی ہے۔

پہلے زمانے میں بیگمات کا دل گھبراہٹا تھا خفقان کی شکایت ہوتی تھی۔ طبیب ایسے میں مٹھی بھر کشمش کے دانے گلاب کے عرق میں ڈال کر رات کو چاندی کے پیالے میں جالی سے ڈھک کر آسمان کے نیچے رکھتے تھے صبح نہار منہ ایک ایک دانہ کشمش کا کھا کر گلاب کا عرق پلاتے تھے۔ گھبراہٹ بے چینی دور ہو جاتی تھی۔ انکور کا شربت دل و دماغ کے لیے مفید ہے۔ چھوٹے بچوں کے منہ میں چھالے ہوں تو انہیں انکور کا رس ایک چھچھ صبح شام پلائیں۔ گردے اور مثانے کی پتھری کے لیے انکور کا رس دن میں تین

دانٹوں کی جملہ بیماریوں میں مفید ہے۔

### انار

انار کو جنگ کا پھل کہا جاتا ہے، بیدارہ اور قدحاری انار کے دانے چاٹ میں ملائے جاتے ہیں۔ جسم میں خون پیدا کرتا ہے۔ پیاس اور بے چینی کو دور کرتا ہے۔ دل جگر کو تقویت دیتا ہے اگر کمزوری اور بیماری کی وجہ سے ہونٹوں کا رنگ سفید ہو گیا ہو تو روزانہ ایک انار کھانے سے صحیح ہو جاتا ہے۔ رگوں میں کچھا دھوہہ بھی انار سے ٹھیک ہوتا ہے۔ انار کے دانے نکال کر نمک کالی مرچ کے ساتھ کھانے سے بھوک لگتی ہے۔ پیشاب کھل کر آتا ہے۔ سرخ اور سفید کارس کینسر میں مفید ہے۔ دل کو طاقت دیتا ہے۔ انار کا شربت اور جوس اب بازار میں دستیاب ہے۔ تازے انار کی افادیت زیادہ ہے۔

### آڑو

آڑو ایک صحت بخش پھل ہے۔ ہماری جلد کو شاداب رکھتا ہے۔ سانس کی مکالیف، دمہ، ہائی بلڈ پریشر، گردے کے ورم، خون کی کمی، اعصابی کمزوری، تیزابیت وغیرہ میں شفا بخش ثابت ہوا ہے۔ آڑو کا جوس اور نیم بھی ملتا ہے آڑو خواتین کے حسن کی بھرپور حفاظت کرتا ہے۔ اسے کھائیے بھی اور اسے لگائیے بھی۔ آڑو کا اسکرب اور ماسک جلد کو تازگی دیتا ہے۔ برسات میں بعض دفعہ آڑو میں بھی کیڑے پڑ جاتے ہیں۔ سفید باریک کیڑے ہوتے ہیں اس کو کاکٹ کر دیکھ کر کھائے۔ پیٹ میں کیڑے ہوں تو شام کے وقت تین چار آڑو آٹھ دس دن کھانے سے نکل جاتے ہیں۔ بھوک لگتی ہے۔ ہاضمہ اور معدہ ٹھیک رہتا ہے۔ آڑو کا ایک آپ سپرائٹ یا سیٹون اپ کے ساتھ بنائیں تو نیا ذائقہ آتا ہے۔ آپ آڑو چاٹ میں بھی ڈال سکتے ہیں۔

بڑھنے کے ساتھ خواتین بھی جلد کی خوب صورتی کے لیے جھریوں سے نجات کے لیے وزن کم کرنے کے لیے پریشان رہتی ہیں۔ امرو غذا میں شامل کریں۔ اس کے ساتھ امرو کے چند پتے پانی میں ابال کر چمے کو دھوئیے۔ امرو کے پتوں کا رس آپ ملتان می، شہد اور زیتون میں ملا کر بطور ماسک بھی لگا سکتی ہیں۔ امرو کی خویوں سے بھر پور فائدہ اٹھائیے۔

### جامن

برسات کے موسم میں پھوڑے پھنسی دانے جلدی بیماریاں ہو جاتی ہیں۔ قدرت نے خون صاف کرنے کے لیے اس موسم میں خاص طور پر جامن اور نیم کو متعارف کرایا ہے۔ سیاہی مائل اودے ننھے کھلی والے پھل کی غذائی اہمیت جامن کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ اس کا گودا اور پھل دونوں ہی کارآمد ہیں۔ شوگر کے مریضوں کے لیے ایک نایاب تحفہ اس کی کھلیاں بھی سکھا کر تمام سال کام آتی ہیں۔ انسانی جسم کے اندر گرمی، غیر ضروری حرارت کو جامن کنٹرول کر لیتا ہے یہ خون بھی صاف کرتا ہے۔ گرم مزاج کے لیے بے حد مفید ہے۔ اس کے اندر سائیڈک ایسڈ موجود ہے جو نہ صرف بھوک بڑھاتا ہے معدے اور انتوں کو تقویت دیتا ہے۔ جلن اور خراش کو بھی دور کرتا ہے۔ گرمی کی وجہ سے پیشاب جل کر سرخ رنگ کا آئے تو جامن کھانے سے آرام آتا ہے۔ قے، متلی، ہیضہ جیسی بیماری میں کام کرتا ہے۔ جامن دھو کر کسی برتن میں ڈال کر معمولی سانمک چھڑک کر خوب ہلا کر نرم کر کے کھانے جاہئیں اس طرح جامن کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگ تھوڑی سی سوٹھ ہیں کر رکھ لیتے ہیں۔ وہ بھی نمک کالی مرچ کے ساتھ جامنوں پر لگا کر کھاتے ہیں۔ جامن نہ صرف جسم کی کمزوری دبلے پن کو دور کرتا ہے بلکہ پیٹ درد میں بھی کام آتا ہے۔ جامن کی کھلی سکھا کر نمک کالی مرچ ملا کر مچن بنایا جائے،



جاوید رانی

# پچھو دوا

حقیقت کہانی



اب مجھے پچھو کی تلاش تھی جس کیلئے میں نے بہت سے پرندے پکڑنے والوں سے رابطہ کیا۔ پہلی بار معلوم ہوا کہ جانوروں، پرندوں کے علاوہ جہات بھی برائے فروخت تھے مگر پچھوؤں کے شکاری سامنے نہ آئے۔ اس دوران میں ایران کے دو پکراور لگا بیٹھا تھا اور میں نے پرندے امپورٹ ایکسپورٹ کرنے کا لائسنس بھی حاصل کر لیا تھا۔

**جانوروں کے سوداگر کی کہانی، وہ ایک روز اپنے جال میں پھنس گیا تھا**

گواہی کے طفیل مجھے عمر قید کی سزا ہو گئی۔ قیدی نے اپنا نام امتیاز علی بلوچ لکھا تھا اور بے شمار منت سماجت کرتے ہوئے یہ التجا کی تھی کہ میں مجھ جیل میں آکر اس سے ہونیوالی نا انصافی اس کی زبانی سن کر جیل کہانی میں عوام الناس تک پہنچاؤں۔

میرے سامنے مجھ جیل سے آیا عمر قید پانے والے قیدی کا خط پڑا تھا، جس میں اس نے استدعا کرتے ہوئے لکھا تھا کہ میری بیروی کرینوالا پیچھے کوئی نہیں، میں سراسر بے گناہ ہوں مگر پولیس کا بنایا خود ساختہ کیس اور پولیس کے ہی زیر اثر گواہان کی جھوٹی



غرق کرنے کیلئے ایجاد کر ڈالا۔ بولان تک پہنچ کر میں نے ڈرائیور سے دریافت کیا کہ اب کتنا سفر رہ گیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ہم نے آدھا راستہ طے کر لیا ہے یعنی کوسہ سے مجھ جیل کا دورانیہ تقریباً پونے دو گھنٹے کا تھا۔ قیامت خیز گرمی کی بدولت گاڑی کا اسے سی بھی برائے نام ٹھنڈک کر رہا تھا۔ چند منٹ بولان میں ٹھہرنے کے بعد سفر دوبارہ شروع کر دیا۔

جیل آبادی سے باہر تھا، بڑے گیٹ پر پہنچ کر میں نے سکندر خان کا کڑ کو اپنے آنے کی اطلاع بھجوائی زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا، میں ڈرائیور کو انتظار کرنے کا کہتے ڈیڑھ گھنٹے پر سنڈنٹ کے ہمراہ جیل کا بڑا گیٹ عبور کر کے خان صاحب کے آفس میں آن بیٹھا۔ وہ شاید راؤنڈ پر تھے، ان کے آفس سے جیل کا اندرونی منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ مجھ جیل میں ہمارے پنجاب کی جیلوں سے بہت کم روتی تھی۔ ہماری جیلوں کی کیا بات، چاروں جانب قیدیوں کی آمد و رفت، چھوٹی سے چھوٹی جیل میں بھی تین سے چار ہزار قیدی تو موجود ہی ہوتے ہیں، لیکن مجھ جیل جو کافی بڑی تھی اس میں تھوڑے بہت ہی قیدی ادھر ادھر نظر آرہے تھے۔ یکدم بولوں کی بھاری آواز اور ہوشیار باش کی صدا گونجی، سکندر خان کا کڑ اپنے آفس میں داخل ہوئے۔ میں نے اٹھ کر ان کا بڑھا ہاتھ تھامتے اپنا تعارف کروایا اور مجھ جیل آنے کی وجوہات بیان کی۔ انہوں نے فون پر چائے وغیرہ کا آرڈر دیا اور مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ”پنجاب میں تو اتنی گرمی کبھی نہیں پڑی ہوگی؟“ ”جی آپ نے بالکل درست فرمایا ہے۔“ میں نے جواب دیتے وہ لیٹر نکال کر انکے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے کھول کر اسے بغور پڑھا اور بولے ”آئی جی صاحب سے بات ہوئی ہے آپ کی اس سلسلہ میں؟“ میں نے نفی میں جواب دیا۔ پھر وہ فون پر بات کرنے لگے۔

بلوچستان خاص کر مجھ جیل کے گرد و نواح میں جون کی گرمی کو بھینسا مٹائی لوگوں کا ہی حوصلہ ہے۔ بہر حال میں کسی نہ کسی طرح کوسہ پہنچا اور ایک اچھے ہوٹل میں کمرہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ آئی جی جیل خانہ جات بشیر احمد بول زئی سے رابطہ ہوا اور انہوں نے اپنے پی اے حاجی سعید اللہ کے ذریعے مجھ جیل کے سپرنٹنڈنٹ سکندر خان کا کڑ تک رسائی میں راقم الحروف کی مدد فرمائی، جنہوں نے مجھ جیل آنے کی اجازت دیتے میرے لئے آسانیاں مہیا کر دیں۔ کوسہ سے بذریعہ گاڑی میں امتیاز بلوچ سے ملنے چل پڑا جو اپنی بے گناہی کی کھانجھ سے شیر کرتا چاہتا تھا۔

مجھ جیل کی جانب جاتے ہوئے مجھے ملک کے معروف دانشور، کالم نگار، رائٹر، شاعر اور اللہ کے نیک ولی جناب جبار مرزا یاد آگئے۔ جب وہ 1999ء میں روزنامہ مرکز اسلام آباد کے ایڈیٹر ہوا کرتے تھے۔ ان کا ایک کالم ”پچھونشہ“ ”آن دی ریکارڈ“ میں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ جناب نے اپنے کالم میں پچھونشہ کے بارے میں بتایا تھا، جو ہیروئن کے نشہ کے بعد معرض وجود میں آیا تھا اور جس کو کسی ہیروئن کی کیمیا کرنے متعارف کروایا ہوگا، جب یہ نشہ متعارف ہوا مری اور گرد و نواح میں پچھونشہ کی نسل ختم کرنے پر ہیروئن کی حضرات کمر بستہ ہو گئے اور باقاعدہ پچھونشہ کی تجارت شروع ہو گئی، براؤن پچھونشہ 75 روپے اور کالا پچھونشہ 100 روپے میں فروخت ہونے لگا۔ ہیروئن کی حضرات پچھونشہ کو قابو کر کے کسی بند کمرے یا اپنی چادر میں خود کو چھپا کر دیکتے کو کٹے پر پچھونشہ کو رکھتے اور اس کے جلنے وجود سے اٹھنے والے زہریلے دھوئیں کو کسی تنگی یا پائپ سے اپنے اندر گھسانے لگتے، دو چار سونے لیتے ہی نیم بیہوشی کے عالم میں کھو جاتے۔ پچھونشہ کے بعد چھپٹل پاؤڈر اور نجانے کیا کیا ان ہیروئن کی کیمیا گروں نے خود کو

پھاڑ، پچاس سے اوپر درجہ حرارت جس نے مجھے دہلا کر رکھ دیا تھا، ہینڈ ٹاول سے بار بار میں چہرہ پر آیا پسینہ صاف کرتے ڈپٹی کے قدم سے قدم ملاتا ان کے آفس کی جانب بڑھ رہا تھا۔

ڈپٹی کے آفس میں داخل ہوتے میری نظر اس قیدی پر پڑی جو دو پولیس وارڈنز کے درمیان نظریں جھکائے کھڑا اپنے پیروں کی جانب دیکھ رہا تھا۔ ڈپٹی نے اپنی کرسی پر بیٹھتے مقامی بولی میں دونوں سے کچھ کہا، وہ سلیوٹ کرتے باہر چلے گئے۔ اب میں اور امتیاز بلوچ آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کا جائزہ لے رہے تھے۔ ڈبلا پتلا چالیس سے اوپر کا امتیاز بلوچ جس کے چہرے پر جیل کی زندگی کے آثار نمایاں دکھائی دے رہے تھے، بڑی دھیمی آواز میں بولا، جناب آپ کی غریب پروری کا تاحیات احسان مند رہوں گا۔ آپ میری ٹرنڈش پر لاہور سے بلوچستان اس قیامت کے موسم میں تعریف لائے ہیں، میرے پاس کوئی الفاظ نہیں جو میں آپ کی نذر کروں۔ میں نے ڈپٹی صاحب سے اسے بیٹھ جانے کی اجازت دینے کی استدعا کی، انہوں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ شکریہ کہتے کارپٹ پر آلتی پالتی مارتے میرے سامنے بیٹھ گیا۔

”کب سے میری کہانیاں یعنی حقیقت کہانیاں پڑھ رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

جی باقاعدگی سے تو نہیں دو چار بار ہی پڑھی ہیں۔ ملاقاتی حضرات اپنے عزیزوں کی ملاقات کے دوران اخبارات، رسائل بھی جاتے ہوئے چھوڑ جاتے ہیں جو پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔ آپ کی تحریر کردہ حقیقت کہانیاں پڑھنے کے بعد میں نے اپنے ساتھ ہونیوالی ناانصافی بارے اپنی آواز اعلیٰ حکام تک پہنچانے کا فیصلہ کیا اور آپ کو خط لکھا تھا۔ اس نے پُر امید نظروں سے میری جانب دیکھتے بتایا۔

دوسری طرف سے شاید امتیاز بلوچ تک میری پہلو ہائے کو یقینی بنا دیا گیا تھا کیونکہ انہوں نے ڈپٹی صاحب کو عمر قید پانے والے قیدی امتیاز بلوچ کو سیل سے اپنے آفس بلا کر بٹھانے کو کہا تھا۔ چائے میں بڑا اہتمام کیا گیا تھا۔ ”سر ہمارے پنجاب کی جیلوں میں تو خاصی گہما گہمی ہوتی ہے مگر یہاں ماحول خاصا پرسکون دکھائی دے رہا ہے۔“

”راہی صاحب، دراصل یہاں کی جیلوں میں قیدیوں کی تعداد پنجاب کی جیلوں سے قدرے کم ہوتی ہے۔ جیسا کہ میری اس جیل میں تقریباً نو سو سے ہزار گیارہ سو تک مختلف قیدی ہیں۔ ہماری جیلوں میں قیدیوں کے ساتھ خاصا بہتر سلوک کیا جاتا ہے۔ یہاں بہت سی سہولتیں فراہم ہوتی ہیں قیدیوں کو، بلوچستان حکومت قیدیوں کو بہتر آگاہی فراہم کرنے میں کوئی کسر نہیں رہتی، مثلاً جیل کے اندر تعلیم کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر اور دینی تعلیم کی طرف بھرپور توجہ دی جاتی ہے۔ قیدیوں کی تعداد کم ہونے کی بنا پر کھانا بھی معیاری اور قیدیوں کی اصلاح کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ خاص کر چھ جیل کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں غفار خان، اچکزئی و دیگر نامی گرامی سیاستدان جن میں اکبر بٹھی بھی شامل ہیں اپنی اپنی قید کاٹ چکے ہیں۔“ اور بھی کئی معاملات پر گفتگو جاری رہی کہ اتنے میں ڈپٹی صاحب نے آکر بتایا کہ امتیاز بلوچ ان کے آفس میں آچکا ہے۔

”ٹھیک ہے آپ ان کو لے جائیں اور ان کی ملاقات اپنی موجودگی میں کروادیں۔“ اس کے ساتھ سکندر خٹاب نے انہیں مجھے ساتھ لے جانے کا اشارہ کیا، میں ان کا شکریہ ادا کرتے ڈپٹی صاحب کے ہمراہ آفس سے باہر نکل آیا۔ ڈپٹی کا آفس کا کڑ صاحب کے آفس سے ڈراماٹک تھا۔

جون کا مہینہ اور پھر چاروں جانب سنگناخ



کردی۔ پاکستان سے الیکٹرکس کا سامان جس میں ٹیپ ریکارڈر اور ایسا ہی چھوٹا موٹا سامان جو ہمارے لوگ لے کر جاتے تھے وہ میں نے بھی تھوڑا سا ساتھ رکھ لیا اور وقت مقررہ پر ریلوے اسٹیشن آگیا۔ زیادہ تلاش نہ کرنا پڑا ہمارا زبانی قافلہ ایک فرسٹ کلاس کے ڈبہ میں سفر فرما رہا تھا جس میں سات خواتین اور میرے سمیت اٹھارہ مرد تھے۔

تمام زائرین کیلئے جوس، بسکٹ، منرل واٹر اور ایسی ہی خشک اشیائے خورد و نوش کا بندوبست تھا، گیس کے سلنڈر اور برتن، مصالحہ جات، دالیں، چاول، آلو پیاز وغیرہ طالب اور حنیف نامی لڑکوں کے کنٹرول میں تھا جو ٹرین کے ڈبہ میں ہی کھانا بنانے کے ماہر تھے۔ میرے سوا تمام زائرین ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ ایک دو شاہوں کے بعد میں بھی ان میں سے دو چار کا واقف بن چکا تھا۔ اعجاز نقوی واقعہ کر بلا کی تفصیلات بہت ایمان افروز انداز میں پیش کرتے تھے۔ میرا مسلک سنی تھا مگر میں نے ان پر یہ بات سرے سے ثابت ہی نہیں ہونے دی تھی۔

کوئٹہ پہنچ کر رات پلیٹ فارم پر بسری اور دوسرے روز تفتان کیلئے ٹرین میں سوار ہو گئے۔ رات کو بازار جا کر نقوی صاحب نے کھانے پینے کے سامان کے علاوہ فروٹ بھی وافر مقدار میں خرید لیا تھا۔ اگلا سفر خاصا خوشگوار ثابت ہوا، ٹرین میں صرف زائرین تھے یا ایسے مسافر جو راستے میں آنے والے چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر اتر چھ رہے تھے۔

دوپہر کا کھانا ٹرین میں ہی کھایا۔ تقریباً چار بجے گاڑی تفتان بارڈر پہنچ کر رُک گئی، نقوی صاحب نے مجھے سب کے پاسپورٹ دیتے لسٹ بنانے کا کہا۔ میں نے ترتیب وار لسٹ بنا کر پاسپورٹ امیگریشن کے سپرد کر دیئے۔ رش اتنا بھی زیادہ نہیں تھا کہ دھکم پیل کا سلسلہ چل لگا۔ اس دوران میں

”ہاں تو شروع کریں.....؟“ میں نے اپنے آگے رکھے پانی کے گلاس کو ایک طرف کرتے اسے متوجہ کیا۔ ”میری بد قسمتی کا آغاز اس وقت ہوا جب نیوکمس ہائی سکول کے ٹیچر بشارت علی چوہان صاحب سے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ یہاں میں عرض کرتا چلوں کہ ہم بلوچوں کی آبادی شہر کے وسط میں ایک ہی جگہ آباد تھی، ہمارے قبیلہ کے مرد و خواتین مل کر کام دھندا کرتے آرہے ہیں۔ یہ سلسلہ ہماری کئی پشتوں سے چلا آ رہا ہے۔ میرے رشتہ دار مرد عورتیں زیارتوں کی آڑ میں ایران سے واپسی پر بہت سارا مال اپنے ساتھ لے آتے اور خوب منافع کما تے۔ میرا ارادہ بھی یہی تھا، جو مجھے چوہان صاحب کے گھر لے گیا۔ بشارت علی چوہان کا مکمل خاندان اہل تشیع تھا۔ اور وہ ضلع بھر کی تنظیم کے عہدیدار بھی تھے۔ ان کے جاری کردہ سفارشی لیٹر پر ایران کا ویزہ آسانی سے لگ جاتا تھا، سو ایک دو بار چکر لگانے پر چوہان صاحب نے سفارشی خط دے دیا جو چوکی امام بارگاہ کی تنظیم کے نام تھا۔ میں چوکی اسٹیشن کے کواٹروں میں جعفری صاحب سے ملا۔ انہوں نے خط پڑھ کر میرا پاسپورٹ اور شناختی کارڈ آٹھ تصویریں اور پانچ سو روپے لے کر رکھ لئے اور میرا رابطہ نمبر لکھ کر ویزہ لگ جانے کی اطلاع دینے کا وعدہ کر کے مجھے اجازت دے دی۔ تقریباً پانچ روز بعد مجھے فون آیا کہ تمہیں ٹھوکر نیاز بیک ونگ جسے سید اعجاز حسین شاہ نقوی کمان کریں گے، کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہے۔ میں نے دھڑکتے دل سے اس نمبر پر فون کیا۔ دوسری طرف سے بولنے والے خود اعجاز نقوی تھے، بڑی محبت سے پیش آئے اور مجھے ایک ہفتہ بعد آنے کا وقت بتایا۔ آنے جانے کا خرچہ مع کھانا پینا رہائش ساڑھے آٹھ ہزار روپے فی کس بتا کر انھوں نے فون بند کر دیا۔ میں نے ایران جانے کی تیاری شروع



بکٹ فیکٹری کی جانب سے تھی۔ ہمارا گروپ وطنانہ بکٹ بنانے والی کمپنی کا مہمان تھا۔ بس میں ہمارے سوا میرا دادا سے بھی زائرین تھے۔ تقریباً پچاس لوگوں کو لے کر بس اپنے اگلے سفر پر روانہ ہو چکی تھی۔ بس میں پانی اور تھوہ کا بہترین اہتمام تھا اور پونے دو گھنٹے کی مسافت کے بعد بس ایک خوبصورت مسجد کے دکان میں آڑی۔ مختلف اقسام کے کپے پکائے تیار کھانے ڈبوں میں بند تھے۔ وہ ایرانی روٹیوں کے ہمراہ تمام لوگوں میں تقسیم کر دیئے گئے۔ بند ڈبوں میں مٹن، چکن سبزیاں اور مقامی سالن تھا۔ بھوک برائے نام تھی مگر کھانے کا لطف آیا۔ جہاں بھی ہماری بس رکتی مقامی لوگ بس کو گھیر لیتے اور کھانے پینے کی چیزوں کے ڈھیر لگا دیتے۔ تمام رات طیار (بس) محو سفر تھی، صبح فجر سے قبل تہران شہر میں داخل ہوئی سامنے امام خمینی کا روضہ بقعہ نور کی مثال نظر آیا، بس روکنے کے اطراف آدھا چکر کاٹنے ایک بڑی شاہراہ کی جانب مڑ گئی۔ کافی سڑکیں بدلتے ایک وسیع میدان نظر آیا جو زائرین سے اُٹا پڑا تھا۔ ہماری بس کا منتظم ہمیں ایک جگہ اکٹھا رہنے کی تلقین کر رہا تھا۔ وہ ایک پاکستانی تھا اور ایران میں تعلیم کے حصول کیلئے رہ رہا تھا۔ اس کا نام احمد تھا۔ دوران سفر اس نے تمام زائرین کی لسٹ مرتب کر لی تھی اور باقاعدہ نام بول کر تعداد پوری کر رہا تھا۔ سب لوگ جو بس میں سے نکل کر ایک طرف کھڑے ہو چکے تھے، ان کو مخاطب کرتے اس نے بتایا کہ یہ بس پندرہ روز تک ان کے استعمال میں رہے گی اور رہائش وطنانہ بکٹ فیکٹری میں ہو گی اور سب کے پاس یہ کارڈ رہے گا۔ اگر کوئی بھول ہو جائے تو کارڈ کو دکھانے پر آپ اپنی رہائش پر پہنچ جائیں گے۔ ایسی ہی کئی ضروری باتوں کے بعد ہم سب میں کارڈ تقسیم کیے گئے اور ساتھ ہی کھل بھی اور

تھوڑے فاصلے پر بنے چھپروں کے بازار کی طرف چل پڑا چاروں جانب دوکانوں پر طرح طرح کا ایرانی سامان اور کھانے پینے کی اشیاء موجود تھیں۔ ایک ہوٹل پر تازہ کباب اور تھوہ پیا اور گھوم پھر کر واپس اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ ابھی تک بارڈر کراس کرنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ ہمارے گروپ کے لوگ اسٹیشن پر بنے لوہے کے شیڈ کی چھاؤں میں بیٹھے ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف تھے، میں بھی ان کے پاس آ بیٹھا۔ تھوڑی دیر بعد سب کے پاسپورٹ مکمل ہو کر مل گئے ہم بھی دوسرے لوگوں کی طرح ٹرین میں آ بیٹھے۔ آخر کار ٹرین ریکیتی ہوئی ایران کی حدود میں داخل ہو گئی۔ یہاں بھی امیگریشن کا معاملہ درپیش تھا۔ میرا ایک جس میں برائے نام الیکٹرانکس کا سامان تھا، وہ میں نے لا پرواہی سے سب کے سامان میں گھسوا رکھا تھا اور بے فکر ہو کر ایران کی سرحد میں ادھر ادھر سالوں پر چکر کاٹنے میں مصروف تھا۔ ہمارے گروپ میں جتنے بھی لوگ تھے وہ کئی کئی بار ایران آ چکے تھے اس لئے انہیں ساری اونچ نیچ کا پتہ تھا۔ اعجاز نقوی صاحب امیگریشن سے نپٹ کر ہمارے درمیان آڑ کے اور سب کو اگلے سفر کے بارے میں سمجھانے لگے۔ طالب، نوشاہہ کے بیٹے ٹین پیک سب کو ہانٹ رہا تھا۔ پینے والے مشروب کو ایران میں نوشاہہ کہا جاتا تھا۔ چینگ مکمل ہونے پر ٹرین زاهدان کی جانب روانہ ہو گئی۔ راستے میں ایک دو بار تھوڑی دیر کیلئے گاڑی رکی اور آخر کار زاهدان کے پر رونق اسٹیشن پر انجن خاموش ہو گیا۔ زائرین کی آمد پر ایران کی فلاحی و اسلامی تنظیمیں ہاتھوں ہاتھ زیارتوں پر آئے لوگوں کو سنبھال رہی تھیں۔ آرام دہ بسوں کی لائنوں میں اپنی تنظیموں کے نشان آویزاں تھے اور وہ لوگ اپنے اپنے گروپ آپس میں تقسیم کر رہے تھے ہمیں جو بس تہران کیلئے ملی۔ وہ وطنانہ

سے کاؤنٹر پر موجود ایرانی دوکان مالک کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں اردو مکمل اعتماد سے بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ میں نے اپنا مدعا بیان کیا تو وہ جھٹ خریداری پر آمادہ ہو گیا۔ واپس پہنچ کر میں نے اپنے سامان سے وہ دو چار چیزیں نکالیں جو اس امید پر ساتھ لایا تھا کہ کام آئیں گی، پھر انھیں بیگ میں ڈالتے اس سٹور پر آگیا۔ سٹور مالک نے ان کی اچھی طرح جانچ پڑتال کی اور اپنا ریٹ لگایا جو خاصا بہتر تھا۔ میں نے فروخت کرنے کی رضامندی ظاہر کر دی اور اس نے سامان سنبھالتے رقم گن کر میرے ہاتھ میں دے دی، چائے وغیرہ کے دوران میں نے اس سے سوال کیا کہ ادھر سے کیا لے کر جاؤں جو خرچہ نکل آئے، کچھ دیر وہ سوچتا رہا پھر مجھ سے مخاطب ہوا، ہماری سامان میں تو قالین برتن اور چمڑے کا سامان ہی لوگ لے کر جاتے ہیں مگر میرے خیال میں اگر تم پرندے لے کر جاؤ تو خاصی آمدنی ہوگی۔ کونے پرندے؟ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں۔ کیری برڈ چھوٹی سی خوشنارنگوں والی چڑیا ہے جو یہاں سے پاکستانی چار پانچ روپے میں مل جاتی ہے۔ پاکستان میں شوقین لوگ یعنی پرندوں سے محبت کرنے والے پانچ ہزار تک میں خرید لیتے ہیں۔ میں نے پرندوں کی کئی ایک دوکانوں سے اس بارے میں تحقیق کی تو پتہ چلا کہ وہ سٹور مالک صحیح کہہ رہا تھا۔ ایک معقول دوکان دار سے میں نے اظہار کیا کہ میں واپسی پر یہ سوئگ برڈ لے کر جانا چاہتا ہوں مگر تعداد تک لے جانے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ اس نے میری نیت بھانپتے میرے دل کی بات بول دی۔ بہت سارے طریقے ہیں جیسے پاکستان سے گرین جیٹ یہاں لائے جاتے ہیں، شارک جسے پاکستان میں لالی کہتے ہیں یہاں مینا کے طور پر ہماری قیمت میں فروخت کی جاتی ہے۔ پاکستان سے طوطا اور لالی دو

چھوٹے چھوٹے قالین بھی، جو شاید ہمارے بستر تھے پھر دوبارہ ہمارا قافلہ بس میں سوار ہو کر وطن چل پڑا۔ یہ بہت بڑی فیکٹری تھی جس کے کئی ایک پورشن تھے، ہمیں ایک بہت بڑے ہال میں شفٹ کر دیا گیا۔ مقامی میزبان جن میں خواتین اور اسکاؤٹ لڑکے شامل تھے ہمیں ہر طرح کی سہولت فراہم کر رہے تھے۔ جوس اور آئسکریم سے ہماری خاطر تواضع کی گئی پھر ناشتہ جو خالص ایرانی انداز کا تھا..... چاول، ٹماٹر اور سبجی کباب فروٹ دی وغیرہ پر مشتمل ناشتہ خوب سیر ہو کر کیا۔ بعد ازاں ہمارے میزبان مالکان آگئے۔ بڑی محبت سے پیش آئے اور ہمارا ہر طرح کا خیال رکھنے کی یقین دہانی کرواتے ہمیں آرام کرنے کا کہہ کر چلے گئے۔ تمام رات کے تھکے ہوئے تھے سب لوگ سو گئے۔ ایرانی خواتین جو تعداد میں سات تھیں کرسیوں پر بیٹھی ہمارے کسی بھی حکم کی منتظر تھیں۔ دو بجے کے بعد بڑا بڑا ٹکف کھانا پیش کیا گیا۔ اس دوران نوشاہ، آئسکریم، کلفیاں، قہوہ، جوس کے پیکٹ، خشک میوہ جات بھی رکھے جا رہے تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر سب کو پہلی زیارت کا کہتے نقوی صاحب نے نیچے بس میں چلنے کا اعلان کیا۔ یوں ہم سب تیار ہو کر بس میں سوار ہونے کیلئے نیچے آگئے پھر مقدس زیارات کا آغاز ہو گیا۔ سورج غروب ہونے سے پیشتر واپسی ہوئی، فیکٹری پہنچ کر تھوڑی دیر آرام کیا اور دوسرے لوگوں کی طرح طالب، زرگر، حنیف ڈرائیور اور میں بد نصیب ایران کی جھگمگاتی شاہراہوں، دوکانوں اور دوسرے مقامات کی طرف مڑ گشت کرنے چل پڑے۔ وہ دونوں خرید و فروخت میں مصروف تھے جبکہ میں اپنے ساتھ لایا تھوڑا سا الیکٹرانک سامان ٹھکانے لگانے کی فکر میں تھا۔ ایک سٹور دکھائی دیا جس میں الیکٹرانک سامان بھی سجا ہوا تھا۔ میں چپکے

شائع ہو گیا ہے

سیارہ ڈائجسٹ کے لازوال اسلامی نمبروں میں ایک اور اضافہ



قیمت: 175 روپے

✽ ان تمام واقعات کا جدید علم و تحقیق کی روشنی میں تفصیلی ذکر جو اللہ تعالیٰ

نے اپنے آخری نبی اور اس کی امت کو بتانا ضروری سمجھے

✽ انبیائے کرام کی مقدس اور پاکیزہ زندگیوں سے وابستہ واقعات

✽ قصے ان قوموں کے جن پر انبیائے کرام کی نافرمانی، اللہ تعالیٰ کے

احکامات سے روگردانی اور سرکشی کے باعث عذاب الہی نازل ہوا

عمدہ ترتیب، دلچسپ انداز بیاں اور پرکشش رنگین ٹائٹل

500 صفحات پر مشتمل یہ عظیم الشان نمبر جلد پیش کیا جائے گا

سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ ریوازا گارڈن لاہور۔ فون: 245412 37



والوں میں اچھی قیمت سے بک گئے اور چڑیاں ٹولٹن مارکیٹ میں ہاتھوں ہاتھ اچھے خاصے داموں سے بک گئیں۔ اس کے بعد ایرانی یا قوت سوہا بازار میں سات سو روپے فی کس کے حساب سے نکل گئے۔ مجموعی طور پر اس پھیرے کا مجھے پونے دو لاکھ بیچ گیا۔

اتنی آسانی سے اور ایک ہی پھیرے سے اتنے پیسے بیچ جائیں گے اس کا مجھے اندازہ ہی نہیں تھا۔

گھر والوں کو راضی کر کے میں کوئٹہ کیلئے دوبارہ روانہ ہو گیا۔ میں نے ایک بار میں ایران آنے جانے کا آسان راستہ تلاش کر لیا تھا۔ تفتان کے مقامی لوگ کھلے عام ادھر ادھر آتے جاتے اور میں نے بھی یہی طریقہ استعمال کرنے کا سوچا تھا۔ جس ہوٹل پر میں نے واقفیت بنائی تھی اس پر آکر میں نے کھانے کا آرڈر دیا اور باتوں باتوں میں ایران جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس نے ایک مقامی ڈرائیور فرمان علی سے میرا تعارف کروایا اور دو ہزار روپے کے عوض اس نے تہران لے جانے کی حامی بھری، وہ ایران سے لوہا بھر کر پاکستان لاتا تھا۔ رات کے پچھلے پہر اس نے مجھے اپنے ٹرک پر بٹھا لیا، دو آدمی اور بھی تھے۔ باڈر پر ٹک کر وہ چوکی کے اندر گیا پھر باہر آکر انجن سٹارٹ کرتے کراسنگ عبور کر لی۔ صبح فجر کے بعد اس نے مجھے اور ایک دوسرے آدمی کو، جس کا نام روشن تھا، ایک سڑک کے کنارے اتارا اور جاتے ہوئے اپنا نمبر لکھوایا۔ جب واپسی جانا ہو مجھے فون کر لیتا اور ہاں کرایہ مال دیکھ کر ہوگا۔

روشن کو تمام راستوں کا علم تھا اس نے خالی گزرتی ٹیکسی کو اشارہ کیا اور بھاؤ تاؤ کر کے روضہ مبارک امام رضا عالی مقام چلنے کا کہا۔ میں روضہ مبارک پر حاضری دے کر دربار شریف سے باہر آکر پیدل ہی ادھر ادھر گھومتا مارکیٹ پہنچ گیا۔ جس بڑے مینسٹر سے میں نے چڑیاں اور کچھوے خریدے تھے اس کا مالک

سورپے جوڑا کے حساب سے یہاں لایا جاتا ہے مگر یہاں ہزاروں میں فروخت ہوتا ہے۔ اسی طرح یہاں سے سوگ بڑ، اگن، چکور اور ایسے ہی کئی ایک پرندے اور ایرانی بلیاں سگل ہو کر جاتی ہیں۔ جب تنہا رہی واپسی ہو تو میرے پاس آنا، میں تمہیں ایک بیچ بنا دوں گا اور آسانی سے لے جانے کی ترکیب بھی بتا دوں گا۔ میں زیارتوں سے فارغ ہو کر مارکیٹ نکل جاتا اور گھوم پھر کر معلومات حاصل کرتا رہتا کہ کوئی چیز جو میں ادھر سے لے کر جاؤں گا تو آمدنی ہوگی۔ واپسی سے ایک روز قبل میں اس دوکان والے کے پاس جس کا نام احمد حسن تھا، پرندوں کی مارکیٹ میں پہنچ گیا۔ جس نے ایک چھوٹے سے پنجرے میں 30 کے قریب چھوٹی چھوٹی چڑیاں اور 10 عدد اگن ڈال دیئے۔ ایک چھوٹے سے ڈبے میں پچاس کے قریب کا کروچ سے ذرا بڑے رنگین کچھوے ڈال کر اس نے ڈبے میں پانی اور خوراک بھردی جو پانچ روز تک کیلئے کافی تھی۔ اسی طرح پنجرے میں چڑیوں کیلئے خوراک اور پانی ڈال دیا ان سب پرندوں اور کچھوؤں کا تقریباً بیس ہزار بنا، جو میں نے ادا کر دیا۔ اس کے علاوہ میں نے ایرانی یا قوت فی عدد ایک سو روپے کے حساب سے خریدے جو تعداد میں دوسو تھے، بانی ایک قالین کچھ ایسی ہی چھوٹی چھوٹی چیزیں تھیں۔ واپسی ٹرین پر ہی تھی کچھوؤں کا ڈبہ میں نے بیک میں اس طرح رکھا کہ زیپ سے ہوا جاتی رہے۔ چڑیوں کا بنجرہ میں نے سیٹ کے نیچے رکھ دیا اور آگے اپنا بیگ۔ پانی کے کولر عام تھے، ہر زائر کے پاس دو سے تین کولر بھرے پانی کے تھے۔ گاڑی میں واپسی کے سفر میں کسی بھی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑا اور میں خیریت سے واپس گھر آیا۔ کوئی پرندہ اور کچھوے راستے میں کم نہ ہوا، کچھوے تو رنگین فش فروخت کرنے

والے کے ساتھ جانے کی بات کی تو اس نے حامی بھر لی کہ بھیج دے گا۔ خیریت سے واپس تفتان پہنچ کر میں بے فکر تھا کیونکہ اپنے ملک میں تھا اور میرے پاس جو کچھ تھا وہ سہل شدہ ہونے کے باوجود دیکھنے والے کو میرا شوق ہی نظر آتا۔ ٹرک ڈرائیور اور دوسرے دو لوگ بہت اچھے انسان تھے۔ نمازی پر ہیزگار، جہاں وہ رکتے مجھے اپنے ساتھ کھانے پینے میں بطور مہمان شامل کرتے۔ بغیر کسی پریشانی کے میں اپنے مال کے ہمراہ کراچی پہنچ گیا۔ ان لوگوں کا شکریہ ادا کرتے میں اپنا سامان سنبھالتا ٹرک سے نیچے اتر آیا، خالی گزرتی ٹیکسی رکوا کر صدر کا بتایا اور چنجرہ، ڈبہ، ٹوکری پچھلی سیٹ پر رکھتے ڈرائیور کے ہمراہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مختلف سڑکوں کے پتھر کاٹتے ٹیکسی والا بند روڈ کے آخر پر واقع پرندوں کی بڑی مارکیٹ کے آگے آڑکا۔ احمد حسن کی بتائی دوکان تلاش کرنے میں دقت پیش نہ آئی۔ ملازم نے بتایا کہ سیٹھ صاحب گھنٹہ بھر بعد آئیں گے، آپ انتظار کر لیں۔ میرے پاس چنجرہ وغیرہ دیکھتے اس نے پوچھا، ”ایرانی مال ہے؟“ میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔ زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا، ایک دراز قد سندھی دوکان میں داخل ہوا۔ ملازم نے سلام کرتے میرا بتایا۔ وہ مجھے لے کر پیچھے کی طرف آگیا۔ میں نے احمد حسن کے بارے میں بتایا تو وہ ہنس کر بولا ”اس کے تمام کسٹمر میرے پاس ہی آتے ہیں، انشاء اللہ مارکیٹ سے اچھا دام ملے گا۔“ پھر اس نے کئیری ایگن، بلیاں ننھے منے کچھوے دیکھے اور بولا، ”بالکل برابر ہے۔“ پھر کیکلو لیٹر پر اس کا حساب بنانے میں مصروف ہو گیا۔ اتنے میں ملازم ناشتہ رکھ کر واپس چلا گیا۔ خرید سے بھی ذیل منافع اس نے لگایا تھا اور ساتھ میں یہ بھی شرط بیان کر دی کہ پوری مارکیٹ میں مال چیک کروالو ایک روپیہ

مجھے دیکھ کر خندہ پیشانی سے پیش آیا اور مجھے اندر بنے اپنے آفس میں لے آیا۔ قبوہ مجھور سے میری خاطر مدارت کی اور کاروباری امور پر تبادلہ خیال کرنے لگا۔ اس نے کراچی کے ایک دو دکانداروں کے بارے میں مجھے بتایا جو جانوروں اور پرندوں کے بہت بڑے تاجر تھے۔ اور اپنا کارڈ بھی دیا کہ اس بار تم مال ان کے پاس لے کر جانا، اچھے دام ملیں گے۔ دو چار روز تک میں ایران میں رُکا رہا پھر احمد حسن کے پاس آیا اور واپسی کے ارادے کا اظہار کیا کیونکہ میں نے ڈرائیور فرمان علی سے رابطہ کر کے واپسی کا بندوبست کر لیا تھا۔ جس نے رات مجھے ٹرک ٹرینل پہنچ جانے کا کہا تھا۔ حسب سابق احمد حسن نے مجھے اس بار بہت عمدہ کئیری چڑیاں، اگن اور کچھوے دوگنی تعداد میں دیئے اور دو ایرانی بلیوں کے بچے بھی ٹوکری میں ڈال دیئے۔ اس بار میرا بل اتنی ہزار پاکستانی کرنسی میں بنا۔ مختصر سامان بنا جو میں اٹھا کر ہوٹل آگیا۔ رات مقررہ وقت سے قبل میں نے ہوٹل چھوڑ دیا اور ٹرک ٹرینل پہنچ گیا، فرمان علی سے رابطہ ہو گیا۔ جس نے مجھے فردوسی گڈز پر پہنچنے کا کہا فردوسی گڈز قریب ہی تھا۔ ایک دو بار گزرتے راگبیروں سے پوچھتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ فرمان علی میرے ہاتھ میں چھوٹی سی ٹوکری اور چنجرہ، ڈبہ دیکھ کر بولا بس یہی سامان ہے؟ ہاں فرمان بھائی، اس نے چنجرے کا کپڑا ہٹا کر چڑیوں کو دیکھا پھر کچھوے، اگن اور بلیوں کا جائزہ لیا۔ پانچ ہزار، پھر خود ہی چار ہزار روپے پر بات پکی کر لی۔ اس بار مجھے اوپر ٹول بکس میں میرے سامان سمیت ”ایڈجسٹ“ کر دیا۔ نیچے فرمان علی کے ہمراہ ایک اور مقامی آدمی تھا، رات کو سفر شروع ہو گیا۔ راستے میں ایک ہوٹل پر رُکتے کھانا کھانے کے درمیان ڈرائیور فرمان علی سے میں نے کراچی تک کسی ٹرک

تیس ہزار میں دے دوں گے تمہیں۔ میں نے اس کی بات پر سر ہلاتے کالے پتھر جس کی قیمت اس نے چالیس لاکھ لکھ رکھی تھی کی بات پوچھا، تو اس نے بتایا کہ پتھر کینسر کے علاج میں کام آتا ہے اور بڑا نایاب ہے اس وزن تک جاتے اس کی عمر پچاس سال سے بھی اوپر ہو جاتی ہے۔ ”آپ کے پاس ہے؟“ میں نے سوال کیا۔ ”جی، جیسی تو باہر بورڈ لگا رکھا ہے۔“ ”ہمارے پنجاب میں تو ایسے پتھر عام ہوتے ہیں۔“

”پتھر تو عام ہوتے ہوئے مگر اس وزن کا اتنا نہیں ہو سکتا، بڑی محنت اور تلاش کے بعد شکاری اس کو پکڑ پائے ہیں۔“

”کیا میں دیکھ سکتا ہوں آپ کا پتھر، ہو سکتا ہے مجھے اپنے گاؤں سے ایسا کوئی پتھر مل جائے۔“

”میں دوکان بند کر کے گھر جاؤں گا تو میرے ساتھ چلنا۔“

میری بے چینی بڑھ رہی تھی اور وہ مجھے میکاؤ خریدنے پر آمادہ کرنے لگا ہوا تھا۔ جب اس نے دوکان بند کر دی تو مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر لالو کھیت کی طرف چل پڑا۔

گھر پہنچ کر اس نے گاڑی روکی اور مجھے لے کر ڈرائیونگ روم میں آگیا۔ چاروں جانب پرندوں کی تصویریں آویزاں تھیں جس میں وہ ان کے ساتھ موجود تھا۔ ملازم چائے اور دیگر لوازمات رکھ کر ایک جانب جا بیٹھا۔ میں بے چینی سے انتظار کر رہا تھا کہ پردہ ہلا اور وہ ایک خوبصورت جالی کا بکس تھا۔ اندر داخل ہوا۔ شیشے کی میز پر رکھتے میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے گھروں میں رہنے والی چڑیا کے برابر گہرا سیاہ پتھر اس جالی کے بکس میں رکھے چھوٹے چھوٹے پتھروں کے اوپر ادھر ادھر رنگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میرے جسم میں سرد دلہر دوڑ گئی۔ ”اس سے پہلے کبھی دیکھا ہے ایسا پتھر؟“ میں

زیادہ طے میں ڈبل دوں گا اور ہاں مال کی پانچ ہزار روپے محکمہ شکاریات اہلکاروں کی کٹوتی جائے گی۔ میں نے سر ہلاتے ہاں کر دی۔ اس نے ملازم کو آواز دے کر میرا لایا مال اس کے سپرد کر دیا، جس نے فوراً وہ سارا مال الگ الگ بڑے پتھروں میں منتقل کر دیا اور کھجوروں کا ڈبہ جس کی میں بڑی حفاظت کرتا آیا تھا، اسے بھی ایک بڑے جار میں منتقل کر لیا۔ پانچ ہزار کاٹ کر اس نے رقم میرے سپرد کرتے ایک چھوٹے سے قریبی ہوٹل میں میری رہائش کا بندوبست کر دیا۔ کمرے میں جاتے ہی میں بے سندھ ہو کر بستر پر دراز ہو گیا۔ پتہ نہیں کب تنگ سوتا رہا خود ہی میری آنکھ کھلی تھی۔ نہا کر کپڑے بدلے اور لاک لگا کر ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ یونہی گھومتا ہوا ایئرپورٹس مارکیٹ نکل آیا، یہاں بھی پرندوں کی بہت بڑی مارکیٹ تھی۔ ایک دوکان کے باہر فلیکس آویزاں تھی جس پر کالے پتھر کی تصویر تھی اور اس کا وزن ایک سو دس گرام درج تھا اور قیمت چالیس لاکھ۔ میں نے بار بار پڑھا اور دوکان کے اندر داخل ہو گیا۔ دوکان کے اندر پتھروں میں ہر نسل کے بڑے چھوٹے طوطے موجود تھے، کسی کی قیمت لاکھوں میں تھی۔ میں نے سفید میکاؤ کا ریٹ پوچھا گھریلو جوڑے کا ساٹھ ہزار اور جنگلی کا پچیس ہزار تھا۔ میں نے دوکان دار کو اپنے بارے میں بتایا تو اس نے بڑی محبت سے مجھے بٹھاتے ملازم کو چائے لانے کا اشارہ کیا، اس نے ایک میکاؤ جس کی ٹانگ میں سسٹل کی ہلکی سی زنجیر پڑی ہوئی تھی کو اپنے کندھے پر بٹھاتے کرسی چھوڑ دی۔ میں نے اسے اپنے پاس موجود مال کی بابت بتایا، اس نے دینے کا ریٹ پوچھا اور نہ ہی میں نے بتایا اور بات آگے چل پڑی۔ اس نے مشورہ دیا کہ دو جوڑی جنگلی میکاؤ کی جاتے پنجاب سے لیتے جانا خرچہ نکل آئے گا۔ میں تمہیں لینے والے کا ایڈریس بتا دوں گا۔ دو جوڑی



# سیارہ ڈائجسٹ

## پیشکش

کی حسب روایت ایک نئی اچھوتی اور یادگار

شائع ہو گیا ہے

# توبہ نمبر

قیمت: 160 روپے

توبہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے دروازے کھولتی ہے

قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں توبہ کی برکات آداب اور فضائل پر کیا کچھ

کہا گیا ہے؟

انبیائے کرامؑ، صحابہ کرامؓ، اولیائے کرامؒ اور صالحین کی توبہ نے قدرت

خداوندی کے کیسے کیسے مظاہر دکھائے۔

ایمان افروز اور نور ایمان کے حیرت انگیز واقعات سے بھرپور یہ دستاویز آپ

کے ذاتی ذخیرہ کتب میں ایک انمول اضافہ ہوگا اور آپ کے دوستوں کیلئے

شاندار اور یادگار تحفہ بھی

سیارہ ڈائجسٹ: 240 میں مارکیٹ ریو از گارڈن لاہور۔ فون: 7245412

نام لطیف تھا کو اشارہ کر کے پوچھتا وہ انگوٹھا اور انگلی ہلا کر اوکے کی رپورٹ دے دیتا۔

بڑی ذمہ داری سے اس نے وہ دونوں ڈبے اسٹیشن کی غمارت سے باہر لا کر میرے سپرد کئے اور میں نے مزید دو سو روپے اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ وہ شکریہ کہتے پھر خدمت کرنے کا کہہ کر پلیٹ فارم کی طرف بڑھ گیا۔ میں ڈبے سنبھالتا نیکی کے انتظار میں آکھڑا ہوا، جلد نیکی مل گئی۔ میں گھر کا بتا کر بے فکر ہو گیا۔ دوسرے روز مارکیٹ میں گیا اور ایک ”پیٹر شاپ“ والے کو دو جوڑے میکاؤ فروخت کرنے کی بات کی، وہ فوراً میرے ساتھ چلنے کیلئے تیار ہو گیا۔ میں اسے موٹر سائیکل پر بٹھا کر گھر لے آیا۔ اس نے تیس ہزار سے بات شروع کی اور پینتیس ہزار روپے میں سودا طے ہو گیا۔ قیمت ادا کر کے اس نے دونوں ٹوکریاں اٹھائیں اور میرے گھر سے باہر نکل گیا۔ میرے لئے بشارت چوہان کی مہربانی رنگ لائی اور میں تھوڑے عرصہ میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔

اب مجھے بچھو کی تلاش تھی جس کیلئے میں نے بہت سے پرندے پکڑنے والوں سے رابطہ کیا۔ پہلی بار معلوم ہوا کہ جانوروں، پرندوں کے علاوہ جنات بھی برائے فروخت تھے مگر بچھوؤں کے شکاری سامنے نہ آئے۔ اس دوران میں ایران کے دو چکر اور لگا بیٹھا تھا اور میں نے پرندے امپورٹ ایکسپورٹ کرنے کا لائسنس بھی حاصل کر لیا تھا اور پاکستان سے باہر جانے والے پرندوں اور جانوروں جس میں چگاڈر، کتے، سانپ وغیرہ نیکس ادا کر کے ایران لے جاسکتا تھا مگر میرا ذہن کالے سوگرام وزن کے بچھو میں اٹکا ہوا تھا۔

ایک روز میں داتا صاحب حاضری دیکر پیدل ہی یادگار پاکستان کی طرف جا رہا تھا کہ لیڈی وکٹیشن ہسپتال کی کنڈ پر ایک نیم حکیم کو مختلف قسم کے کیڑے مکوڑوں، سانپ، بچھو، سانپے کا تیل فروخت

نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”37 لاکھ اس کے لگ بھگ ہیں، بس آج کل میں جانے والا ہے۔ حیدر آباد کی پارٹی ہے جو ایسے بچھو ملک سے باہر منگل کرتی ہے، یہ کروڑوں کا دھندہ ہے۔“ اس نے بتاتے وہ بس اپنے ملازم کے سپرد کر دیا اور خود چائے بنانے لگا۔ پھر میکاؤ طوطے کے بارے میں مجھے بتانے لگا۔ کچھ دیر بعد مجھے وہ اپنی گاڑی میں بٹھا کر اپنی رہائش سے باہر لایا اور خالی گزرتے رکشہ میں مجھے چلتا کرتے واپس پلٹ گیا۔ میرے ذہن میں کالا بچھورینگ رہا تھا۔ میں نے دوسرے روز اللہ وسایا کے پاس جا کر اس بات کا تذکرہ کیا جو میری لائی کیمیری چڑیاں الگ الگ پنجروں میں جوڑا جوڑا کر کے دوکان کے باہر لگے ڈسپلے میں لٹکا رہا تھا۔ جب اس کام سے فارغ ہوا تو اس نے وہ سب کچھ بیچ پرہنی بتایا اور کالے بچھو کی بابت کھوج لگانے کی بھی بات کی اور جنگلی میکاؤ دس ہزار میں جوڑا دینے کا کہا۔ میں نے جھٹ دو جوڑے کی بات پکی کر لی۔

میکاؤ لیکر جانے کی کوئی پابندی نہیں تھی البتہ اکٹھے چار عدد پر محکمہ ریلوے کو اعتراض تھا مگر میری یہ مشکل ایک قلی نے حل کر وا دی۔ ڈاننگ کار کے ایک ہیرے نے دو ہزار میں صبح سلامت آخری منزل تک پہنچانے کا سودا کر لیا۔ اللہ وسایا نے چاروں میکاؤ جوڑا جوڑا کر کے مضبوط ٹوکریوں میں بکٹی اور بچنے کے دانوں سمیت پیک کر دیے اور گتے کے خالی ڈبوں کے اندر ٹوکریاں رکھ دیں۔ ٹوکریوں کے اندر پانی کیلئے لوہے کے ڈبے باندھے ہوئے تھے۔ مقررہ وقت پر قلی نے وہ دونوں گتے کے ڈبے بمعہ دو ہزار، ہیرے کے سپرد کرتے اسے پانی کا خیال رکھنے کی تاکید کی۔ اس نے جواباً کہا کہ ”یہ کوئی نئی بات ہے آپ بے فکر ہو جاؤ۔“ میرا ٹکٹ فرسٹ کلاس کا تھا جہاں بھی ٹرین رکتی اس ہیرے جس کا

کرتے دیکھا۔ جس نے سائڈے، سانپ، بچھو زندہ ہی عوام کے یقین کیلئے سب کے سامنے رکھ چھوڑے تھے۔ میری نظر مٹی کے برتن میں ریختے سیاہ بچھوں پر پڑی جو جسامت میں عام بچھوں سے ذرا بڑے تھے۔ میں اس انتظار میں تھا کہ وہ اپنا کام پورا کرے اور میں اس سے سوال جواب کروں۔ اس نیم حکیم کا نام رانا وارث تھا۔ جب وہ فارغ ہو گیا تو میں نے اپنا تعارف کروایا اور اس کے پاس جو بچھو تھے ان کے بارے میں دریافت کیا کہ یہ وہ کہاں سے لایا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ پہاڑی بچھو ہیں جو سوات میں ان شکاریوں سے مل جاتے ہیں جو جانور وغیرہ پکڑ کر انہیں فروخت کرتے ہیں۔ میں نے دوسرا سوال کیا کہ اس سے بڑے سائز کے بھی ہوتے ہیں ان کے پاس؟ جس پر وہ فٹ پاتھیا قدرے مسکرایا اور بولا جناب جس بچھو کے بارے میں آپ پوچھ رہے ہو وہ ہمارے ہی علاقہ میں پایا جاتا ہے جس کے زہر سے بڑی بڑی کمپنیاں ادویات وغیرہ بناتی ہیں خاص کر کینسر کی ادویات۔ یہ بچھو اگر کسی کو ڈنک مار بھی دے تو پیلے بھونڈ جتنا اثر ہے۔ وارث سے مجھے بچھوں کے بارے میں خاصی معلومات ملیں۔ اسی طرح کام کرتے کرتے میں پرندوں جانوروں کا ماہر ہو گیا۔ اب میں دوہی کیلئے باز، شاہین، شکرے، بجر، لکڑ کی خرید و فروخت کا کام بھی کرنے لگا تھا۔ یہ کام بھی لاکھوں کا تھا جو چوری چھپے ہی کیا جاتا تھا کیونکہ محکمہ وائلڈ لائف اس پر کڑی نظر رکھتا تھا۔

ایک روز گجرات سے مجھے سرور کا فون آیا، یہ بھی میری طرح جانور پرندے وغیرہ لیتا دیتا تھا۔ اس نے بتایا کہ ادھر کسی کے پاس ایک ستراتی گرام کا سیاہ بچھو برائے فروخت ہے۔ کیونکہ میں نے سرور سے ایک دوبار شکرے لئے تھے اور اسے اپنے

علاقے کے بڑے بچھوں کی بابت کہا تھا۔ فون پر اس نے بتایا کہ یہ بچھو کسی زمیندار کے پاس تھا جو اس کی خاندانی پرانی حویلی کی دیوار سمار ہونے پر اسے ملا تھا، جسے اس نے قابو کر کے مٹی کی ہنڈیا میں ریت ڈال کر ہنڈیا میں چھوٹے چھوٹے سوراخ کر کے ہنڈیا کا ڈھکن لگا دیا تھا۔ ایک دو شکاری آئے تھے اسے دیکھنے اور تیس ہزار تک لگا گئے تھے مگر زمیندار فروخت کرنے کو تیار نہیں تھا۔ سرور کے فون کے بعد میں نے کراچی فون کر کے اللہ وسایا کو بتایا کہ مجھے ستر گرام کے ایک مقامی سیاہ بچھو کا پتہ چلا ہے جس کے مالک کو تیس ہزار لگے ہیں اس کے مکر وہ لاکھ سے اوپر مانگتا ہے۔ ادھر سے جواب اس نے کہا کہ اگر واقعی ستر گرام کا مقامی بچھو یعنی دیسی ہے تو پچاس ساٹھ ہزار کا خرید لو، یہاں یہ لاکھ سے اوپر جائیگا۔ میں فون رکھ کر گجرات جانے کی تیاری کرنے لگا۔

صبح گجرات کی بس میں سوار ہو کر تقریباً دو بجے سرور کے پاس پہنچ گیا۔ ہم دونوں موٹر سائیکل پر اس گاؤں کی طرف چل پڑے، جہاں کے زمیندار کے پاس بچھو تھا۔ وہ اپنی حویلی پر بیٹھ گیا، ہم نے اپنے آنے کا مقصد بتایا تو اس نے اپنے ملازم سے بچھو والی ہنڈیا منگوائی، میں چونکہ کراچی والا بچھو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اس لئے مجھے اس کا سائز اس سے ذرا چھوٹا لگا اور جسامت بھی کمزور تھی مگر تھا پھر تیرا۔ میں نے کراچی فون کر کے پھر رابطہ کیا اور اس کا سائز رنگ اور جسامت بتائی دوسری طرف سے وہی جواب ملا جو گھر سے چلتے وقت فون پر ملا تھا۔ میرے استفسار پر زمیندار نے وہی سوال لگا، کافی مغز کھائی کے بعد 55 ہزار روپے میں بات کی ہوگئی، ہم نے رقم دے کر بچھو خرید لیا۔ سرور موٹر سائیکل کے پیچھے ہنڈیا لے کر بیٹھ گیا اور شہر جانے کیلئے چل پڑا۔ رات سرور کے پاس گزاری،



بچھو دیکھا اور بولا ”مہران لیبارٹری والوں کو ضرورت ہے، تم نے دکھایا ہے انکو؟“

”نہیں ایک باہر کی پارٹی نے ایک پندرہ لگایا ہے۔“ اللہ وسایا نے افضل بھائی کی بات کا جواب دیا۔ ”میں فون کروں؟“ افضل بھائی نے اللہ وسایا سے پوچھا۔ ”ہاں کرلو اگر دام صحیح لگائیں تو۔“

”کوشش ہے آگے اللہ مالک۔“ افضل بھائی نے نمبر ڈال کر تے جواب دیا۔ پھر وہ دوسری جانب کسی خالد صاحب سے میرے بچھو کے بارے میں بات کرنے لگا۔ پھر فون بند کرتے ان کے آنے کا بتایا ان کا آفس بند روڈ پر تھا اور وہ دیکھنے آرہے تھے۔

چائے کے دوران خالد صاحب اور ان کے ہمراہ دو اور ساتھی تھے آگئے اور افضل بھائی نے میرے بچھو کو ہنڈیا سے نکال کر شیشے کے جار میں چھوڑ دیا جسے وہ چاروں جانب سے پرکھ رہے تھے پھر وہ افضل بھائی سے مخاطب ہوئے ”کیا ڈیمانڈ ہے؟“

”پانچ لاکھ۔“

”ارے نہیں چھو تے نمبر کا ہے۔“

”نہیں سینہ تیرے نمبر پر آرہا ہے۔“ افضل بھائی نے کاروباری پلٹا مارا۔ ”اور ابھی تک پورا ہے۔“ اس نے دراز سے شیشہ نکال کر خالد صاحب کے ہاتھ میں دیتے گاڑی دی۔ خالد صاحب نے جاگہا کر بچھو کی ڈم کو قریب کر کے دیکھا اور شیشہ واپس دیتے جھٹ دو لاکھ کی آواز لگائی تو اللہ وسایا کوڈ پڑا۔ ”سینھ وہ جو آپ نے تین لاکھ میں لیا تھا اس سے کہیں نیچے تھا اور دو بار اس کو خالی بھی کیا ہوا تھا مگر اس کی تھیلی سیل بند ہے۔“

سوادو لاکھ کہہ کر وہ اٹھ گئے۔ میں پریشانی میں الجھا ہوا تھا کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے مگر دونوں نے انہیں نہیں روکا۔ میں دل ہی دل میں خوش تھا کہ میرے لائے بچھو کی قیمت بڑھ رہی تھی۔ ایک دو جگہ

دوسرے روز واپس جانے کیلئے چل پڑا۔ ہنڈیا ہینڈ باسکٹ میں رکھی اور وین میں سوار ہو گیا۔ گھر آکر میں نے اللہ وسایا کو بتایا کہ میں نے بچھو 75 ہزار میں خرید لیا ہے اور ایک آدھ دن میں لے کر آ رہا ہوں، اس کو فروخت کرنے کا بندوبست کرو۔ جواب اس نے کہا کہ ”کراچی میں ریسرچ سنٹر اور کئی ایک ادویات کی فیکٹریاں ہیں ان سے رابطہ کرتا ہوں، میرا کمیشن 10 فیصد ہو گا۔“ اللہ وسایا نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ میں رات کی ٹرین سے کراچی کی طرف چل پڑا۔ دوسرے دن تقریباً دوپہر تک کراچی پہنچ گیا۔

اسٹیشن سے سیدھا اللہ وسایا کے پاس پہنچا۔ اس نے بچھو کا بغور جائزہ لیا اور سر ہلاتے اس کی کوالٹی کی تائید کر دی پھر اس نے فون پر کسی سے بات کی اور آنے کا کہا۔ دن ڈھلنے سے قبل وہ لوگ آئے اور میرے بچھو کو بغور دیکھنے کے بعد ایک لاکھ دس ہزار قیمت لگائی مگر اللہ وسایا نے انکار کر دیا۔ جاتے جاتے ایک لاکھ پندرہ ہزار کہتے وہ اپنی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ میں نے اللہ وسایا سے مشورہ مانگا کہ کیوں نہ امپیریس مارکیٹ والے کو بھی دکھایا جائے، اس نے کہا چلو چلتے ہیں۔ ہم دونوں پیدل ہی بچھو والی ٹوکری اٹھا کر امپیریس مارکیٹ کی طرف چل پڑے۔ یہاں افضل بھائی کے علاوہ اور بھی لوگ کام کرتے ہیں مگر افضل بھائی چھوٹا موٹا کام نہیں کرتے ان کا رابطہ چاروں صوبوں میں شکاریوں سے ہے اس لئے ان کے پاس بچھو آتے رہتے ہیں۔ ہم باتیں کرتے افضل بھائی کی دوکان پر پہنچ گئے۔ وہ فلیکس ابھی تک ان کی دوکان پر آویزاں تھی۔ وہ بڑی محبت سے ملے، اللہ وسایا سے مارکیٹ کے بارے میں گفتگو کرتے مجھ سے مخاطب ہوئے ”سناؤ کوئی دانہ ہاتھ لگا، میں نے ٹوکری سے ہنڈیا نکال کر اس کے آگے رکھ دی۔ اس نے ڈھکن ہٹا کر میرا لایا

والا تھا۔ مطمئن ہو کر میں امین خان کا باہر سے لایا ناشتہ کرنے میں مصروف ہو گیا پھر ہم دونوں تیار ہو کر بس اسٹینڈ پر آئے اور قلات جانے کیلئے سوار ہو گئے۔

پچھو والی نوکری جس میں بچی ہنڈیا میں میرا دو لاکھ کا فائدہ ریگ رہا تھا اسے احتیاط سے سیٹ کے نیچے رکھا اور باہر کے مناظر میں گم ہو گیا۔ قلات پہنچ کر رکشہ لیا اور فیکٹری کی کاتیتاے ہم بیٹھ گئے۔ فیکٹری آبادی سے کافی باہر تھی خاصا رقبہ تھا فیکٹری کا۔ زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا اور ہمیں فیکٹری منیجر نے اندر بلوایا۔ جتنی دیر خاطر مدارات میں مصروف رہے اسی دوران فیکٹری کے ڈائریکٹر اور لیبارٹری انچارج آ گئے۔

مجھے پچھو دکھانے کا کہا، میں نے امین خان کی طرف دیکھا جس نے فوراً نوکری میں سے ہنڈیا نکالی اور میز پر رکھے اس کا ڈھکن اٹھایا، پچھو دھکن کی اندونی سطح پر چٹا ہوا تھا دھکن اٹھتے ہی وہ امین خان کی گویا آن گرا، اس سے پہلے کہ وہ سنبھلا پچھو اپنا کام کر گیا۔ شاید وہ اس کا پہلا ڈنک تھا جو لگتے ہی امین خان کا کام تمام کر گیا۔ فیکٹری میں موجود ڈاکٹر اور لیبارٹری انچارج نے بڑی کوشش کی امین خان کو بچانے کی مگر وہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ پچھو کو دوبارہ ہنڈیا میں ڈال کر فیکٹری مالکان نے مقامی پولیس کو خبر کر دی اور مجھے میرے پچھو سمیت گرفتار کر لیا گیا۔ مجھ پر مقدمہ چلا اور مجھے خطرناک پچھو رکھنے کے جرم میں عمر قید کی سزا ہو گئی حالانکہ میرے پاس پرندوں جانوروں کی خرید و فروخت کا لائسنس تھا مگر کوئی حربہ بھی کام نہ آسکا۔ میں نے امین خان پر پچھو جان بوجھ کر تو نہیں پھینکا تھا، وہ تو اس کی بے احتیاطی اور اس کی تقدیر تھی۔ ورنہ میں بھی تو کوئی دنوں سے خوفناک موت کو دن رات ساتھ لئے پھرتا آ رہا تھا۔ آپ تک یہ رسائی شاید میرے کچھ کام آ سکے۔“

یہ سب بتا کر امتیاز بلوچ خاموش ہو گیا۔

پر انہوں نے فون کئے ایک طرف سے جو بات ہوئی وہ قلات میں قائم ایسے ہی ادارے کے مالک کی تھی جو اس وزن اور سائز کے پونے تین لاکھ دینے کو تیار تھا۔ دونوں نے مجھے قلات جا کر پچھو فروخت کرنے کا مشورہ دیا تو میں نے ان کی کمیشن کی بابت پوچھا۔ انہوں نے کہا جو آدمی تمہیں اسٹیشن پر لینے آئے گا وہی سب کچھ کرے گا تم فرسٹ کلاس ویننگ روم میں چلے جانا، امین خان تمہیں وہیں بیٹھا ملے گا وہ باقی سب کام سنبھال لے گا۔ میں رات کو کونسل ایکسپریس میں فرسٹ کلاس کالٹ لے کر بیٹھ گیا تمام رات سفر جاری رہا دوسرے دن میں کونسل پہنچ گیا۔ بیک اور نوکری سنبھالے میں فرسٹ کلاس ویننگ روم میں آ گیا ابھر ابھر نظریں دوڑائیں تو ایک درمیانے قد کا مقامی آدمی میرے قریب آیا اور بولا ”امتیاز بلوچ؟“ میں نے بتایا ”ہاں“ مجھے افضل بھائی نے آپ کیلئے بھیجا ہے۔“ اس نے میرا بیک پکڑتے کہا ”ٹھیک ہے“ اور ہم دونوں باہر آ گئے۔

پچھو والی نوکری میرے ہاتھ میں تھی اس نے رکشہ رکوا کر طوفی روڈ چلنے کا کہا۔ گوشت مارکیٹ کے قریب رکشہ رکواتے اس نے کرایہ دیا اور مجھے ساتھ لیکر مارکیٹ کے عقب بستی کی طرف چل پڑا۔ زیادہ چلنا نہ پڑا وہ ایک درمیانے درجہ کا چھوٹا سا مکان تھا جو لوہے کی چادروں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا اس نے باہر لگا تالا کھولا اور اندر آنے کا کہا۔ ایک طرف دو کمرے اور دوسری طرف دLAN نما برآمدہ تھا جس میں خالی بنجرے اور پر نیچے رکھے تھے۔ بستر زمین پر ہی لگا ہوا تھا اس نے میرا بیک ایک طرف رکھتے بتایا کہ بچے گاؤں گئے ہوئے ہیں۔

وہ رات میں نے امین خان کے گھر گزاری وہ بھی پرندوں اور جانوروں کا کاروبار کرتا تھا۔ پاکستانی پرندے جانور ایران بھجواتا اور ادھر کے جانور پرندے ادھر سمگل کرتا تھا۔ صبح اٹھ کر میں نے اپنے پچھو کا خوراک پانی چیک کیا جو مجھے لاکھوں کا فائدہ پہنچانے





## ”چھت کا سایہ..... موت لایا“



تحریر: عارف محمود اہل

لاہور سمیت بڑے شہروں کے ہزاروں شہری ”موت کے گھروں“ میں رہتے ہیں اور انتظامیہ کو ان کی یاد صرف برسات کے موسم میں آتی ہے!

جوان بچیوں اور معصوم بچوں کو لے کر حکومت کے عاضی کیپوں میں مہاجروں کی طرح زندگی نہیں گزار سکتے۔ برسات کے موسم میں جہاں سیلابی ریلوں اور شدید بارشوں سے دیہات بہہ جاتے ہیں طوفانی موجیں مکینوں سمیت مکان نکل جاتی ہیں۔ وہاں

اندرون لاہور سینکڑوں خستہ حال مکانوں کے ہزاروں مکین کسی بھی وقت بڑے المیہ سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ مقامی انتظامیہ نے کبھی ایسے مکانوں کا سروے کیا ہے نہ ہی اس بارے ان مکینوں سے کوئی رائے لی۔ خستہ خال مکانوں کے رہائشیوں کا کہنا ہے کہ وہ



## 3 سال تک خراب نہ

## ہونے والا پیزا

پیزا کھانے کے شوقین افراد کے لئے خوشخبری ہے کہ امریکی ماہرین نے ایسا انوکھا پیزا تیار کر لیا ہے جو 3 سال تک خراب نہیں ہوگا۔ جی ہاں شکل و صورت اور ذائقے کے اعتبار سے تو یہ عام پیزے جیسا ہی ہوگا لیکن اس کی خراب ہونے کی میعاد 3 سال ہوگی۔ یہ پیزا فوجیوں کی ضرورتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے خاص طور پر تیار کیا گیا ہے کیوں کہ اکثر اوقات فوجی ایسی جگہوں پر تعینات ہوتے ہیں جہاں کھانا تیار کرنا یا کھانے کو ذخیرہ کرنا مشکل رہتا ہے۔

(مرسلہ: زیارانی۔ میانوالی)

## اکیلا پن موٹاپے سے زیادہ خطرناک

اکیلا پن موٹاپے سے زیادہ تباہ کن ہے، اس کے باعث مرنے کے خدشات دوگنا بڑھ جاتے ہیں۔ برطانوی سائنسدانوں نے 50 سال اور اس سے زیادہ عمر کے 2 ہزار افراد پر تحقیق سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اکیلا پن، موٹاپے سے کہیں زیادہ تباہ کن ہے اور تنہائی کی وجہ سے مرنے کے خدشات دوگنا بڑھ جاتے ہیں۔ برطانیہ میں کی گئی تحقیق کے مطابق ہر پانچواں شخص خود کو مسلسل تنہا محسوس کرتا ہے۔ سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ ان تباہ کن اثرات سے بچنے کے لئے خاندان کے ساتھ رہنے کو ترجیح دینی چاہئے۔

(مرسلہ: شازیہ عمران۔ لاہور)

کے لئے ہر قسم کی ہنگامی ادویات کا وافر ذخیرہ کیا جائے۔ ڈی سی اولہ لاہور نے بوسیدہ اور شکستہ عمارات خالی نہ کرنے والے لوگوں کو خبردار کیا ہے کہ وہ اس سلسلے میں ہٹ دھرمی یا بے جا ضد سے اجتناب کریں اور عقلمندی کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اپنی اولاد کی قیمتی زندگیوں کو خطرے میں ہرگز نہ ڈالیں۔

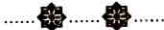
ایسے میں لاہور سمیت متعدد بڑے شہروں کے اندرونی علاقوں میں قدیم بوسیدہ عمارتیں جو عام حالات میں بھی خطرناک ثابت ہوتی ہیں برسات میں وہ ایک طرح سے موت کا پیغام بن جاتی ہیں۔ ہر سال اس موقع پر بوسیدہ مکانوں کی دیواریں اور چھتیں گرنے سے کئی گھرانوں کے پورے افراد خانہ لقمہ اجل بن جاتے ہیں جس کا بعد میں کوئی پرسان حال ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ بلدیہ کے ارباب اختیار بھی یہ کہہ کر اپنی گلو خلاصی کروانے کی کوشش کرتے ہیں کہ متعلقہ مکان کے مینٹیننس کو پہلے ہی خبردار کر دیا گیا تھا۔ مگر انہوں نے اس پر کوئی کان نہیں دھرا۔

اگر گزشتہ دو عشروں کے اخبارات اٹھا کر دیکھیں اور بوسیدہ مکانات گرنے کے واقعات اٹھا کر دیکھیں اور بوسیدہ مکانات گرنے کے واقعات جمع کئے جائیں تو ان کی تعداد ہزاروں سے تجاوز کر جاتی ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ ان افسوسناک واقعات کو وقوع پذیر ہونے کے بعد مقامی حکومت اور بلدیہ نے کیا حفاظتی تدابیر کیں۔

اس برس بھی شدید بارشوں کی پیش گوئیوں کے پیش نظر ڈی سی اولہ لاہور نے حکم دیا ہے کہ اندرون شہر کی ایسی تمام خستہ حال عمارتیں جو کسی بھی وقت زمین بوس ہو جاتی ہیں انہیں خالی کروا کر ان کے مینٹیننس کو متبادل اور محفوظ رہائش فراہم کی جائے۔ اخباری ذرائع کے مطابق انہوں نے یہ ہدایات تمام ٹی ایم اوز کو جاری کی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ شدید بارشوں یا متوقع سیلاب کے پیش نظر سکولوں اور سرکاری عمارتوں میں عارضی رہائش رکھنے والے کمینوں کے رہنے اور کھانے پینے کا بندوبست کیا جائے۔ انہوں نے محکمہ صحت کے افسران سے بھی کہا ہے کہ ابتدائی طبی امداد اور وبائی امراض سے بچاؤ

سے یہی شکایت ہے کہ انہوں نے امن کے زمانے میں کبھی ان خطرناک مکانات کا سروے کیا ہے اور نہ ہی اس بارے میں کوئی پالیسی بنائی ہے۔ جس کا نتیجہ ہر برسات میں موت کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ محکمہ موسمیات کی پیش گوئیوں کے مطابق چونکہ اس سال زیادہ بارشوں اور طوفان بادو باران کا اندیشہ ہے۔ اس لئے انہوں نے پہلے ہی متعلقہ اداروں کو خبردار کر دیا ہے کہ وہ اپنا اپنا بندوبست کر لیں مگر اس کے باوجود ابھی تک مقامی انتظامیہ نے سنجیدگی سے کسی عملی اقدام کا اعلان نہیں کیا جس کی وجہ سے ان ہزاروں مکانات میں مقیم لاکھوں افراد اور معصوم بچے کسی بھی لمحے موت کے منہ میں جا سکتے ہیں۔

فلاحی اور سماجی تنظیموں کا کہنا ہے کہ ان کی کمیٹیوں نے متعدد بار اس سلسلے میں مقامی انتظامیہ کو خطوط لکھے، یادداشتیں پیش کیں ان مکانات کا سروے کرنے کے لئے اعلیٰ افسران کو دعوت دی مگر اس کے باوجود ان اداروں کی طرف سے کوئی مثبت قدم نہیں اٹھایا گیا۔ مکینوں کا کہنا ہے کہ ان کے گھر میں چھوٹے بچوں کے علاوہ بزرگ، بیمار اور جوان بچیاں بھی ہیں ان کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ حکومت کی طرف سے فراہم کردہ عارضی سرکاری عمارتوں اور کیپوں میں مہاجرین کی طرح زندگی بسر کر سکیں۔ ان مکانات کے باسیوں کا کہنا ہے کہ وہ خود موت کے ان کھڑوں سے ہمیشہ کے لئے باہر نکلتا چاہتے ہیں مگر اس کے لئے انہیں حکومت کی طرف سے مستقل طور پر موجودہ خستہ مکانات کی جگہ متبادل جگہیں فراہم کی جائیں جہاں وہ عزت کے ساتھ محفوظ طریقے سے زندگی گزار سکیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حکومت خصوصاً مقامی انتظامیہ کب اور کس انداز سے ان کے مسائل حل کرتی ہے۔



مقامی انتظامیہ کی طرف سے اس طرح کی ہدایات برسات کے دنوں میں عین اس وقت جاری کی جاتی ہیں جب طوفانی بارشیں شروع ہو چکی ہوتی ہیں۔ دریا بھر چکے ہوتے ہیں اور تباہی کی صورتحال سر پر ہوتی ہے جس کا صاف مقصد یہ ہے کہ مقامی انتظامیہ ڈنگ ٹپاؤ پالیسی پر یقین رکھتی ہے اور ایسے حفاظتی انتظامات کا اعلان صرف عذر سے بچنے کے لئے کیا جاتا ہے۔

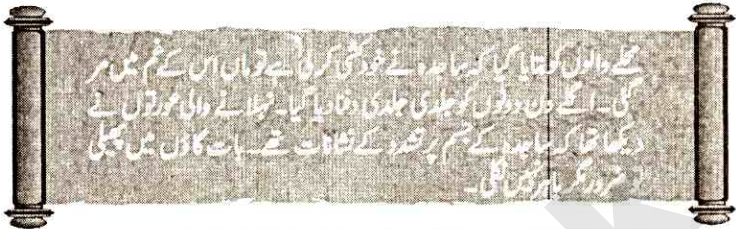
ایک سروے کے مطابق اس وقت اندرون شہر خصوصاً لوہاری، شاہ عالمی، بھائی ٹیکسالی، موری اور خصوصاً! موچی گیٹ کے اندر ایسی خستہ حال خطرناک عمارات کی تعداد ہزاروں سے تجاوز کر چکی ہے۔ ان دو تین مرلہ پر بنی تین چار منزلہ عمارات میں بھی بیک وقت کئی کئی خاندان اپنے معصوم بچوں کی بڑی تعداد کے ساتھ رہائش پذیر ہیں۔ ایسے مکان بھی ہیں جن کی چھتیں یوں لگتا ہے کہ بس گریں کہ گریں اور اکثر ایسے مکانات کی چھتوں اور چوباروں کے نیچے بڑے بڑے بانسوں اور ہتھیروں کی سپورٹ دی گئی ہے۔ جس طرح لیننر ڈالنے کیلئے سپورٹ دی جاتی ہے۔ ان بوسیدہ مکانات کی چھتوں کو بھی اسی طرح ہی لکڑی کے عارضی ستونوں کا سہارا دیا گیا ہے۔ اس حالت میں اگر خدا خواستہ تیز طوفان بادو باران آجائے تیز آنچلی اور بارش ہو تو یہ مکان پتنگ کی طرح ڈولنے لگتے ہیں۔ ایسے ڈیڑھ ہزار مکانات کا سروے کیا گیا ہے نہ ہی ایسے مکانات کے مکینوں کو کبھی بلوا کر ان کے مسائل پوچھے گئے ہیں کہ وہ کیونکر موت کے گھروں میں رہتے ہیں۔ اس قسم کے کام ان حالات میں ہونے چاہئیں جب برسات کا موسم نہ ہو مگر ہمارے ہاں اس وقت بھاگ بھاگ ہوتی ہے اور دوڑیں لگتی ہیں جب طوفان اور سیلاب دروازے پر دستک دینے لگتا ہے۔

اہل لاہور کو مقامی انتظامیہ کے ذمہ دار افسران



# کاش یہ ممکن ہوتا

آسان تھ کنول



ایک لڑکی کی کہانی، وہ لا چاری ختم کر کے اپنے پیروں پر کھڑی ہونا چاہتی تھی

اور انہیں ہمیشہ تک یاد رکھنے کے وعدے کرتے ہیں مگر وقت کا پہیہ اس تیزی سے گھومتا اور انسانوں کو چکر دیتا ہے کہ حال، ماضی کو پیچھے چھوڑنے اور مستقبل کو پکڑنے میں بھاگا چلا جاتا ہے اور جب حالات کی سمجھ آنے لگتی ہے کچھ بن کر باہر نکلتے ہیں اپنا اور اپنے

اوائل عمری کے دن بھی کیا دن ہوتے ہیں، بے فکری ایسی کے کسی چیز کی کوئی فکر نہیں ہوتی اور سوچنے لگیں تو سوچتے چلے جائیں۔ یہ سوچ بھی ہوتی ہے کہ یہ دن اتنی جلدی کیوں گزر جاتے ہیں۔ اس عمر میں لڑکے لڑکیاں کھیلتے کودتے، پڑھتے لکھتے دوست بناتے





بیماری کے نشان باقی تھے۔ وہ جانتی تھی کہ شاید ان داغوں کی وجہ سے کوئی اس سے شادی نہیں کرے گا۔ اپنی جگہ پر اس کا سوچنا بھی درست ہی تھا۔ جس سماج میں ذرا ذرا سی بات پر دنگے ہوتے ہوں کیڑے نکالے جاتے ہوں وہاں ایک داغ دار چہرے والی کا کیا مستقبل ہے۔ اماں فاطمہ کی حویلی ہمارے گھر کے صکیٹ کے سامنے تھی۔ ہم اسے آتے جاتے دیکھتے، چھت پر چڑھ جاتے تو وہ گوبر میں کھڑی ہوتی، اُپلے تھا پتی دیواریں بھرتی رہتی۔ ایک بار میں نے اُس سے پوچھا، ”اماں فاطمہ اتنی محنت کس کے لیے کرتی ہو۔“ وہ بولی، ”بچوں کے لیے۔“ ”بچوں کے لیے یا صرف ساجدہ کے لیے؟“ اس کی آنکھیں نمبر آئیں۔ اُس نے اپنی کبڑی کمر کو بمشکل اٹھایا۔ مجھے غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے ہمتا ڈھکھکھا، ناقابل بیان اذیت تھی۔ پسینے سے بھرے سفید بالوں کو اس نے اپنی بوڑھی انگلیوں سے پیچھے کیا اور پھر کہنے لگی۔ ”بیٹا تم جانتی تو ہو ساجدہ نے میٹرک کر لیا ہے۔ باپ بھائی تو سارا دن کھیتوں میں ہی گزار دیتے ہیں۔ لڑکی تو صرف میری ذمہ داری ہے۔“

”ساجدہ آگے پڑھنے کی ضد کر رہی ہے اماں فاطمہ، تو میرے پاس بھیجتا۔“ اچھا بیٹا! آپ لوگ تو بڑھے لکھے ہوا اچھا مشورہ ہی دو گے۔“ میں گھر کے اندر آ گئی تو وہ پھر اپنے نہ ختم ہونے والے کاموں میں لگ گئی۔ اسی شام ساجدہ آ گئی۔ گوری چٹی بھوری آنکھوں اور سیاہ بالوں والی لڑکی، خوبصورت ناک نقشہ مناسب قد و قامت۔ اگر گردن پر بیماری کے نشان نہ ہوتے تو وہ ایک خوبصورت سی مغرور لڑکی ہوتی۔ مگر اب چاند کو گرہن لگا ہوا تھا۔ ”بابی صاعقہ آپ نے بلایا تھا؟“ ”ہاں آؤ بیٹھو۔“ میں نے گھر میں کام کرنے والے لڑکے رحیم کو بلایا۔ ”پانی لاؤ اور بی بی کے لیے چائے بھی بناؤ۔“

اطراف کا جائزہ لیتے ہیں تو پلوں کے نیچے سے ڈھیروں پانی گزر چکا ہوتا ہے اور ہم انسان زندگی کے بکھیروں میں اُلٹھے اپنے تانے بانے پھٹتے اور درست کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ زندگی کب کی کو پیچھے مڑ کر دیکھتے رہنے کی مہلت دیتی ہے یہ تو بس بھگائے جاتی ہے۔ اس منزل کی اور جو بھی ہاتھ نہیں آتی بس ایک نشان کی مانند جو دور اچھلتے پانیوں پر کسی ڈوٹی کشتی کا دھبہ سا تو لگتا ہے حقیقت بھی نہیں بنتا۔

میں اور مجھ جیسے کروڑوں لوگ یہی کچھ تو کرنے میں لگے ہیں بلکہ یہی کچھ ہی کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی ماضی کی طرف مڑ کر دیکھتے ہیں تو یادوں کی راکھ کریدتے کریدتے کئی سلسلی ہوئی دکھی یادیں آنکھوں میں آنسو بن کر تیرنے لگتی ہیں۔ ایک دن دوپٹی کے حسین ساحل پر چہل قدمی کر رہی تھی۔ پتہ نہیں کیسے بیس سال پیچھے چھلانگ ماری تو ایک سسکتا ہوا چہرہ آنکھوں میں ٹھونسنے لگا۔ یہ ہمارے گاؤں کی اماں فاطمہ تھی سارا بچپن اسے پو پوئی دیکھا تھا۔ گوری چٹی خوبصورت نقش و نگار والی مگر دراز قامتی کے باعث بڑھا پے نے اسے کبڑا کر دیا تھا۔ ہمارے گھر کے سامنے زمین کا کافی بڑا ٹکڑا خالی پڑا تھا۔ یہ زمین اماں فاطمہ کی تھی جس پر وہ اپنی بھینسیں باندھتی تھی۔ اس کے بیٹے اور شوہر زمیندارہ کرتے تھے۔ خود وہ سارا دن بھینسیوں کی دیکھ بھال کرتی۔ انہیں چارہ ڈالتی، دودھ دھوتی، حویلی کی صفائی سہرائی، گو برا کٹھا کرتا، اُپلے تھاپتا، بس سارا دن وہ انہی کاموں میں مصروف رہتی۔ خدا نے اسے ایک بیٹی بھی عطا کر رکھی تھی جس کو وہ بڑے چاؤ سے گاؤں کے سکول میں پڑھا رہی تھی۔ اُس کی بیٹی بھی خوبصورت تھی مگر ایک بد قسمتی بھی ہو گئی۔ اماں فاطمہ کی بیٹی ساجدہ اچانک بیمار ہو گئی۔ اس کے گلے پر زخم سے بن گئے تھے۔ بہت عرصہ لگا اُسے ٹھیک ہونے میں۔ ساجدہ ٹھیک تو ہو گئی تھی مگر

سن کے بے حد خوشی ہوئی۔ میں نے دُعا کی کہ اللہ اسے خوش رکھے۔ کچھ ہی عرصے کے بعد میرے شوہر کو دوسری کی ایک کمپنی میں بڑی اچھی ملازمت مل گئی۔ فلیٹ بھی مل گیا تو انہوں نے مجھے اور بچوں کو دوسری بلا لیا۔ انہی مصروفیات میں دو سال گزر گئے۔ پھر میرے شوہر نے دو ماہ کی چھٹیاں لیں کہ گھر والوں سے مل آئیں۔ میں نے لاہور میں کچھ وقت گزارا تو فوراً گاؤں جانے کی خواہش ہوئی۔ امی کو بتا دیا کہ آرہی ہوں۔ گاؤں والے بے حد خوش تھے اتنی مدت کے بعد گھر گئی تھی۔ گاؤں پہنچ کر محلے والوں کے حالات پوچھے ہمسایوں سے ملاقات ہوئی۔ اچانک ہی مجھے اماں فاطمہ یاد آگئی۔ گھر والوں سے پوچھا کہ وہ کیسی ہیں تو جواب امی نے ایک بھیا تک خبر مجھے سنائی کہ فاطمہ اور ساجدہ دونوں وفات پا چکی ہیں۔ میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ حیرت نے گنگ کر دیا۔ کتنے ہی سوال زبان پر پھلنے لگے۔ کب، کیوں، کیسے، کہاں..... امی نے بتایا کہ جب میں دوسری گئی تھی تب تک وہ بالکل ٹھیک تھیں۔ ساجدہ اپنی نرسنگ میں مصروف تھی۔ پھر اچانک ایک دن علم ہوا کہ ساجدہ اپنے گھر آئی ہے اور باپ بھائیوں کے ساتھ شدید قسم کی لڑائی ہوئی تھی۔ مدعا یہ تھا کہ ساجدہ کو کسی ڈاکٹر نے پسند کر لیا تھا اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ ساجدہ کو اور کیا چاہتا تھا اس نے یہ معاملہ باپ بھائیوں کے سامنے رکھا تو وہ صاف مکر گئے کہ لڑکا ذات برادری کا نہیں ہم اس سے رشتہ نہیں جوڑ سکتے۔ کبڑی ماں نے بہت منت سماجت کی کہ پہلے تو کوئی رشتہ نہیں ملتا اب مل گیا ہے تو رو نہ کریں مگر اچانک دیہاتی پن کی جاہلانہ غیرت جاگ اُٹھی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ صرف نرسنگ کرنے گئی ہے۔ کام کرنے یا وہاں دل لگانے کی اسے کوئی اجازت نہ تھی۔ ”تم اب سے لاہور نہیں جاؤ گی۔“ باپ نے سختی سے پابندی لگا دی۔ ساجدہ بہت روئی، تڑپ، منتیں ترلے

”چنگا باجی جی!“ وہ ادب سے کہہ کر چلا گیا۔ ساجدہ سے کافی ساری ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے پوچھا۔ ”تم اب کیا کرنا چاہتی ہو؟“ ”باجی کچھ بننا چاہتی ہوں تاکہ کسی کی محتاج نہ رہوں میرے داغوں نے زندگی پر بادل کر رکھی ہے، سارے گمن ہونے کے باوجود بد صورت ہوں۔ لوگ دیکھنے آتے ہیں تو رد کر کے چلے جاتے ہیں، کب تک یہ سب سہوں اک عورت کی اس سے زیادہ تو ہین نہیں ہو سکتی کہ اسے رد کر دیا جائے، بغیر کسی وجہ کے۔“ ”یہ تو ہے“ میں افسردہ ہو گئی۔

”پھر کیا کرنا چاہتی ہو؟“ میں نے پوچھا۔ ”کبھی سوچتی ہوں کہ کالج میں داخلہ لے لوں، کبھی سوچتی ہوں کہ نرسنگ کورس شروع کر دوں، آپ بتائیں کیا کروں۔“

”ویسے میرا خیال ہے کہ نرسنگ کرلو، تم مصروف ہو جاؤ گی تو اپنے دکھ بھول جاؤ گی۔ اس طرح ہو سکتا ہے تمہارے گلے کے اس لٹکے ہوئے گوشت کا بھی کوئی علاج مل سکے اور اگر فرض کرو زندگی میں ساتھ دینے کے لیے کوئی نہ بھی مل سکے تو کم از کم تم اپنی زندگی سے مطمئن تو ہو جاؤ گی نا۔“

”جی باجی میں ایسا ہی کروں گی“ پھر وہ چلی گئی۔ چند دنوں کے بعد پتہ چلا کہ ساجدہ گنگرام ہسپتال میں نرسنگ کرنے چلی گئی ہے اسے داخلہ بھی مل گیا اور ہوسٹل میں جگہ بھی مل گئی۔ میں بھی شادی کروا کے پیادیں سدھا رہ گئی۔ وقت گزرنے لگا۔ گاؤں والدین سے ملنے تو جانا ہی ہوتا تھا۔ سامنے کی حویلی میں اماں فاطمہ بھی دیکھنے کو مل جاتی۔ چند ہی سالوں میں وہ بالکل کبڑی ہو گئی تھی آتے جاتے اس سے سلام دُعا ہو جاتی تھی۔ ساجدہ کا حال بھی پوچھ لیتی۔ اُس نے بتایا کہ اب اس نے ٹریننگ مکمل کر لی تھی۔ اسی ہسپتال میں ملازمت بھی کرنے لگی اور وہ خوش اور مطمئن تھی۔ مجھے



نہلانے والی عورتوں نے دیکھا تھا کہ ساجدہ کے جسم پر تشدد کے نشانات تھے۔ بات گاؤں میں پھیلی تو ضرور مگر باہر نہیں نکلی۔ ڈاکٹر صاحب کو ڈرا دھکا کر خاموش کر دیا گیا۔ پولیس تک بات جانے ہی نہیں دی گئی کہ کوئی کارروائی ہوتی۔

یہ دیدہ دلیری تو انہوں نے کر لی۔ غیرت کا بدلہ بھی لے لیا مگر اب اس گھر میں اُلو بولتے ہیں وحشت رقص کرتی ہے موت دبے پاؤں پھرتی ہے۔ دیواروں میں نوے بھرے ہیں آہیں اور کراہیں ہیں۔ لوگ حتیٰ کہ ہمسائے بھی ان کے گھر نہیں جاتے۔ اک عجیب سا سوتا پن ہے۔ ساجدہ کا باپ بوڑھا اور بیمار ہے، اسے کوئی پوچھنے والا نہیں دونوں بھائی سارا دن چھانی چوڑی کر کے گھومتے اور لوگوں پر دہشت بٹھاتے ہیں۔

امی نے ان کی ساری داستان مجھے سنائی تو مجھے بہت دکھ ہوا۔ میں اپنے غم کو سوائے ماں کے کسی سے بانٹ بھی نہیں سکتی۔ گفتگوں سوچتی رہتی ہوں کہ اتنے امتیازی رویے کیوں ہیں سینکڑوں داستانیں ایسی ہی ہمارے ارد گرد گھبرائی ہوئی ہیں۔ ہم انسان صرف ان کے بارے میں سوچتے ہیں بات کرتے ہیں پھر بھول جاتے ہیں۔ ہر بندہ منصف بنا پھرتا ہے۔ ہر شخص کے پاس بچ ہونے کے اعتبارات ہیں وہ خود وکیل، خود گواہ ہے اور بعض دفعہ تو جلا بھی خود ہی بن جاتا ہے کہ کبھی تیزاب سے، کبھی آگ سے، کبھی گولی سے، کبھی پانی سے، کبھی رسی سے کسی بھی طریقے سے چھری، چاقو، ٹوکے، کلہاڑی، جو ہتھیار میسر ہو، اُسی سے کمزور مخلوق کو نشانہ بناتا ہے۔ بے بس عورت کو جواپنا دفاع بھی نہیں کر سکتی۔ ساجدہ اللہ تمہاری مغفرت کرے۔ شاید اس ملک میں کبھی امتیازی قوانین ختم ہو سکیں کوئی ایسا قانون بنے جو عورتوں کو تحفظ دے سکے! کاش ایسا ممکن ہو سکے۔

کیے۔ اسے جانے کی اجازت مل گئی مگر کسی اور ہسپتال میں۔ یوں زندگی پھر سے چلنے لگی مگر اب زندگی ”ننگڑا“ کر چل رہی تھی۔ دکھ کے راستوں پر ٹھہرتے ہوئے چل رہی تھی۔ ساجدہ ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ مصروف رہنے کی کوشش کرنے لگی۔ ڈاکٹر سے رابطہ بے شک ختم ہو گیا تھا مگر دل سے تو وہ نہیں نکل سکا تھا۔ ساجدہ کو اپنی زندگی کا فیصلہ خود ہی کرنا تھا۔ وہ بالغ تھی بدسر روزگار تھی۔ زندگی اسے گزارنی تھی۔ اس نے ڈاکٹر خاور سے بات کی یوں دونوں نے کورٹ میرج کر لی۔ کچھ عرصہ تو یہ بات چھی رہی مگر کب تک چھی رہتی۔ بھائیوں کو پتہ چلا تو وہ کچھ عرصہ چپ رہے مگر اندر ہی اندر بچ و تاب کھاتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ کیا کریں، گاؤں میں بات پھیل گئی تو بے عزت ہو جائیں گے۔ پھر انہوں نے چال چلی، وہی ایک کمزور سی دھوکے بازی۔ اپنی بہن کو بلایا کہ تم شادی شدہ ہو گئی ہو اپنا حق لے جاؤ۔ بہن سب کچھ بھول کر پھر سے دھوکے میں آ گئی۔ وہ گھر آئی، باپ بھائیوں کے تیز بد لے دیکھے تو درگئی مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا کیا ہو سکتا تھا۔ اس نے ہر ممکن نکل بھاگنے کی کوشش کی مگر کوشش بے سود تھی۔ بھائیوں نے شدید تشدد کا نشانہ بنایا اور پھر رات کو بجلی کے جھٹکے دے کر اسے مار ڈالا۔ اتنی اذیت تو ساری زندگی نہ کسی تھی جتنی ایک رات میں سہہ لی۔ یہ کیا انجام تھا۔ یہ کیسی غیرت تھی یہ کیسی محبت اور انسانیت تھی۔ زندگی دینا کتنا مشکل تھا اور جان لینا کتنا آسان۔ یہ کیا قانون تھا کہ باپ بھائی خود انصاف دینے بیٹھ گئے کیا عورت اتنی بے وقعت چیز ہے۔ جو مرضی چاہے جیسے مرضی سلوک کرے۔ ساجدہ کا اتنا بھائی کا انجام دیکھ کر بوڑھی بیمار اور کبڑی ماں بھی وہیں مگر کہ اللہ کو پیاری ہو گئی۔ دوہری مصیبت تھی محلے والوں کو بتایا گیا کہ ساجدہ نے خودکشی کر لی ہے تو ماں اس کے غم میں مر گئی۔ اگلے دن دونوں کو جلدی جلدی دفنایا گیا۔



# میرا کشمیر..... میرا عشق

(وادی نلیم)



فرخ صابری

دنیا کی تمام بڑی اور زندہ زبانوں کی طرح..... اُردو زبان میں بھی تمام اصنافِ سخن و نثر کے علاوہ سفر نامے بھی لکھے گئے۔ ابنِ انشا، بیگم اختر ریاض الدین اور مستنصر حسین تارڑ جیسے سفر نگاروں کی اس صف میں اب فرخ صابری بھی آ شامل ہوئی ہیں۔

فرخ صابری اپنے اچھوتے موضوعات اور منفرد طرزِ اسلوب کی وجہ سے بین الاقوامی سطح پر پذیرائی پا چکی ہیں۔ افسانہ نویسی، ناول نگاری، کالم نگاری، تذکرہ نویسی اور تحقیق و تنقید میں اپنا ایک مقام اور پہچان رکھنے والی یہ لکھاری مذکورہ بالا تمام اصناف کا دلکش مرقع ”میرا کشمیر..... میرا عشق“ لے کر آئی ہیں۔ جس میں افسانوی ماحول، ناولوں والی منظر کشی، کالم کا سلیجاز و اختصار، تہذیب و تاریخ کا تحقیق مطالعہ اور سب سے بڑھ کر یادوں کے دلخراش تذکرے ”ہنگ رنگ“ دکھاتے ہیں۔

اس سفر نامے میں فرخ کا اسلوب، جذب و مستی میں ڈوبا ”اللہ اکبر“ کا کوئی نعرہ مستانہ سا ہے۔ اُس پر بھرپور تاثراتی ٹکڑوں کی پیوند کاری، وسیع ذخیرۃ الفاظ کا بر محل و برجستہ استعمال، کمال کا مشاہداتی انداز اور پھر متعلقہ علاقوں پر اٹھائے گئے وہ نثر سوال اس سفر نامے کو منفرد مقام پر لے جاتے ہیں۔ اس تحریر کی نمایاں خوبی شعری و نثری ٹکڑوں کا جابجا استعمال ہے۔ ساتھیوں کی چھپر چھاڑ اور منظر کشی میں انوکھی جزئیات طرازی ایسی خوبیاں ہیں جو محض فرخ کے قلم کی فُصول کا ری ہی ہو سکتی ہے۔

ادب، تاریخ اور تہذیب میں رہے اس سرشار سفر نامے کو پڑھ کر، کشمیر جنتِ نظیر جانے کا لطف ہی کچھ ”اور“ ہے۔ دراصل کشمیر مصنفہ کا ایسا موضوع ہے جس پر وہ انہی صفحات پر ناول ”آوارگی“ (قط وار) افسانے ”بڈھا“ اور ”شاہکار“ کے علاوہ ایک ادبی و تحقیقی مقالہ ”کشمیری افسانہ نگاروں کے ہاں کشمیر کی زندگی“ پیش کر چکی ہیں (اس مقالے کو عالمی سطح پر پذیرائی ملی تھی)۔

اور اب..... فرخ صابری کا ”سیارہ ڈائجسٹ“ کے قارئین کے لیے ”جنت“ سے لایا ہوا اک توشہ خاص ”میرا کشمیر..... میرا عشق!“، پیشِ خدمت ہے!

باب ایک:  
غالب کی مگس..... اور ”بلو دیے کار“ سے خالہ جی کے گھر تک۔

”کنیں کنیں جاناں بلو دے کر؟“ یہ سوالیہ فرمائش نامہ سب کے سامنے تھا۔ یہ غالباً مارچ 2014ء کی ”بہار کا شاخسانہ“ تھا کہ شاف ٹرپ کا نعرہ بلند ہوا اور ہوتے ہوتے ہماری پرنسپل کے گوش گزار ہوا۔ اور وہ کہ سدا سے ٹرپ، منظروں اور نئے نئے اچھوتے خیالوں کی خوگر۔

سونورا تمام ممبران کی فہرست منگوائی اور ہمیں اس نادر شاہی حکم نامے کے ساتھ بھجوا دی گئی کہ ”ہنزہ وادی“ کو جانے کے خواہش مند اپنے دست مبارک سے اپنے خواہش نامے پر دستخط کر دیں تاکہ جون کے وسط

میں جب کوچ کا نقارہ بجے تو کوئی بھگڑا نہ سکے۔  
دراصل گئے برسوں کے کئی گزشتہ مہینوں میں کتنے ہی پُر جوش پروگرام بنے اور بس بن کر رہ گئے۔  
مگر ”ہنزہ ویلی“ تو ”بلو دا کار“ تھی۔ ہر کوئی جانے کو تیار۔ کبھی پُر جوش، بڑھ چڑھ کر نام و نشان دستخط زد ہوئے۔ پورے ممبران کو موضوع بحث و مباحثہ ہاتھ لگ گیا لیکن محض تین دن کی پُر جوش بحث و تجویس اور کئی گھریلو و غیر گھریلو وجوہات کی بنا پر وہ Wish List جب Shoty List ہو کر سامنے آئی تو محض گیارہ خوش نصیبوں نے ہنزہ ویلی کو شرفِ نظارہ کا اعزاز بخشا تھا۔

اور سراسر ”مردانہ نظام حیات“ کے اس سماج میں، یہاں اک انہونی سی بھی ہوگئی تھی کہ زنانہ کی بجائے مردانہ فہرست کچھ زیادہ ہی ”شارٹ لسٹ“ تھی۔

ارمانوں، خواہیوں، خیالوں کی وہ وادی اور مردانہ امیدوار بس دو۔  
ہمارے پُر جوش پروگرام پہ پہلی کاری ضرب یہ لگی تھی۔ پرنسپل اساتذہ کی اس ”استادی“ پر حسب سابق بدول ہوئیں اور برا فروختہ بھی۔ اب روانگی کچھ مشکوک بھی ہوگئی تھی اور بہت حد تک مشروط بھی۔  
یعنی اس میں کافی سارے..... اگر مگر شامل کر دیئے گئے۔

اور ”عملی منصوبہ بندی“ کا مرحلہ آیا تو اور شب خون ہمارے ارمانوں پر مارا گیا۔ پتہ نہیں کس کی جانب سے؟  
البتہ وہ ”شارٹ لسٹ عرف “شارٹ لسٹ“ سرے سے ہی غائب تھی گویا عشاق ہنزہ ویلی کا دستخط ریکارڈ ندارد کئی چہروں پر رونق پھر گئی۔

کہ کچھ تو راج کی بہار اور جذبات کی رو میں آکر دستخط کر بیٹھے تھے اور اب مئی جون کی مسموم ہوائیں ان جذباتی خواہشوں کو کھلاتی تھیں۔

اور کئی ”حکم حاکم مرگ مفاجات“ پر سختی سے کار بند رہتے ہوئے مصاحبوں میں نام لکھوا بیٹھے تھے (کہ پرنسپل کو یہ ٹرپ خود لے کر جاتا تھا) سوا ب نقارہ کوچ بے حد مشکوک و مشروط ہو گیا تو اُن کی جان میں جان آئی۔  
اور چہرے پُر نور ہو کر دمک اُٹھے۔ اب اس تمام مذکورہ بالا صورت حال میں، ہمارے ارمانوں کو تاخت و تاراج ہو کر سکتے کون دیکھتا؟

واقعی غالب وہ گس والا گورکھ دھند خوب اور بڑے ”اور“ انداز میں کہہ گئے تھے۔

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا  
ناحق پروانوں کا خون ہوگا

غالب کے تخلیقی امکانات کی بروئے کاری اور پھر اس شعر میں اُن کا نکتہ عروج اس فلسفیانہ سوچ اور منفرد حکیمانہ نکتہ طرازی کی اصل تفہیم و تشریح تو کوئی ماہر غالبیات ہی کر سکتا ہے مگر ہمارے ابا کی یہ خالص دیسی پینڈو تفسیر بھی کچھ کم اہم نہیں ہے جو ہمارے بچپن میں ہمیں سکھائی گئی کہ غالب نے مگس یعنی شہد کی مکھی کو باغ میں جانے سے اس لیے روک دینے کا صائب مشورہ دیا تھا کہ یہ باغ میں فساد کی جڑ بنے گی۔ یعنی پھتہ لگائے گی۔  
نکھیلوں کا سلسلہ حسب و نسب فروغ پائے گا۔ موم بنے گی اور پھر موم بتی بجے گی۔ موم بتی روشن بھی ہوگی۔  
تب پروانے بھی آئیں گے۔ آئیں گے تو پروانہ وار جان بھی دیں گے۔ اور یوں کئی ”ناحق خون“ ہو گئے۔  
تو جناب! اصل جڑ فساد..... یعنی مگس کو روک سکتے ہو تو روک دو۔ کہ نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری۔

مگر ہمارے شاف روم میں بانسری تو ایک طرف - ہمارا تو بینڈ بج چکا تھا۔ ”ہنزہ ویلی ٹرپ کینسل“ ہر طرف یہی نقارہ بج رہا تھا۔ کیونکہ فہرست غائب ہو جانے پر، بھگڑا فہرست طویل ہوتی گئی اور شائقین صرف چار رہ گئے۔ جو آخری دم تک مردانہ وار ڈٹے رہے حالانکہ وہ سب کے سب زنانہ تھے۔  
طاہرہ کلثوم، شہزادی جلیلہ، سعدیہ سرور اور راقم الحروف فرخ صابری۔

اصل کہانی اب شروع ہوئی۔  
کیونکہ ہم چاروں نے ”چار کا ٹولہ“ بنایا اور محاذ پر ڈٹ گئے۔ ہمارا اصل قصور یہی تھا کہ ہم ڈھے جانے کی بجائے ڈٹے رہے۔

اور اپنے خون چکیدہ اربانوں کو نیا ولولہ اور جوش دلاتے ہوئے بباگ دہل اعلان کر دیا کہ ٹرپ جائے ہی جائے اور دم خرم ٹھونک کر خود میدان میں اترے۔ چاروں نے پکا تہیہ کر لیا کہ جائیں گے ہم ضرور۔ چاہے اب وہ پہاڑ جہاں ہم جانے کا پُر شوق ارادہ باندھتے رہے تھے خود اٹھ کر ہماری راہ میں آحاکل ہوں۔  
ہم جائیں گے ضرور۔

تو جناب! اصل کہانی اب شروع ہوئی۔

اب ہم تھے اور کمپیوٹر ک تھا۔ ایک طرف پرچوں کی جانچ پڑتال اور امتحانی کارگزاریاں نکتہ عروج پر تھیں اور دوسری طرف ہم انٹرنیٹ کے ذریعے ”نگری نگری پھر مسافر، گھر کا رستہ بھول گیا“ کے مصداق سرگرداں تھے۔  
اور اکثر سرگراں بھی ہو جاتے۔

ہمارے ذوق و شوق کو تختہ مشق بنانے اور تسخیر اڑانے کی دوستانہ کوششیں ہوتیں مگر ہمارے ارادے متزلزل نہ ہوئے کبھی بکھار ڈرا سا دلولوں پر اوس پڑی تو ہوش ربا اخراجات اس کا سبب تھے۔ بالآخر کئی دنوں کی دیوانہ وار تحقیق اور ذہنی بھاگ دوڑ کے بعد ایک دن ہم اس اعلان پر مسرت کے قابل ہو گئے۔

”جون کے وسط میں ہم کشمیر، وادی نیلم جا رہے ہیں“ یہ اعلان ہمارے لیے نئی جگ ہنسائی کا سبب بن جائے گا۔ ہمیں یہ خبر نہ تھی۔ سینکڑوں خدشات، ذاتی تجربے، ڈراوے اور لطیفوں نے ہمیں تختہ مشق بنالیا۔

مرے کو مارے شاہ مدار۔

ہمیں اچھی طرح ذہن نشین کرانے کی کوشش ہوئی کہ یہ نام نہاد سیاستی پروگرام ”بلو دا کارنجس“ اور نہ ہی اس جوئے شیر کو کھودلانے کا منصوبہ خالہ جی کا گھر ہے۔

پہلا اعتراض ”یاران نکتہ دان“ کے نزدیک یہ تھا کہ وادی نیلم کیوں وادی ہنزہ کیوں نہیں؟  
اگلا خدشہ..... وادی نیلم جانا، دنیا سے چلے جانے کے مترادف ہے۔ سرکیس انتہائی تنگ۔ ناموافق اور ٹوٹی پھوٹی ہیں۔  
ایک اور خدشہ..... سنا ہے دریاے نیلم کا بہت سا حصہ پاکستان اور بھارت کا سرحدی فریضہ انجام دیتا ہے۔  
ان حصوں میں بھارتی فائرنگ ہو جانا آئے دن کا معمول ہے۔

ہمارے جغرافیہ کے سینئر استاد نے تو میری مذکورہ تینوں ساقیوں کو ایک دن روک کر تسخیرانہ دھمکی دی ”یہ تم لوگ مس فرخ کو اس عصر رفتہ میں کہاں خوار کرائی پھر گئی؟“  
(انہیں خبر یہ تھی کہ فساد کی اصل جڑ تو خود مس فرخ ہے، یعنی غالب کے باغ کی گس..... جو باقی تینوں کا خون ناحق بھی گردن پر لینے کو تیار ہے)



ہماری ایک ساتھی ہرج تسخر انداز میں ہماری خوب خبر لیتیں۔  
”ہو آئے کشمیر سے؟“

ہم ساری جلن..... تمام تر پھول پھاں کو گرفت کر کے بڑی مہذبانہ سعادت میں رچ کر جواب دیتے۔  
”کوشش تو ہو رہی ہے۔ دیکھئے! نصیب میں ہوگا تو چلے جائیں گے۔ آپ بس دعا کریں۔“  
”انشاء اللہ! انشاء اللہ!“ دعائے کلمات کا فریضہ بمشکل ادا کر کے وہ ہنسنے لگتیں۔

اور ہمارے سینے پر سانپ لوٹ لوٹ جاتے۔ ویسے یہ کار خیر ہماری نسبت کئی ”اور“ بڑی عمدگی سے نبھا رہے تھے کہ اُن کے سینوں پر سانپ لوٹ لوٹ جاتے اور ہماری اس ”زنانہ ہم جوئی“ کو احمقانہ جذباتی اور پیسے کا زیاں کہہ کر دل کی بھڑاس نکال لیتے۔

ایسے نامساعد حالات میں..... چند تھے جو دلی درد کے ساتھ ہمارے دل کا درد سمجھتے تھے۔ جنہوں نے ہمارے پر جوش جذبول کو جلا بخشی۔ ہمارے حوصلے بڑھائے ہمارے مرتب شدہ پروگرام میں اپنی ترتیب و تدوین کو بڑھ چڑھ کر استعمال کیا۔ ہماری کسی بھی ترمیم میں حق ترمیم اپنے ذمے لیا۔

الغرض ہماری منصوبہ بندی..... کپڑوں کا انتخاب سامان کی فہرست..... ضروری شاپنگ میں مفت مشورے وہاں رہائش میں گھریلو نوکروں کی ٹپس..... سب اُن کی زیر ہدایت پایہ تکمیل کو پہنچا۔  
کبھی کبھار تو عقل دنگ رہ جاتی تھی کہ جاکون رہا ہے؟ ہم یا وہ؟

بہر حال..... آخر کار گئے تو ہم ہی..... مگر اُن کے صائب مشورے اور بے پناہ یادیں پورے سفر میں ہمارے ہمراہ رہیں۔

## باب دوم:

### کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

اور بالآخر ٹرین چل پڑی..... مگر اس چل چلاؤ میں بڑی ہی من مو جی تھی۔ کبھی ترمگ میں آجاتی اور کبھی بی چوٹنی کو رستہ دینے بیٹھ جاتی کہ

”نہیں بی چوٹنی! پہلے آپ..... میں تو ”ایکپیر لیس“ ہوں تیز چلنا میرے ماتھے پہ لکھا ہے ساڑھے دس.....  
راولپنڈی پہنچ کے دکھاؤں گی..... روز پہنچ جاتی ہوں..... یہ میرا اشتہاری دعویٰ ہے اور اخباری پرکشش مہم بھی۔“  
ہم اسی اشتہاری مہم سے متاثر ہو کر ہی تو بنگلہ کروا بیٹھے تھے کہ ”ایک پختہ دو کاج“ کے مصداق ٹرپ کے مزے تو ہیں ہی۔ لگے ہاتھوں ٹرین کا سفر کر کے بچوں کو خود اپنے بچپن کے لطف و سرور کا حقیقی تجربہ کروایا جائے۔ تاکہ آئندہ وہ اپنے بچوں کو فخریہ انداز میں بتا سکیں کہ پاکستان میں فلاں فلاں سن ٹریک ہوا کرتے تھے۔ جہاں بچے کرکٹ کھیلنے کی بجائے ٹرینوں کی آمد و رفت دیکھا کرتے تھے۔

میرے بچے..... اور سرور ونگ کے بچے انتہائی بیزار انداز میں ”ایکپیر لیس ٹرین“ کی کارستانیوں کو اپنے دل پہ لے رہے تھے۔

اور اس وقت پونے سات بج چکے تھے اور ایکپیر لیس ٹرین نے ابھی اصل مقام یعنی لاہور ریلوے اسٹیشن پہنچ کر اپنی ابتدا کرتی تھی اور آگے اس ایکپیر لیس ٹرین کی ”من مرضیاں“ کیا گل گھائیں گی یہ کہنا قبل از وقت تھا۔ فی الحال تو ہم میر تقی میر کو حسب حال کہہ سکتے تھے۔

# سیارہ ڈائجسٹ کی ایک عظیم الشان پیشکش

## شائع ہو گیا ہے صحابیات نمبر

100 سے زائد صحابیاتؓ کا تذکرہ پاک جنہوں نے رسول اکرم ﷺ سے بیعت کی۔

ان عظیم خواتین کا تعلق ہر شعبہء زندگی سے تھا۔

اس خصوصی نمبر میں ملاحظہ کریں اُس صحابیہ کا ذکر جسے مدینہ منورہ میں امامت کروانے کے

سبب صحابہ کرام نے خطیبۃ النساء کا خطاب دیا۔

ایک مظلوم صحابیہ کا قصہ جسے آپ ﷺ نے مسجد نبوی کے صحن میں رہائش کیلئے جگہ دی۔

مدینہ منورہ کی پہلی خاتون انسپکٹر کا ذکر جن کے ذمہ منڈیوں کے بھاؤ کی جانچ پڑتال کرنا

تھی۔

اور اس کے علاوہ بہت سے دلچسپ واقعات ہر واقعہ کے ساتھ مستند کتب کے

قیمت: 160 روپے

حوالات درج ہیں۔

یہ ایک علمی تاریخی اور تحقیقی دستاویز ہے جس کے بغیر آپ کی لائبریری نامکمل ہے۔

سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ ریواڑ گاؤں لاہور۔ فون: 37245412

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا  
آگے آگے دیکھتے ہوتا ہے کیا

بھئی! لگتے جان گے!

اور ہمارے آگے بھی اچھی خاصی پریشانی تھی۔ ہماری لاہوری ٹرپ پارٹی کے تین مستعد متاثرین ”سامان بکف“، گزشتہ یوں کھنے سے سگنل اور پٹری پر نظریں بچھائے ہم تن تیار کھڑے تھے۔ اور ادھر ایکسپریس کی ”من مرضیاں“ جاری تھیں اور ادھر سرور ونگ کی ان..... نادیہ کی نخوت، بیزاری اور لائق تکتہ انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

یہ ناگوار فضا ختم کرنے اور خود اپنی قلبی تشفی و تسکین کی خاطر بار بار کالیں کی جارہی تھیں کہ اب ٹرین یہاں ہے اب ایکسپریس وہاں ہے۔

اور بالآخر ساڑھے پانچ لاہور سٹیشن سے کوچ کر جانے والی اسلام آباد ایکسپریس چھ بج کر پچاس منٹ پر چمکھٹاؤتی، سیٹیاں بجاتی لاہور کے تاریخی ریلوے سٹیشن سے ہم کنار ہوئی تو ہم تن تیار متاثرین..... مسافروں کی صورت اس کی قدم بوی کو لپکے۔

اس لپک جھپک میں عقیدت کی جگہ اضطراب اور نفسانفسی کا منظر زیادہ تھا۔ ادھر ہم اپنے ”سامان بکف“ دسے کو دیکھ چکے تھے۔ اشارے کیے جارہے ہیں۔ فون آزمائے جارہے ہیں۔ اُن کی کوتاہ فہمی اور کم نظری پہ ہنسا جارہا ہے کہ سامنے سے بوگی گزر گئی ہے اور کم عقل پھر بھی بھاگے چلے جارہے ہیں۔

بالآخر اپنے دونوں چھوٹے رنگروٹوں کو بگٹ بھگایا۔ اس تاکید پر اصرار کے ساتھ کہ فلاں کپڑوں والی باجی کو کہو کہ اُن کی سیٹیں یہاں ہیں۔

”کوئی اور نشانی؟“ پریشاں حال محسن سرور فرماں برداری سے سوال کناں ہوا تو مزید تاکید کو پختہ کر دیا ”اُن آنٹی کی آنکھیں بڑی خوبصورت ہیں، پہچان جاؤ گے“ شریف صورت محسن کے بال کھڑے ہو گئے اور چہرہ مزید پریشان ہوا تھا۔ وہ بارہ بجے انداز میں بولا:-

”جی اچھا!“

اور ہمارا سارا کیمین زعفران زار ہو گیا۔ سب اپنی اپنی ہنسیاں ہنس رہے تھے۔ مگر میں اپنی بتائی ہوئی نشانی پر مہر تھی اور پتھر پر لکیر تھی..... نادم ہونے کا دُور دور تک نام و نشان نہ تھا۔

اور پھر کچھ بھاگ دوڑ کے بعد وہ خوبصورت آنکھوں والی شہزادی جیلہ اپنی تمام تر دشتوں کے ساتھ، بمعہ ساز و سامان آہی گئیں۔

ساتھ حواس باختہ طاہرہ کلثوم اور اُن کے مستعد میاں بھی چلے آ رہے تھے۔ سامان کی تیزی سے ٹھونسا ٹھانسی ہوئی کچھ بیٹھنے بٹھانے کا معاملات حل ہوئے اور کچھ حل پذیر معاملات کے لیے ہمارا سارا ”مردانہ دستہ“ منسلک کوچ کی جانب کوچ کر گیا۔ وہاں ہماری چار سیٹیں تھیں۔ لاہور ریلوے سٹیشن کو اسلام آباد ایکسپریس نے زیادہ گھاس نہ ڈالی اور کوچ کا قنارہ بجا دیا۔

جلدی ٹرین نے رفتار پکڑ لی۔

منظر تیز ہونے لگے..... دو موریہ پل کی وہ بے ہنگم ایک دوسرے میں ٹھسی ٹھنسی ٹریفک..... ٹریک پر چڑھے



چڑھے وہ کئی کئی منزلہ یک مرلہ پلازے..... آڑھے ترچھے مکان..... ان مکانوں سے لٹکتے بوسیدہ پردے۔ بالکل پٹری سے لگے ادھ ننگے بچے..... کچھ رفع حاجت میں مشغول چند ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے۔  
ٹرین نے مزید رفتار بڑھ کر، خود کو ”ایکسپریس“ ثابت کرنے کی جیسے ضد بکڑی۔

اب وہ دریائے راوی کے اوپر سے گزر رہی تھی۔ جو بس اب راوی رہ گیا تھا۔ دریا والا معاملہ اس جون میں بھی مشکوک تھا۔ کیا اب راوی کے لیے کھوئی کلیشیر نہ رہا تھا جو وہ بہتا ہی نہ تھا بس چپ چاپ لیٹا رہتا تھا۔ اور دیکھتا تھا کہ فیرنگی قدرت کیا ہے؟

کبھی کسی زمانے میں، ماہرین ارضیات عرض کیا کرتے تھے کہ لاہور ایک آتش فشاں کے دہانے پر واقع ہے۔ اس کے اندر ہی اندر لاوے اُبلتے پھر رہے ہیں۔ یہ ساری راوی دریا کی ٹھنڈک ہے کہ وہ ان لاوؤں کو پھٹنے نہیں دیتا۔ مگر ہمارے ابا جیسے درویش منش ہمیں بتایا کرتے تھے کہ راوی کنارے داتا گنج بخشؒ کا بیڑا رہا ہے۔ اب مزار ہے یہ داتا کی نگری ہے۔ علی جویری مظہر نور خدا تھے۔ آپ فیض عالم، کل عالم اور کل زمانوں کے لیے ہیں۔ پھر سوچو کہ داتا کی نگری سے لاوے کیسے پھوٹیں؟

اور جب طالبان نے داتا کی نگری اور خود ”داتا دے دربار“ میں خون کے دریا بہا دیئے۔  
تو مجھے اُن عقیدتوں اور ان وحشتوں کا کوئی جواز نہیں ملتا تھا۔

ہاں! داتا دادر بار..... آج بھی برصغیر کا باروق ترین دربار تھا۔

ٹرین نے رفتار کو اور کمبیز کیا اور ہماری موج و مستی کو بھی ہوا دی اور ابھی ہم ترنگ میں پے بھی نہ تھے کہ اُس نے پہلے دو تین جھٹکے کھائے..... اور پھر لمبا جھٹکا کھا کر رُک گئی۔

سب متوحش نظروں سے مجھے دیکھنے لگے اور مجھ فساد کی اصل جڑ نے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ باہر کے ساکت و جامد منظر مزید بج چکے تھے۔ افلاس گزیدہ سے۔

اور پھر وہ جانا پہچانا منظر..... تب میں نے اپنے ساتھیوں کو تاریخی تہذیب کا دلاسا دیا۔  
”وہ دیکھو..... نور جہاں کا مقبرہ“۔

”کون نور جہاں؟ میڈم نور جہاں! ملکہ ترنم نور جہاں؟“ کسی بچے نے پھبتی کسی اور کسین میں ہنسی کا نیا فوارہ پھوٹ پڑا ”بھئی! وہ نور جہاں تو کراچی میں دفن ہیں، اللہ نے بڑا رتبہ دیا۔ رمضان میں اور وہ ستائیس رمضان میں فوت ہوئیں مگر ہم انسانوں نے اُسے گندے نالے کے قریب دفن کر دیا۔ وہ برصغیر کی ہی نہیں دنیا کے موسیقی کی عظیم مغنیہ تھیں۔“

ہم نے اپنی شوہر صحافت و معلمات کی پٹاری کھولنا چاہی ”تو پھر یہ نور جہاں؟“  
میں نے دیکھا یہ نور جہاں..... ”یہ حالی کا نمونہ بنی یہاں کم گشتی تھی۔ دھنسی دھنسی قبر۔ آج سے لگ بھگ تیس سال پہلے ہماری ادبی و ثقافتی تسلیم..... لان کچل سوسائٹی“ نے یہاں کا خصوصی سروے کیا تھا تو ہم ناگوں یہ رومال رکھ رکھ کر شاہدہ کی اس بستی میں پہنچے تھے۔ پٹری کی دوسری طرف شہنشاہ عالم نور الدین جہانگیر کا عیالشان مقبرہ تھا۔

”یہ بھی اک جہاں کا نوشتہ تھی، جسے شہزادہ سلیم نور محل کہہ کر اپنی پسندیدہ نیگم نامہ درجہ دیتا تھا..... کہ دل کی طرح اُس کا حرم بھی کشادہ تھا اور انارکلی..... ہماری رومانوی تاریخ کا سب..... عبرتناک انجام پا جانے والی انارکلی..... زندہ دیوار میں چنوائی جا چکی تھی..... سو شہزادہ سلیم دل کے بہلاوے کو کثرت شراب نوشی کرتا۔ وسیع

وعریض حرم کو کشادہ کرتا رہا اور زنجیر عدل کے دم خم پر ”انصاف“ کرتا رہا۔  
اب یہ بھی تو انصاف ہے ناں کہ اپنے ایک فوجی شیر انگن علی قلی خاں کی نوخیز منکوحہ پسند آئی۔ سو انصاف کا تقاضہ یہی تھا کہ وہ دنیا سے ہمیشہ کے لیے منہ موڑ جاتا۔ شہنشاہ وقت کی کشادہ دلی دیکھتے کہ بیچاری بیوہ اور وہ بھی لاڈلی بیٹی کی ماں..... اُسے اپنے حرم کی ”پسندیدہ ترین ملکہ“ بنالیا۔ اس کے بے پناہ حسن کی داد دی اور حکومت کے ان گنت اختیارات دے کر خود قریباً حکومتی پریشانیوں سے کنارہ کش ہو گئے تاکہ کثرت شراب نوشی کے نئے ریکارڈ ”توزک جہانگیری“ میں درج کر سکیں۔ پتہ نہیں بڑور شمشیر یا بوجہ زنجیر جہانگیری عدل؟“  
بہر کیف! مغلیہ سلطنت خوب فروغ پذیر ہوئی۔ جس کی ایک بڑی وجہ اس خستہ مزار والی نور جہاں کی ذہانت و فطانت بتائی جاتی ہے۔ ایرانی النسل اور افغانی جائے پیدائش والی مہر النساء..... مغلیہ ہندوستان کی سب سے مشہور ملکہ قرار پائی اور عملاً ہندوستان پر حکومت کی یہاں تک کہ اُس زمانے میں ”مغلیہ سکھ راج“ الوقت“ پر ملکہ کا نام بھی چلا تھا۔

ایرانی تہذیب اور شاعری خوب پروان چڑھی۔  
نسواں فیشن نے صنعت کا درجہ پالیا۔ کپڑوں اور زیورات دونوں میں۔ مصوری کے سر پہ شفقت کا ہاتھ رکھا گیا۔  
اور جب آرکیٹیکٹ شہنشاہ شاہ جہاں جیسے باغوں کے رسیا بادشاہ نے بڑو نکوار تاریخ کا دھارا بدلاتو یہی مہر النساء المعروف نور جہاں کو اُس نے نظر بند کر دیا۔  
اور سنا ہے کہ وہ تب بھی باغ و باغیچے کل و گلزار کرنے میں مصروف رہتی تھیں۔  
مگر اس رُک ٹرین سے..... اُس باذوق و حسین ملکہ کا جو بد حال مزار نظر آ رہا تھا وہ تو ساحر لدھیانوی کے شعری نوے کا جیتا جاگتا ”ثرہ مزار“ تھا۔ کہ وہ ان بد نصیبوں میں تھیں جو زندگی کی طرح، موت کے بعد واقعی مر جاتے ہیں۔  
مردہ قبروں والے مُردہ نصیب شاندار لوگ۔

ویسے یہ ترقی پسند ادیب و شعراء بھی کمال کے لکھاری ہیں حال ہو کہ ماضی..... کوئی نہ کوئی عیب اور نقص ہی تلاشیں گے..... اور یہ ساحری لدھیانوی..... میرے پاس حمید اختر کے یار غار اور ترقی پسند تحریک کے ہر اوّل دستے کے مجاہد خُمر..... ساحر لدھیانوی نے ہر معاشی، معاشرتی اور تہذیبی و تاریخی حقائق کو ”میں نہ مانوں“ والی ٹکڑی سے بس رد ہی کیا ہے کسی نے سات عجائبات کے حسین عجوبے تاج محل کے حسن سے متاثر ہو کر کہہ دیا کہ  
اک شہنشاہ نے بنوا کے حسین تاج محل  
ہم غریبوں کو محبت کی نشانی دی ہے  
سات..... کہ جو تمام شہنشاہوں اُن کے مقبروں اور اُن کے بنائے ہوئے مقبروں پر لعنت بھیجتے تھے جھٹ  
کہہ دیا نظم ”تاج محل“ کی صورت:-

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر

ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

اب سچا کون؟ یہ تو محبت کرنے والے اور محبت دینے والے جانیں۔ ہم تو اس وقت ”اسلام آباد ایکسپریس“ کے نکتہ انجماد کے شکار تھے۔ میری نظریں فضائی وزمین آلودگی میں دھنسی ”نور جہاں“ کے خراب حال مزار پر منڈلاتی تھیں اور ذہن مغلیہ عہد جبروت میں گھومتا تھا اور ساحری وہ نظم کھوج کھوج کر یاد کرتا تھا جس میں

اُن کا اپنا نکتہ نظر تھا اپنی عینک سے وہ فرعونیت، آمریت اور استعماریت کے استعاروں کو بیاگ ڈھل لکارتے تھے اور ”نور جہاں کے مزار پر“ کھڑے ہو کر دل کے تار چھیڑتے تھے کہ

کبھی کبھی سی فضاؤں میں یہ ویران مرقد  
اتنا خاموش ہے فریاد کناں ہو جیسے  
سرد شاخوں میں ہوا چنچ رہی ہے ایسے  
روح تقدیس و وفا مرثیہ خواں ہو جیسے

تو میری جان! مجھے حیرت و حسرت سے نہ دکھ!  
ہم میں کوئی بھی جہاں نور و جہاں گیر نہیں  
تو مجھے چھوڑ کے، ٹھکرا کے بھی جاسکتی ہے  
تیرے ہاتھوں میں، مرے ہاتھ ہیں زنجیر نہیں!

”یہ مس فرخ کہاں گم ہیں؟“ سعدیہ سرور نے پر اشتیاق انداز میں پوچھا۔

”اپنے کسی افسانے کے کردار کی کتر بیونت میں مصروف“ ہماری والی شہزادی نے اک رومانوی سی گہ لگائی ”یہ لکھاری لوگ ہر جگہ اپنی کہانیاں ڈھونڈنے بیٹھ جاتے ہیں۔“

میں پھیکے انداز میں مسکرا دی۔ اس وقت چھیڑ چھاڑ کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے آنکھیں موند لیں۔ اور اپنے پسندیدہ رائٹر کے ساتھ اُس تہذیب و تاریخ میں بدروح کی طرح بھٹکنے لگی۔ نور جہاں کو کتنا بدنام کیا گیا مگر اس کی نازک رگیں کس نے ٹٹولیں؟ اُس نے جواں شوہر کی میت پے کیا کیا بین کیے ہوئے؟ اُس نے اپنی محبت کے قاتل شہنشاہ کے لیے اپنی سچ کس دل سے سجائی ہوگی؟

کون؟ کون جانے؟

مگر ساحر جانتا تھا اُس نے کتنی صدیوں بعد اس ریختہ قبر کے افسانے افشا کیے تھے۔

پہلوئے شاہ میں، یہ دختر جہور کی قبر  
کتنے گم گشتہ فسانوں کا پتہ دیتی ہے  
کتنے خوزیرِ حقائق سے اٹھائی ہے نقاب  
کتنی چمکی ہوئی جانوں کا پتہ دیتی ہے

کیسے مغرور شہنشاہوں کی تمسکین کے لیے  
سال ہا سال حسیناؤں کے بازار لگے  
کیسے بھکی ہوئی نظروں کے قییش کے لیے  
سرخ مٹلوں میں جواں جسموں کے انبار لگے

کیسے ہر شاخ سے منہ بند مہکتی کلیاں  
نوج لی جاتی تھیں تزئین حرم کی خاطر  
اور مر جھاکے بھی آزاد نہ ہو سکتی تھیں



”غل سبحان“ کی الفت کے بھرم کی خاطر  
کیسے اک فرد کے ہونٹوں کی ذرا سی جنبش  
سرد کر سکتی تھی بے لوث وفاؤں کے چراغ  
لوٹ سکتی تھی دھکتے ہوئے ہاتھوں کا سہاگ  
توڑ سکتی تھی مئے عشق سے لبریز ایام  
سہمی سہمی سی فضاؤں میں، یہ ویران مرقد  
اتنا خاموش ہے فریاد کناں ہو جیسے

”بھئی! سب لوگ اس قدر خاموش کیوں ہیں؟“ بخ بستہ کیمین میں کسی کی بیزار آواز ابھری تو میں چونک اٹھی۔  
”کہاں ماضی اور کہاں حال کا یہ پر جوش سفر..... جہاں ہم سب عازم کشمیر تھے اور فی الحال سوئے اسلام آباد  
تھے۔ ٹرین فرائٹ بھرتی کو جرانوالہ کی جانب رواں دواں تھی۔

شاد رہ کہیں بہت پیچھے رہ چکا تھا۔  
تاریکی گہری ہو رہی تھی اور میرا گوجرانوالہ آنے والا تھا۔ جو میرا شہر تھا۔  
جو امرتاپر تہم کا شہر تھا۔  
جو عدم کا شہر تھا۔

میں عرصہ ہائے دراز کے بعد اس کے ٹیشن سے گزرنے والی تھی جس کے پہلو سے اک سڑک نکلتی تھی اور  
دریائے چناب سے نکلی، سب سے بڑی نہر ”اپر چناب“ عبور کرتی میرے گاؤں کو جاتی تھی۔ میرا گاؤں فیروز  
والا۔ جہاں میں نے اپنے بچپن ولاں کپن کے چند رہ سال گزارے تھے۔ کھیلتا بچپن کا تالڑپن، حسین ترین بچپن۔  
مگر افسوس! رات کے اس سے سب تاریکی میں لپٹا ہوا تھا۔

**یہ ساری ”ن“ کا قصہ ہے!**

**باب تین:-**  
اس ہنسی گاتی، موج مستی میں ڈوبی زندگی میں ہوتے ہیں کچھ لوگ کہ جو بہت سی ’ن‘ کا وزن اٹھائے  
اٹھائے اسے اپنی مرضی سے گزارنے کی کوشش کرتے ہیں۔  
منے ماحول سے ناخوش۔  
منے لوگوں سے نالاں۔

نئی فضا کے جنگل میں بھسنے ناگواری کا جیتا جاگتا نمونہ وہ اک نو وارد لڑکی..... جو ’ن‘ سے نادیہ تھی اور جو  
’ن‘ سے سارے نگرے اپنی کھڑی کھڑی ناک پہ رکھے اس بخ بستہ کیمین میں یوں داخل ہوئی تھی کہ جیسے  
ناگواری کا اہل فیصلہ پہلے ہی کر رکھا ہو۔ اُس نے چند لمحوں اپنی ستواں ناک کو ماحول سوگھنے کا کام سونپا اور پھر  
جھٹ بھاری بھر کم بکسوں اور دیگر اہم علم کی ”سینک“ میں معروف ہو گئی۔

پتہ نہیں کیوں وہ شکل میری پہچان میں ابھرتی ڈوبتی رہی پتہ نہیں کیوں؟؟

میرا ذہن اُلجھ سا گیا۔ اُس وقت بھی جب وہ ڈھیروں ڈھیروں انگریزی کی ہم ”ارو دونوں“ پر دھاک بٹھا کر  
خود بھی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ پھر کونے کی طرف لڑھک گئی اور بند کھڑکی کے ٹھہرے ماحول کو بے معنی اور بیزار نظروں

سے دیکھنے لگی۔ اس کی ساری بناوٹی توجہ کھڑکی سے باہر تھی۔ یوں جیسے وہ کیمین کے بیخ بستہ ٹھنڈے ٹھار ماحول سے فرار چاہ رہی ہو۔ یہ نگرے اور ناگواری کی دیواروں میں جتنی نادیدہ سرور، اتنے دن اس ”لاہوری بھانڈ پارٹی“ کی مراہیت کے ساتھ وقت کیسے گزراے گی؟

میں نے دُکھ سے سوچا اور پھر اپنی چہرہ شناسی کی علت پر لعنت بھیج کر کیمین سے باہر نکل گئی۔ یہ جواز دیتے ہوئے کہ ”میں ذرا سحر کو دیکھ لوں“ وہ بھی ہمیشہ کا مردم بیزار۔ یہ جواز گھر کے ٹرین کے دروازے میں کھڑا تھا کہ روانگی کے گاڑی کی ساری کارروائی بہ نظر عیق دیکھوں گا۔ میں نے کچھ وقت اس کے ساتھ گزارا۔ زبردستی چند یادیں شیریں۔ بچپن میں نشین سے خریدے پکڑوں اور سوسوں کی لذت بتائی۔

مگر وہ خالی خالی نظروں سے دیکھنا نہیں دیکھتا رہا تھا۔  
میں واپس کیمین میں لوٹ آئی۔ (کی تک ن۔) نادیدہ اپنی تمام تر ”ن“ کے ساتھ بدستور لاقطع تھی۔ کسی دلی لاث صاحب کی طرح جس نے ”افرنکی اپنا اکڑ اور خو چھوڑ گیا ہو۔

”کمال ہے بھئی! یہ بچاری بچی تو اس ”سیاحتی دورے“ کو ”ن“ سے ناکام کرنے پر تلی ہے اور اک ہم کہ یہ طے کر کے اس سیاحتی مشن پر نکلے تھے کہ آئندہ تمام دنوں کو پنجابی سے منسوب کریں گے اور پنجابی بھی ٹھیکہ سکھوں کی سی پنجابی.....“

یہ لئے دیئے والی صورت حال ریلوے نشین لاہور پھر شاہدرہ اور یہاں تک کہ گوجرانوالہ تک برقرار تھی۔ درمیان میں کوئی ”مصنوعی کنکر“ پھینک دیا جاتا۔ ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوتا اور پھر سب نو وارد تہذیب و تمدن کے استعارے بن جاتے۔ ماحول کو زندہ رکھنے کا سارا بوجھ ہم چاروں نے اٹھا رکھا تھا۔ جو اس سیر و سیاحت کے اصل قصور وار بلکہ ”سزاوار“ تھے۔

نویز اور نوجوان سیاحتی طبقہ ہمارے لطیفوں اور شاف روم سے جڑی یادوں کا ”سطحی رد عمل“ دے کر بس لئے دیئے سے ہی بیٹھا تھا اور نادیدہ سرور کو تو باہر کے اندھے اندھیرے منظروں کو بے بصارت نگاہوں سے دیکھنا تھا بس۔  
یکایک..... ہماری شہزادی جیلہ کو قہقہے والے نان یاد آگئے۔ فوراً دسترخوان جگ گیا۔ اچھرے لاہور کے خاص نان تھے۔ بیج، لڑکے، لڑکیوں کے چہرے کچھ کھلے۔ سرگرمی سے مزید ارطعام کو انجام پہنچایا۔

اب ماحول کو رنگین بنانے کی خاطر نعرہ لگا۔  
”چلو بھئی! گانے گاؤ..... نادیدہ بور ہو رہی ہے۔“

”چلو! چلو!“ سب ہمہ تن شوق، اس کار خیر میں شریک ہونے کو تیار تھے۔ ”محسن تمہارا گنثار کدھر ہے؟ بڑی دھوم مچی تھی اُس کی۔“

”وہ تو بھول گیا“ وہ شرمندہ تو ہوا مگر فوراً مستعدی سے بولا ”دوسرا سٹم ہے۔“

لیب ٹاپ کے ساتھ کچھ تاریستانی کر کے اُسے سعدیہ سرور کے لائے پیکر سے فسلک کیا ہی جا رہا تھا کہ برادرِ کلاں حسن سرور پہلے کچھ بے چین ہوئے پھر پیٹ پر ہاتھ رکھ کر اپنی بڑی آپا سے کچھ خصوصی معاملات پر مشاورت کی اور پتلے حالوں کی پکار پر اُس خانے کی طرف لکے جسے گھروں میں سے داش روم کہہ لیا جاتا ہے۔ البتہ ٹریوں کے نزدیک وہ بیت الخلا ہی ہیں۔ جو انتڑیوں کی گونگو کو ”خلا“ فراہم کرنے کا موقع عطا کرتے ہیں۔ جب حسن سرور کامیاب ہو کر واپس لوٹے تو ہماری محفلِ موسیقی خاصی رنگ پکڑ چکی تھی۔

ایک پھر بس اسلام آباد بھی..... اب سوائے رفتار پکڑے رکھنے کے اور کچھ نہ کرتی تھی۔

حسن سرور کچھ شرمندہ اور بہت سے نادم نادم شریک محفل ہوئے اور جب خود اُن کا کوئی گایا ہوا گانا لپ ٹاپ سے دکھایا گیا تو بھی حسن بھائی فخریہ موڈ میں آنے کی بجائے پیشانی سے عرقی افعال ہی پونچھ رہے تھے۔ یوں جیسے ابھی کچھ دیر پہلے والی کی گئی ”حرکت“ کوئی، گناہ کبیرہ تھی اور وہ بھی ایسا گناہ جسے دنیا والوں نے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو اور اب شرمندگی میں نہ مٹ پائے۔

ہم بھی کیسے عمدہ لوگ ہیں۔ کیسی کیسی غیر فطری باتوں پر خود کو مورد الزام ٹھہرا کر شرمندہ ہوتے رہنے والی قوم۔ محفل موسیقی، محسن سرور کے اونچے اونچے اور جان پر کھیل کھیل کر گائے گئے سروں کی ہمراہی میں عروج پر تھی کہ یکا یک سعدیہ کا لایا ہوا سٹیکر کھانسنے لگا۔

”لو جی ہمارا ساؤنڈ سسٹم تو خطرے کی گھنٹی بجانے لگا ہے۔ اب دنیائے موسیقی کی ساری ذمہ داری ہمارے مدقوق سے محسن سرور کے ہاتھوں کندھوں پر تھی۔ اُن کا کبھی کبھی کچھ ساتھ حسن سرور نے دیکر سروں کا سرواںچا رکھنے کی کوشش تو کی۔ مگر اُن کے نیچے پڑتے سروں نے اس کی اجازت نہ دی کہ پیٹ کے تکلیف دہ بلاوے اس رنگ میں مسلسل بھنگ ڈال رہے تھے۔

یہی کہیں میں ایک پرشوق پیش کش ابھری۔  
”تم سب ہنؤ..... میں گاتی ہوں“

یہ تو نادیہ سرور تھی..... کمال ہے میری طرح میری ساتھیوں کے چہروں پر بھی حیرت تھی اور یہ حیرت اُس وقت کوئی جھٹکا سا بن گئی۔ ”زبردست الیکٹرونک شاک“ جب کہیں میں اُس کی آواز ابھری۔ ایک پھر بس کی فرمائے دار جھک جھک جیسے معدوم ہو گئی تھی۔ بس ہماری سماعتیں تھیں اور اس کے گلے کے سرگوش سر۔ غضب کا اُتار چڑھاؤ اور آواز میں کمال کی لوج۔

میں نے متناہی رج کر، دنیا کی اس کول سی، بے تکلف اور بے ساختہ مترنم لڑکی کو دیکھا۔ ان لمحوں میں اس کا سارا غرہ، ساری آدم بیزاری، تمام بدلیسی گٹ اپ کا نمائشی زعب داب لپیٹ لپاٹ کر بند کھڑکی میں سے باہر پھینکا جا چکا تھا۔ ساری اُن غائب ہو چکی تھی وہاں اب صرف نادیہ تھی۔ سچے سروں میں ڈوبی نادیہ..... بڑے چل انداز میں بے تکلفی سے بیٹھی اپنی مستی کے بہاؤ میں گم۔ اور سارے سامعین اسے عقیدت رچی تحسین سے دیکھ رہے تھے۔ یہی وہ ہوا..... جو اکثر میرے ساتھ ہوتا ہے۔ اُس پیاری سی بچی نے ہولے سے قدم اٹھائے۔ دستک بھی نہیں دی اور دیر سے میری روح سے لگ کر بیٹھ گئی۔

احساس کے تمام تر بندھنوں کے ساتھ۔

جس بندھن میں..... خون یا ساج کا کوئی سلسلہ مطلوب نہیں ہوتا۔ جس بندھن کو بننے کے لیے بس ایک لمحہ چاہیے اور جو پھر لمحوں تو کیا دنوں، مہینوں، سالوں حتیٰ کہ صدیوں سے بھی نہیں ٹوٹتا۔ جہاں ٹوٹ پھوٹ کی جگہ ’نوٹ‘ کی سچائی آ جاتی ہے۔ سچ ہے موسیقی روح کی غذا ہے اور موسیقی میرے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھی۔ سو میرے نہاں خانوں کی اک اونچی ”زنجبھٹی“ پروہ دھرتا دے کر آ بیٹھی۔ بالکل محسن کی سی بے ساختگی اور اپنائیت کو اوڑھے آلتی پالتی مارے۔ ایسی وارثی کو کون روحوں سے بیدخل کر سکتا ہے۔

مگر اُس نے تو کہا تھا..... بہت دنوں بعد..... اُس نے گلوگیر آواز میں اپنی اسی میٹھی مترنم ٹون میں اعتراف



# سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور عظیم پیشکش

## حج عمرہ اور زیاراتِ مہربان

شائع ہو گیا ہے

قیمت: 195 روپے

- ✽ نقشہ ارض القرآن مع اہم قرآنی مقامات کی نشان دہی
- ✽ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا روڈ میپ
- ✽ حج اور عمرہ کی ادائیگی کا طریقہ آسان اور عام فہم زبان میں
- ✽ اہم تاریخی مقامات کا نام، وجہ تسمیہ، محل وقوع، تصاویر اور اُن سے متعلق تاریخی واقعات کا بیان نیز متعلقہ آیات اور احادیث کے حوالہ جات
- ✽ تحریروں، تصویروں اور جدید نقشوں سے مزین یہ کتاب ہی نہیں حج اور عمرہ پر جانے والوں کے لئے ایک مکمل گائیڈ ہے۔

سیارہ ڈائجسٹ 240 ریوازاگاڑن لاہور فون 042-37245412

کیا تھا کہ خود سے شکایت کی تھی شاید؟

”میں ”اچھے لوگوں“ کو کھو دیتی ہوں“ جذبات کی شدت سے اُس کی رواں آواز میں رخنے ڈال دیئے تھے ”پتہ نہیں کیوں مجھے انہیں سنبھالنا نہیں آتا؟“

وہ سچ کہہ رہی تھی کیونکہ وہ سچ کا وقت تھا۔ صبح صادق کا وقت، بحری کا وقت، جب پاکیزگی اور صداقت کے سوا فضاؤں میں کچھ نہیں ہوتا۔ جب دنیا دار تو دنیاوی فکروں کے مارے دھت پڑے ہوتے ہیں اور اللہ والے جاگتے ہیں۔ اللہ سے سوال کناں ہوتے ہیں۔ کھوٹ، نمائش اور دنیا داری کا نام و نشان نہیں ہوتا۔

بس صداقت ہوتی ہے۔ صدق و صفا کے اُس وقت..... کہ جو وقت خالق نے تجھ کے لیے عطا کیا ہے..... وہ بالکل سچ کہہ رہی تھی اُس وقت۔

اور اظہار صدق کے لمحوں میں..... اُس سچل لڑکی کے اُس معصوم سوال کا جواب بھی تھا میرے پاس۔ میرے تجربوں کے جوابوں کی صورت۔ مگر میں نے اُسے کوئی جواب نہیں سکھایا کہ یہ ”سیکھ“..... یہ تلاش..... یہ ”سودوزیاں کا سفر لانتہا“..... اُسے خود ہی کرنا ہوگا۔ چاہے یہ سفر کانٹوں بھرا ہو۔ تنہائیوں میں سسکتا ہو۔ یا اچھے لوگوں میں گھرا۔ یہ موتی اُسے خود ہی چننا تھے۔

میں اُس کے لیے دعا کر سکتی تھی۔ جو روح کی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ میں نے کی۔

بلکہ ہم دونوں نے کی اور درمیان میں صادق گھڑیاں تھیں صبح صادق کا تہجد وقت۔

کیبن کا لرزیدہ..... چمک چمک ماحول اسلام آباد کی جانب رواں دواں تھا۔ گجرات تو کب گزر چکا تھا مگر کھاریاں جہلم کی بھی خبر نہ ہوئی کہ باہر تاریکی کی گہرائیاں تن کر، ہمارے سارے منظر نگل چکی تھیں۔ اب ہماری دلچسپیاں بس ایک دوسرے کے لیے تھیں۔

لطیفے اور طنز و شیریں واقعے سننا کر، ہمارے منہ بھی تھک چکے تھے۔ اُس پر کل کی فکر نے الگ اعصاب شل کر رکھے تھے کہ ہم جس ”سیاحتی مہم“ پر جانے والے تھے اُس کے منتظمین نے ”شارپ ایٹ اوکلاک“ کی وارننگ دے رکھی تھی۔ اسلام آباد کے ایک جانے مانے ہوٹل کے باہر پاکستان کے طول و عرض سے ”عشاقِ نایم وادی“ نے اکٹھا ہونا تھا اور ہمیں چند ضروری مالی لین دین کے امور سے فارغ ہو کر ساڑھے آٹھ کو بالہ بِل کی جانب روانہ ہونا تھا۔

درمیان میں ملکہ کو ہمارے رمی اور اس کے مضافاتی پہاڑی سلسلہ پہاڑ تھے۔

مگر ہم تو ابھی رات کے اُس سیاہ پہر میں سلسلہ نمکستان یعنی (Salt Range) کے شروعاتی کنارے پر تھے اور ٹرین تھی کہ لاہور کی ”من مرضیاں“ پھر دہرا رہی تھی۔ چوٹی کی چال کو مات دے رہی تھی مگر اب یہ چال..... اُس کی مجبوری تھی کہ پہاڑی چڑھائی اور ایک انجن اتنی لمبی ٹرین کو لئے چل رہا تھا۔

مگر باہر مناظر خوفزدہ کر دینے والے تھے۔ اور نو جوان و نوجوان چہروں سے خوف اور وحشت جھلکتی تھی دل لرزیدہ تھے۔ پھر یلکھت ٹرین نے دو تین جھلکے کھائے اور آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ چند ہی لمحوں میں کئی دروازے کھلے اور لوگ اس سنبھالنے میں مرگشت کرنے لگے۔ ایک دوسرے کو پوچھنے لگے۔ سنی سنائی وجوہات، افواہوں کی صورت گردش کرنے لگیں۔

(جاری ہے)



عطیہ زاہرہ

## نور



”وہ روشنی بھی تھی، وہ روشنی زادراہ بھی تھی، قافلہ بھی اور رہبر بھی، وہ روشنی ہمیں سیدھی منزل تک لے جاتی تھی۔ جب تک ہم نے اس روشنی کی پیروی کی۔ اسے دل و جان سے بڑھ کر چاہا تو ہم کامران تھے اور سر بلند بھی۔“

**ایک قوم کی کٹھا، جس نے اپنے نور کو بھلا کر اندھیروں کو مقدر کر لیا تھا**

تھی۔ ”آدھا دن گزر چکا ہے۔ سورج آسمان کے وسط میں چمک رہا ہے۔ آخر تمہیں نیند کیوں نہیں آ رہی؟ سو جاؤ اب.....!“ ماں نے بچے کو خوفزدہ کرتے ہوئے کہا لیکن بچے کی آنکھوں سے

آدھا دن گزر چکا تھا ایسے میں تھکے ہارے لوگ گھروں کو لوٹ رہے تھے، لیکن ایک ان کا خاندان تھا جہاں زندگی کو اندھیرا بڑھنے کے ساتھ ساتھ جاگنا تھا اور اپنی زندگی کے لیے جدوجہد کرنا



بڑھ کر میں کسی شفاف پانی کے جھرنے میں اپنے چہرے کے خدوخال دیکھ سکوں گا۔ ابو بچ کتنا مزہ آئے گا۔“ بچہ معصوم انداز میں اپنے باپ سے پے در پے سوال کرنے لگا۔ بچے کے سوالات پر باپ نے براز بردست قہقہہ لگایا جس سے اس کا چہرہ مزید بدصورت اور کریہہ ہو گیا۔ جتنے زور سے اس نے قہقہہ لگایا تھا اتنی ہی جلدی قہقہہ مٹم بھی گیا۔ وہ ایک دم خاموش ہو گیا اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ باپ کو خاموش دیکھ کر بچے کی بے چینی بڑھ گئی۔ اب کی بار اس نے اپنے باپ کو باقاعدہ جھنجھوڑ کر کہا ”ابو..... کچھ تو بولے نا، آخر آپ خاموش کیوں ہیں؟ مجھے ڈر لگ رہا ہے“ بچے کے ذہن پر ماں کی ڈراؤنی کہانیوں کا اثر ہونے لگا۔ اس سے پہلے کہ اس کا باپ جواب دیتا۔ اس کی ماں دوبارہ اسے ڈانٹنے لگی ”خاموش کم بخت تو ہمیشہ اپنی عمر سے زیادہ بڑی باتیں کرتا ہے“ بچہ سہم کر اپنے والد کے اور قریب ہو گیا۔ والد نے اس کو چٹایا اور اپنی بیوی سے بولا ”اری نیک بخت بچے کو ڈانٹ کیوں رہی ہو؟ بولے دو، ماشاء اللہ ہمارا بچہ غیر معمولی ذہانت لے کر پیدا ہوا ہے۔ یہ سب سوالات ذہانت کی نشانی ہیں“ اس کے والد نے مسکرا کر فخر سے کہا۔ ”تو پھر بھگتو“ ماں نے غصے میں کروٹ بدل کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ بچہ اب خاموش تھا لیکن اس کی آنکھوں میں لاتعداد سوالات تھے۔ باپ نے اس کو اپنے آپ سے تھوڑا سا الگ کیا اور پھر کہنے لگا ”دیکھو بیٹا! یہ جو ہمارا چمکا دڑوں کا قبیلہ ہے۔ یہ تمام جانداروں میں سب سے کمزور قبیلہ ہے۔ ہمارے لاتعداد دشمن ہیں۔ اس لیے ہم دن کو باہر نکل نہیں سکتے ہیں۔“ ابو میں آپ کی یہ بات نہیں مانتا کیونکہ ہم تعداد میں کسی بھی قبیلے سے کم نہیں ہیں پھر ہم میں دوگنی قوت ہے۔ ہم پرندوں کی

نیند آج کوسوں دور تھی۔ ماں نے جب اپنے لاڈلے کو سونے پر آمادہ نہ دیکھا تو خود کروٹ بدل لی۔ جبکہ بچے نے ماں کی بے زاری محسوس کرتے ہوئے باپ کو متوجہ کیا اور باپ کے قریب ہوتے ہوئے بولا ”ابو..... ابو.....؟“

”جی بیٹا..... کیا بات ہے؟“

”ابو کیا آپ کو بھی نیند آرہی ہے؟“ بچے نے ڈرتے ڈرتے باپ سے سوال کیا۔ تو باپ مسکراتے ہوئے بولا ”بیٹے جن کے تیرے جیسے بچے ہوں ان کے نصیب میں سونا کہاں؟“

”ارے کم بخت سو جا، آخر تو سوتا کیوں نہیں ہے، تیرے جیسی اولاد بھی کسی کی نہ ہو۔ رات ہوتے ہی رزق کی تلاش میں نکلتا ہے، اس لیے چپ کر کے سو جا، مجھے اور اپنے باپ کو بھی سونے دے۔“ اس کے مسلسل سوالات پر ماں نے اسے اچھی خاصی ڈانٹ پلا دی لیکن وہ ماں کی ڈانٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے دوبارہ اپنے باپ سے مخاطب ہوا۔ ”ابو..... ایک بات تو بتائیں؟ جب سارے لوگ حتیٰ کہ جانور اور پرندے بھی دن کو اپنے گھر سے نکلتے ہیں، ٹھوکتے ہیں، پھرتے ہیں، اپنا رزق تلاش کرتے ہیں تو پھر ہم رات کو کیوں نکلتے ہیں؟ آخر ہماری قسمت میں یہ اندھیرے کیوں ہیں؟ ہم آخر روشنی میں باہر کیوں نہیں نکلتے ہیں۔ سارے جانداروں کی روشنی سے اپنا اپنا حصہ وصول کرتے ہیں۔ پھر ہمارا حصہ کہاں ہے؟ ہم اندھروں کی قید کیوں کاٹ رہے ہیں؟ ابو.....

جب میں بڑا ہو جاؤں گا میں دن کی روشنی میں پھولوں کا اصلی رنگ دیکھوں گا میں پرندوں کی آڑان دیکھوں گا۔ میں تتلیاں دیکھوں گا، ابو..... میں دنیا کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھوں گا۔ اب بھی دیکھتا ہوں پھر تو اور زیادہ واضح دیکھ پاؤں گا اور سب سے

## سیارہ ڈائجسٹ کی عظیم الشان پیشکش

## تحفۃ النساء

شائع ہو گیا ہے!

- خواتین اسلام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری پیاری باتیں!
- قرآن و حدیث کی روشنی میں عورتوں کے لئے اسلامی عقائد، ایمان، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، ذکر، تلاوت، وظائف اور دعا کے مفصل احکام!
- اس کے علاوہ ازدواجی زندگی، نکاح، طلاق، خلع، عدت، غیبت، وراثت، توبہ، اخلاق، اولاد کی تعلیم و تربیت کے مسائل اور ان کا حل
- غرضیکہ خواتین کی دینی زندگی سنوارنے کے لئے جامع اور نایاب نسخہ جو ہر مسلمان گھرانے کی ضرورت ہے۔

قیمت 175 روپے

سیارہ ڈائجسٹ 240۔ مین مارکیٹ ریڈاز گارڈن لاہور۔ فون: 37245412

بلند پروازی اب تو یہ سب کچھ قصے کہانیاں ہیں یا تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں کبھی وہ بھی زمانہ تھا کہ یہ راتیں ہماری تھیں یہ دن ہمارے تھے، یہ سورج ہمارا تھا۔ بیٹے! روشنی کے علاوہ قدرت نے ہر جاندار کو ایک اور بھی روشنی دے رکھی ہے تمام جانداروں کے پاس اپنی اپنی جو روشنی تھی۔ اس میں ہماری روشنی سب سے پر نور تھی۔ ہمارے پاس تو ایسی روشنی تھی کہ اس روشنی سے سارا جہاں منور تھا۔ جہاں کا تو صرف ظاہر روشن تھا جبکہ ہمارا باطن منور تھا۔ اگر وہ روشنی ان کے لیے بصارت بن گئی تھی تو ہمارے لیے بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت بھی تھی کیونکہ وہ ہماری اپنی تھی۔ اس روشنی میں ہم راہیں متعین کرتے تھے۔ اس میں سفر کرتے تھے، وہ روشنی بھی تھی، وہ روشنی زاد راہ بھی تھی، قافلہ بھی اور رہبر بھی، وہ روشنی ہمیں سیدھی منزل تک لے جاتی تھی۔ جب تک ہم نے اس روشنی کی پیروی کی۔ اسے دل و جان سے بڑھ کر چاہا تو ہم کامران تھے اور سر بلند بھی۔

”تو پھر کیا ہوا؟“ بچے نے بے چینی سے سوال کیا۔ سوال سننے ہی اس کے جسم نے جھٹکا کھایا، جیسے سانپ نے کاٹ لیا ہو۔ ”ہاں..... ہاں..... بیٹے!“

”ہوا یہ کہ ہمیں بد قسمتی سے اپنی ہی روشنی بری لگنے لگی۔ ہم اپنی ہی روشنی سے ڈرنے لگے۔ حیوان اور بہانوں سے فرار کے راستے ڈھونڈنے لگے۔ ہم اس روشنی کو چاہتے ہوئے بھی اس سے آنکھیں چرانے لگے۔ اپنی روشنی کے ہوتے ہوئے بھی ہم دوسروں سے روشنی مانگنے لگے۔ اس بیگانگی روشنی میں طلسماتی چمک تو تھی مگر اس میں دائمی پن نہ تھا۔ وہ روشنی صرف روشنی تھی۔ نور نہیں تھا بیٹے! تم ابھی چھوٹے ہو، تمہیں عام روشنی اور نور کا فرق معلوم نہیں، بلکہ ایک تم کیا؟ ہمارے بڑے بھی روشنی اور

طرح اُڑ بھی سکتے ہیں اور ہمارے کسی کتے بلکہ بھیڑیے جیسے تیز اور مضبوط دانت بھی ہیں۔ ہم سے کئی گنا کمزور قبیلے تو دن میں اُڑتے ہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی چڑیاں یہ حشرات تو ہم سے بہت ہی حقیر ہیں۔ انہیں تو کوئی کچھ نہیں کہتا۔“ بچہ آج باپ کو زوج کرنے پر تلا ہوا تھا۔ ”بیٹے تمہاری ماں سچ کہتی ہے تمہارے پیٹ میں داڑھی موٹھ ہی نہیں، دانت بھی ہوں گے۔“ باپ نے مسکراتے ہوئے کہا ”ابو کہیں یہ بات تو نہیں کہ ہم بہت بد صورت ہیں اور شرم کے مارے دن میں نہیں نکل سکتے۔“ بچہ باپ کے بولنے سے پہلے بول پڑا۔ ”بیٹے آخر کیوں ضد کر رہے ہو؟ آخر تم سچ کیوں سننا چاہتے ہو؟ بعض سچ جاننے سے نہ جانتا بہتر ہے۔“ بچہ بولا ”ابو میں سچ سننا نہیں چاہتا، بلکہ مجھے سچ جاننے کی ضرورت ہے؟“

”کیوں میرے زخموں کے کرندوں کو نوچ رہے ہو، اگر سننا چاہتے ہو، تو پھر پوری کہانی سنو! یہ جو تم اپنے آپ کو بد صورت کہہ رہے ہو، ہم شروع سے ایسے نہ تھے۔ ہم خوب صورت ہوا کرتے تھے۔ ہماری پیدائش کے بعد ہمارے حسن کے دم سے یہ دنیا حسین تر ہو گئی تھی۔ یہ جو ہماری کریمہ اور بدشگلیں ہیں، بیٹے! یہ تو ہمارے اعمال ہیں۔“ اس کے باپ کا لہجہ بڑا دلخراش تھا ”تو اب کیا ہم پہلے روشنی میں اُڑا کرتے تھے“ بچے نے بے قراری سے کہا۔ ”میں نے ایک بار تمہیں منع کیا ہے نہ کہ درمیان میں مت بولو“ یہ کہہ کر وہ کسی اور دنیا میں کھو گیا۔ بلکہ وہ کسی مجذوب کی طرح خود کلامی کر رہا تھا۔ اس کے ایک ایک لفظ سے ڈکھ چمک رہا تھا۔ وہ جذب کی کیفیت میں بولنے لگا ”روشنی..... ہاں روشنی دن کا اُجالا چمکتا سورج“ مہکتے اور رنگین پھول، حسین نظارے، بھومتے گرجتے اور برستے بادل، یہ بیکراں فضاء، اس فضاء میں ہماری

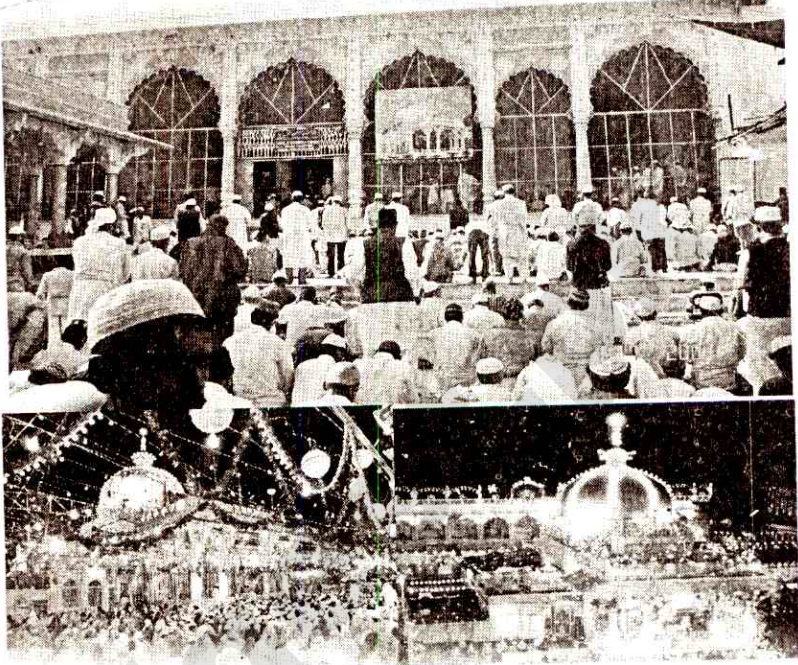


تھے کہ کب ہم اپنے یہ ہتھیار رکھ دیتے ہیں۔ عزت، غیرت، شجاعت اور خودی جیسی صفات سے محروم ہوتے ہی وہ ہم پر چڑھ دوڑے اور ہم اپنی آزادی بھی کھو بیٹھے۔ ڈرتے گئے اور بزدل ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ہم سے دن کی روشنی چھین لی گئی اور ہم اندھیروں کے باسی بنا دیئے گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ دن کی روشنی ہم سے دُور کر دی گئی اور ہم..... اس کے والد کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو زمین پر گرے اور زمین میں جذب ہو گئے کیونکہ وہ اب بھی اُلٹا لٹک رہا تھا ”لیکن ابو بڑا ہو کر میں دن کو اُڑوں گا“ بچہ سحر زدہ سا ہو کر والد سے کہانی سن رہا تھا اچانک بول اٹھا ”ہاں..... ہاں..... میرے بچے تم دن کو اُڑنا چاہتے ہو اور مجھے امید ہے کہ ہماری آئندہ نسلیں ایک بار پھر دن میں اُڑا کریں گی۔ ہماری ہی بدہیئت اور جسمانی ساخت ایک بار پھر ضرور تبدیل ہو گی مگر اس کے لیے تمہیں چاہیے کہ وہ نور والی روشنی پہلے اپنے اندر جذب کر لو یا اس روشنی میں فنا ہو جاؤ اس لیے اپنی روشنی ساتھ رکھو ورنہ تیز روشنی تم کو جلا دے گی۔ اگر تمہاری اپنی روشنی ساتھ نہ ہوگی تو دوسروں کی روشنی تمہیں اندھا کر دے گی۔ جلا کر بھسم کر دے گی۔ اگر دن کی روشنی کو قابو کرنا ہو، تو اپنے اندر وہ نور والی روشنی سمیٹ لو“۔

”ابو اب تو میری آنکھوں سے نیند ہمیشہ کے لیے روٹھ گئی ہے جب تک میں اپنی روشنی پا کر رات کو نہ سولوں“ بچے نے یہ کہہ کر کروٹ بدلی اور کل کے سہانے تصور میں کھو گیا۔ جہاں اس کا اپنا نور ہر سو پھیل رہا تھا اور اس نور میں وہ سب سے زیادہ خوبصورت نظر آ رہا تھا۔

نور میں تمیز نہیں کر سکتے، بس تم یوں سمجھو کہ دوسروں کے پاس سیارے تھے، تو ہمارے پاس کائنات کا سب سے عظیم پر تور روشن ستارہ تھا بلکہ وہ ستارہ آج بھی پورے آب و تاب سے چمک رہا ہے۔ اس کی جان فضاء قوت بخش، سکون بخش اور فرحت بخش ضیاء ہر سو پھیلی ہوئی ہے۔ مگر افسوس کہ ہم کور چشم ہو چکے ہیں۔ ہم اس روشنی سے محروم ہیں۔ ”ابو آخر ہمیں اپنی ہی روشنی کیوں بری لگنے لگی ہم اس سے کیوں خوف زدہ تھے؟“ بچے نے ایک بار پھر درمیان میں ٹانگ اڑائی۔

”بیٹے..... منافقت، صرف اور صرف منافقت..... شروع میں ہم بہت سیدھے سادے تھے، سادگی اور سچ میں ہماری برتری تھی، ہماری قوت تھی، ہم دو اور دو چار والے لوگ تھے، ہم سب سے پہلے سادگی ہم سے چھوٹ گئی، ہم تکلفات اور خرافات میں پڑ گئے۔ ہم اپنے درمیان اپنی ہی نسل میں چھوٹے اور بڑے تلاش کرنے لگے۔ ہم طمع ساز بن گئے۔ اسی نفاق سے ہماری ہوا اکھڑ گئی، ہم جھوٹے ہوتے گئے تو چھوٹے ہو گئے۔ ہماری شکلیں بدلنے لگیں ہم بد صورت بننے لگے۔ ہماری روشنی جھوٹ کو برداشت نہیں کر سکتی، یہ تو وہ آئینہ ہے جس میں اصلی شکل ہی نظر آتی ہے۔ لہذا ہم اس روشنی اور آئینے سے ڈرنے لگے اور ہم دوسروں سے روشنی مانگنے لگے۔ ہم ہر بھکاری کی طرح یہ سمجھ رہے تھے کہ ہمیں دوسروں سے روشنی مفت مل رہی ہے۔ مگر اس جہاں میں کوئی بھی چیز مفت نہیں ملتی، ہر مانگی ہوئی چیز کے بدلے میں عزت، غیرت، خودی اور آزادی دینی پڑتی ہے۔ شاید ہمارے جہاں کے تمام پرندے، درندے یہاں تک کے چرند بھی اس انتظار میں



## خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ

سلطان الہند خواجہ معین الدین اجمیریؒ جو برصغیر کے عوام کے دلوں پر  
خواجہ غریب نوازؒ کے نام سے حکمرانی کرتے ہیں!

اور دوسرے خواجہ معین الدین اجمیریؒ۔  
اورنگ زیب عالمگیر کی مقبولیت دہر و لعزی کے  
بارے میں لارڈ کرزن کا کہا بچ ہو یا نہ ہو لیکن اس میں  
کوئی کلام نہیں کہ حضرت معین الدین چشتیؒ کی مقبولیت  
کے بارے میں اُس کا قول حرف بحرف حقیقت ہے۔  
سلطان الہند خواجہ معین الدین اجمیریؒ جو برصغیر

دور غلامی میں ہند کا برطانوی وائسرائے لارڈ  
کرزن کہا کرتا تھا کہ ”میں نے اپنی زندگی میں  
دو ایسے بزرگ دیکھے ہیں جو اپنی وفات کے بعد بھی  
لوگوں کے دلوں پر اس طرح حکمرانی کر رہے ہیں کہ  
جیسے یہ نفس نفیس اُن کے درمیان موجود ہوں۔ اُن  
میں سے ایک مغلیہ حکمران اورنگ زیب عالمگیر ہے



کرتے ہوئے ادب سے بولا:-

”حضرت! انور نوش فرما کہ اس خادم کو شرف بخشیں۔“

قلندر نے ایک نگاہ نوجوان پر ڈالی جس میں نہ جانے کیا تاثیر تھی کہ وہ بے خود سا ہونے لگا۔ بزرگ نے اُس کے بڑھے ہاتھوں سے انکوروں کا خوشہ لیا اور چند انگور توڑ کر کھالیے۔ نوجوان وہیں عقیدت سے اُن کے سامنے بیٹھ گیا۔ پھر اُس بزرگ نے اپنی بھل سے کوئی چیز نکالی۔ کچھ خود چبائی اور باقی جو بچی وہ نوجوان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے ”لے لو بھی کھا۔“

نوجوان جھوٹی چیز کو بے چوں دھالے کر کھانے لگا۔ نہ جانے وہ شے کبھی گئی کہ جس کا حلق سے اُترتا ہی تھا کہ نوجوان کی دنیا ہی بدل گئی۔ وہ باغ جو کل تک اُسے اپنے درخشاں مستقبل کا امین نظر آتا تھا خاردار جھاڑیوں سے زیادہ اہم نہ لگا۔ ہر چیز حقیر سی نظر آنے لگی۔ طبیعت میں ایک بے چینی سی پیدا ہو گئی۔ دل عشق الہی اور رسول کی محبت سے معمور ہو گیا۔ نگاہوں میں دنیا کی ہر چیز حقیر لگی۔ قلندر تو اپنا کام کر کے چتا بنا، نوجوان کا سکون غارت ہو گیا۔ دل ہر چیز سے اُچاٹ ہوا تو سب کچھ چھوڑ کر تحصیلِ علم اور راہِ نجات کی خاطر سرِ قد و بخارا کی راہ لی۔ قرآن حفظ کیا۔ ظاہری علوم حاصل کیے پھر دل تو آتش سوزاں میں اسی بُری طرح پھنکنے لگا کہ کسی ہل چھین نہ رہا جب کچھ علم نہ تھا تو سب ٹھیک تھا۔ جب علم حاصل ہوا تو طبیعت میں ایک بے نام سی بے چینی بڑھ گئی۔ راہِ نور دی عشق کی تلاش تھی۔ مردِ کامل کی رہنمائی چاہتے تھے۔ مردِ کامل کی تلاش میں کوچہ گردی و صحرا گردی شروع کر دی۔

جگہ جگہ کی خاک چھانٹتا ہی نوجوان جب نیشاپور کے نزدیک ایک بستی ہارون (جسے لوگ ہارون بھی کہتے ہیں) میں داخل ہوا تو اس جگہ سوختہ کو وہاں ایک ایسے مردِ کامل مل ہی گئے جو فضل و کمال میں

کے عوام کے دلوں پر خولِ غریب نواڑ کے نام سے حکمرانی کرتے ہیں۔ ایک فضل و کمال میں یکتا قطب الشیخ بزرگِ کامل درویش تھے۔ عمر کے پہلے پندرہ سولہ سال کا عرصہ اپنے حال میں مست و سرشار ہو کر گزرا۔ نہ حال پر نظر نہ مستقبل کی فکر۔ باپ فوت ہو چکا تھا، منزل مقصود میں تھے۔ لہذا باپ کا چھوڑا ہوا ترکہ، جو کہ ایک باغ اور پن چکی پر مشتمل تھا، کو سنبھالا۔ صبح سے شام تک باغ کی نگہداشت کرتا۔ پرندوں سے پودوں کو بچانا یا پھر پن چکی سے کام لینا یہی مشاغل تھے یہی روزگار تھا۔

ایک دن معمول کے مطابق باغ کے درختوں کو پانی دے رہے تھے۔ سورج سوائیزے پر تھا۔ سخت گرمی میں، سخت مشقت کے اس کام سے جسم پسینہ پسینہ ہوا جا رہا تھا۔ چہرہ دھوپ کی تمازت سے سرخ تھا۔ اپنے آپ میں مَن دل جی سے کام میں مشغول تھے کہ اچانک مردِ قلند، نام جن کا ابراہیم قدوزی تھا، باغ میں داخل ہوئے۔ نوجوان کو باغ کی نگہداشت میں یوں جو مصروف پایا تو چہرے پر ہلکا سا تبسم پھیل گیا۔ پھر چپ چاپ خاموشی سے ہی ایک درخت کے سائے میں بیٹھ کر غور سے اُسے دیکھنے لگے۔ اچانک نوجوان کی نظر شہر کے مشہور قلندر پر پڑی تو سب کام چھوڑ کر فرطِ محبت و عزت و احترام سے آگے بڑھ کر آداب سے سلام کیا۔ ابراہیم قدوزی نے قلندرانہ انداز میں جواب دیا اور پھر اُسی خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ جس طرح باغ میں داخل ہوئے تھے۔ نوجوان قلندر کی معراج سمجھتا تھا۔ تصوف کی اصطلاح میں قلندر اسے کہتے ہیں جو تصوف میں مہمتی ہوتا ہے۔ نوجوان کم عمر تو تھا لیکن اتنا کم علم نہیں۔ وہ قلندر کے مرتبے کو کچھ نہ کچھ تو جانتا ہی تھا۔ سو دوبارہ پلٹا، انکوروں کی تیل سے ایک رس بھرنا خوشہ انکوروں کا توڑ کر فرطِ عقیدت سے بزرگ کی خدمت میں پیش



کر مرشد کی طرف دیکھا، جو مسکراتے ہوئے مرید کا بغور مطالعہ کر رہے تھے اور اس کی کیفیت میں یہ حیرانگی کا تغیر دیکھ کر لطف اندوز ہو رہے تھے۔ نو جوان کو یوں جو حیران و پریشان اپنی سمت دیکھتا پایا تو اپنی دو انگلیوں کے درمیان میں فاصلہ پیدا کر کے اُس کی جانب بڑھایا اور حکم دیا ”اب ان انگلیوں کے درمیان فاصلے میں دیکھ۔“

اب جو نو جوان نے انگلیوں کے درمیانی حصہ میں دیکھا تو انگشت بدن ادا رہ گیا۔ اس کے سامنے ایک عجیب و غریب منظر تھا جسے مادرائے عقل و گمان ہرگز تسلیم نہ کر سکتی تھی مگر یہ حقیقت تھی کہ وہ اپنی ہی دنیا جیسی ہزار ہا دنیاؤں کو ان انگلیوں کے درمیانی فاصلے پر دیکھ رہا تھا۔ نو جوان سراپمہ ہو کر بولا ”حضرت..... یہ کیا ہے؟“

عثمانؓ نے کہا ”بس..... اب تیرا کام ختم ہوا اور یہ جو تم نے ابھی دیکھا اٹھارہ ہزار وہ دنیا میں تھیں جن کا ابھی انسان کو علم نہیں۔“ اس کے بعد یہ نو جوان مرید عثمانؓ ہاروٹی کا ہی ہو کر رہ گیا۔ شب و روز آپ کی صحبت میں گزارا کرتا۔ ظاہری و باطنی علوم کا حصول انہی کے طفیل تھا۔ سوغت کا یہ حال تھا کہ آگے مرشد ہوتا اور پیچھے سعادت مند نو جوان مرید۔ نو جوان مرید کی یہ سعادت مندی دیکھ کر عثمانؓ ہاروٹی نے ایک دن فرمایا۔

معین الدین محبوب خدا است  
و مرا فخر است بر مریدی او  
بہی معین الدین آگے چل کے خواجہ معین الدین  
چشمی کہلائے۔

کچھ عرصہ کے بعد آپؐ کے دل میں روضہ رسولؐ کی زیارت کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ مدینہ کے لیے روانہ ہوئے۔ مزار اقدس پر حاضری دی۔ ابھی مدینہ میں ہی تھے کہ خواب میں رسول اللہؐ سے شرف ملاقات حاصل ہوا۔ آپؐ خواجہ غریب نواز کو خواب

فائق ترین تھے۔ یہ عثمانؓ ہاروٹی تھے۔ وہ نو جوان اب دن رات اُن کی صحبت میں رہنے لگا۔ آخر ایک دن بے تاب ہو کر عثمانؓ ہاروٹی سے گویا ہوا ”حضرت اب ضبط کا یا ر انہیں رہا۔ خادم کو شرف بیت سے نوازنے کا کرم فرمائیے۔“

عثمانؓ ہاروٹی نے شفقت سے پاس بٹھایا اور سینے سے لگا کر فرمانے لگے ”جا..... اب جا کر وضو کر کے آ اور دو رکعت نماز ادا کر۔ نو جوان جو شرف بیعت کے حصول کے لیے بیتاب تھا فوراً حکم کی تعمیل کے لیے اُٹھا اور جیسا کہا حکم بجالایا۔ عثمانؓ ہاروٹی نے نو جوان کو دیکھا جو پھرتی سے اُن کے ارشاد حکم کی تعمیل کے بعد مزید ہدایات کا منتظر تھا۔ دوبارہ حکم دیا کہ جاؤ قبلہ رو ہو کر سورۃ البقرہ پڑھو۔ اس حکم کی تعمیل کے بعد نو جوان پھر آن حاضر ہوا۔ اب کے ایس بار درود شریف پڑھنے کا حکم جاری ہوا۔ جب نو جوان اس سے بھی عہدہ برآہ ہو گیا تو عثمانؓ ہاروٹی نے اس نو جوان کا ہاتھ تھاما اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا ”آج سے تجھے اللہ کے سپرد کیا۔“ پھر نو جوان کے بڑھے بال تراشے سر پر کلاہ رکھی اور حکم دیا ”اب سورۃ اخلاص کا ہزار بار ورد کر اور پھر ایک دن ایک رات مجاہدے میں گزار کر ہمارے پاس آنا۔“

مطیع اور فرمانبردار نو جوان بزرگ کامل کے حکم کے مطابق واپس اسے ٹھکانے پہنچا اور پورے خشوع و خضوع کے ساتھ حکم کی تعمیل میں مشغول ہو گیا اور پھر عثمانؓ ہاروٹی کی خدمت میں آکر عقیدت سے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ مرشد نے گہری نظروں سے مرید کا جائزہ لیا۔ کچھ دیر اسے دیکھتے رہے پھر حکم دیا ”اوپر دیکھ، اوپر دیکھا تو نظریں درمیان میں حائل و سعتوں کو عبور کرتی جن حدود میں پہنچیں وہ یہ نو جوان بیان نہ کر سکا گھبرا کر نیچے دیکھا تو نظریں تخت اٹھ لی میں اُترتی چلی گئیں۔ نو جوان نے گھبراتے ہوئے حیرت زدہ ہو

حکمرانوں نے ہندوؤں کے ساتھ لاتعداد جنگیں لڑیں مگر کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

خواب معین الدین چشتی جن دنوں ہندوستان پہنچے، اُن دنوں مشہور راجپوت حکمران پرتھوی راج اپنی دو لاکھ سپاہ اور تین ہزار ہاتھیوں کے بل بوتے پر مسلمان حاکم شہاب الدین غوری کی بارہ ہزار سپاہ کو شکست دے کر قرائن کے محاذ پر کامیابی حاصل کر چکا تھا اور اس کامیابی کے نشے میں بدست وہ کسی پھرے ہوئے ہاشی کی طرح ہندوستان میں نشہ کبر و پندار میں دغتا پھرتا پھرتا تھا۔

خواب معین الدین چشتی نے ہندوستان کی سرزمین پر پہلا قدم رکھتے ہی جس دربار میں سب سے پہلے حاضری دی وہ گنج بخش علی جوہری کا مزار اقدس تھا۔ یہاں آپؒ نے چلہ شی کی اور پھر ملتان تشریف لے گئے۔ ملتان جو اُن دنوں ہندوستان میں علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ آپؒ نے وہاں ہندوستان میں بولی جانے والی معروف زبانیں سیکھیں۔ کچھ عرصہ ملتان میں قیام کے بعد آپؒ دلی تشریف لے گئے اور پھر اجیر کا رخ کیا۔

اجیر اُن دنوں ہندوستان میں بڑی اہمیت کا شہر تھا۔ یہ پرتھوی راج کی حکومت کی راج دھانی تھی۔ اجیر میں داخل ہوتے ہی آپؒ نے جس جگہ کو اپنے قیام کے لیے پسند فرمایا وہ اتفاق سے پرتھوی راج کے اونٹوں کی جائے قیام تھی۔ پرتھوی راج کے ساربانوں نے جب ایک مسلم کو اپنے راجہ کی زمین پر یوں قبضہ کر کے بیٹھے دیکھا تو انھیں ٹوکنے لگے کہ وہ اس جگہ کو چھوڑ دیں۔ خواب صاحبؒ نے بے نیازی سے جواب دیا ”بھائیو! اتنا بڑا میدان ہے تمہارے راجہ کے اونٹ کہیں بھی بیٹھ سکتے ہیں۔ پھر مجھ غریب کو کیوں تنگ کرتے ہو؟“ مگر وہ ساربان مسلسل ضد میں کہتے رہے کہ ہمیں اگر راجہ کو علم بھی ہو گیا کہ ایک

میں ہندوستان کی طرف جانے کی ہدایت فرماتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ”معین الدین ہم نے تمہیں اللہ کی رضا و منشا سے سلطان الہند مقرر کیا ہے اب تم اپنے مرشد سے ہندوستان جانے کی اجازت حاصل کر کے وہاں چلے جاؤ۔“

اگلے دن خواب چشتی نے اپنا یہ خواب عثمان ہاروٹی کو سنایا۔ عثمان ہاروٹی کو بھی خواب میں اسی قسم کی ہدایت مل چکی تھی۔ سو انہوں نے بعد خوشی اجازت دی۔ عثمانؒ نے جن کا چہرہ اپنے مرید کی اس عزت افزائی سے خوشی سے تمنا رہا تھا خواب سے کہا ”تم نے ہندوستان نہیں دیکھا، ذرا آنکھیں بند کرو تاکہ تمہیں اس اجنبی سرزمین کی سیر کر سکیں۔“

حضرت خوابؒ نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے مرشد عثمانؒ کے فیض روحانی سے ہندوستان کے ان مقامات کو دیکھا جہاں آپؒ کو تشریف لے جانا تھا۔

ہندوستان اُس زمانے میں دنیا بھر میں بُت پرستی کا سب سے بڑا گہوارہ تھا۔ کفر کے اندھیروں میں ڈوبی اس سرزمین پر اگرچہ اسلام کی روشنی خواب چشتیؒ سے پہلے پہنچ چکی تھی مگر ابھی تک اسلام کو وہ غلبہ حاصل نہ ہوا تھا جو ہونا چاہیے تھا۔ سلطان محمود غزنوی جو آندھی و طوفان کی طرح ہندوستان کے باطل خداؤں اور ان بُت پرستوں پر خدا کے قہر کی طرح ٹوٹا تھا اور جس نے کفر کی سرزمین پر اسلام اور بُت پرستی کا عظیم الشان معرکہ سومات کے علاقہ میں جیتا تھا اب اس دنیا میں نہیں تھا۔ اُس کی اولاد نے باپ کی فتوحات کو بیخ طور پر نہ سنبھالا اور محمود غزنوی جس کے دم قدم سے ہندوستان کے بُت پرستوں کے کلیجے کا پتے تھے اس کے منظر سے ہٹتے ہی ہندوؤں نے پھر پر نکالنا شروع کر دیئے اور جلد ہی وہ غزنی کی مسلمان سلطنت کے دائرہ سے اپنا بڑا حصہ نکال سکنے میں کامیاب ہو گئے۔ بعد کے مسلمان

اونٹ میدانوں میں کھڑے تھے۔ اس واقعہ کے بعد خواجہ معین الدین چشتی کی شہرت علاقہ بھر میں پھیل گئی۔

اتاساگر جہاں خواجہؒ نے اپنا نیا ٹھکانہ بنایا تھا۔ اس جگہ ہندوؤں کے لاقعدا مندرتھے۔ یہ جگہ انادیو نامی راجہ نے بنوائی تھی۔ خواجہ صاحبؒ نے اسی جگہ کو اپنی تبلیغ کے لیے منتخب کر لیا اور یہیں بیٹھ کر کفرستان میں نور حق سے اُجالا کرنے لگے۔ آپؒ کی پُراثر تبلیغ اور پھر دین حق کی کرامات سے اردگرد کے لوگ جو ق در جو ق مسلمان ہونے لگے۔ یہ صورتحال دیکھ کر علاقے کے پنڈتوں سمیت عام متعصب ہندوؤں میں تہلکہ مچ گیا اور انہوں نے پرتھوی راج کو اس کے خلاف کارروائی کے لیے آمادہ کرنا شروع کیا۔

پرتھوی راج میں اتنی عقل تو بہر حال تھی ہی کہ وہ ایک مسلمان صوفی سے بھگوانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ عیار ذہن کا شخص تھا اُس نے سوچا یہ مسلم صوفی جو کرامات دکھاتا ہے ان کا مقابلہ کسی ایسے ہی بندے سے کروانا چاہیے۔ اس نے اس سلسلے میں اجیر کے سب سے بڑے مہنت رام دیو کو حکم دیا کہ ”جا اُن درویش اور اُن کے مریدوں سے مل۔ یہ لوگ تو مجھے جاسوس سامان دکھائی دیتے ہیں، پرنتو ایسا نہ ہو کہ ہم غفلت میں مارے جائیں اور یہ اسلامی راج کی راہ ہموار کر کے چلتے بنیں۔ ٹو جا انھیں ٹول اور کسی طرح اجیر سے بھی نکال دے۔ اگر طاقت بھی استعمال کرتا پڑے تو اوش کرنا۔“

رام دیو پنڈتوں اور پجاریوں کے ایک جھوم میں بڑی شان سے گردن اکڑائے خواجہؒ کے آستانے کی طرف بڑھا اور جیسے ہی ان کے رو برو پہنچا، خواجہؒ نے اپنی ایک ہی نگاہ اُن پر ایسی ڈالی کہ اس بزرگ کامل کی نگاہ کو باطل کا جھٹکا ہوا نہ سکا اور اگلے ہی لمحے اس غول کا سردار رام دیو مہنت آپؒ کے قدموں میں

”بے دین“ اُس کی زمین پر ڈیرا جمائے بیٹھا ہے تو نجانے وہ کیا کر ڈالے۔ آخر جب ساربان حد سے زیادہ بڑھنے لگے تو خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اُس جگہ سے اُٹھتے ہوئے ساربانوں کو مخاطب کیا ”لو بھی ہم تو اُنھ کے جارے ہیں تم بٹھا لو اب اپنے راجہ کے اونٹوں کو مگر خدا معلوم وہ بھی ہماری طرح اُنھ سکیں گے یا نہیں۔“ آپؒ تو یہ کہہ کر اُنھ کے چل پڑے اور ساربان آپؒ کی بات کے مفہوم سے نا آشنا اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

حضرت خواجہؒ نے اپنے ساتھیوں سمیت اتاساگر نامی جگہ پر جا کر قیام کیا جو بعد میں اولیاءِ مہجد کے نام سے مشہور ہوئی۔ ادھر مہاراجہ پرتھوی راج کے اونٹ میدان میں ایسے بیٹھے کہ اُنھنا ہی بھول گئے۔ لوگوں کے ہاتھ ایک عجیب تماشا لگ گیا۔ شہر بھر کے لوگ میدان میں اکٹھے ہو گئے اور شاہی ساربانوں کی اُن مٹھکے خیز کوششوں کو دیکھنے لگے جو وہ اونٹوں کو اُنھانے کے لیے کر رہے تھے۔ راجہ کو بھی خبر ہو چکی تھی۔ سو وہ بھی موقع پر پہنچ گیا جب کسی طور پر بھی اونٹ اپنی جگہ سے نہ ہلے تو بالآخر ساربانوں کو حضرت خواجہؒ کے الفاظ یاد آ گئے جو انہوں نے میدان سے اُٹھتے ہوئے کہے تھے۔ انہوں نے ڈرتے ڈرتے مہاراجہ سے ذکر کیا۔ پرتھوی راج یہ سن کر جہاں حد سے زیادہ خوفزدہ ہو گیا وہیں ساربانوں پر بھی آنکھیں نکالیں اور کہنے لگا جاؤ انہی بزرگ سے جا کر معافی مانگو اور عزت و احترام سے اُن کی جو خواہش ہو پوری کرنا۔ ساربان کانپتے کانپتے آپؒ کے پاس پہنچے اور آپؒ کے قدموں میں گر کر معافی کے طلبگار ہوئے۔ آپؒ نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا ”تمہارے راجہ کے اونٹ اُنھ کھڑے ہوئے ہیں اب کیا تم بیٹھنا چاہتے ہو، جاؤ..... جا کر اپنا کام کرو“ ساربان گھبرا کر کھڑے ہوئے اور میدان کی طرف دوڑ لگا دی۔ یہاں واقعی



نام لینے والی تھی۔ بالآخر تکلیف کی شدت سے عاجز آکے جے پال فوراً مرگ چھالہ سمیت زمین پر اتر اور آپؐ کے قدموں میں گر کر اعتراف شکست کیا۔ ساتھ ہی اسلام قبول کرنے کا خواہش مند ہوا۔ خواجہ غریب نواز نے اُسے معاف کرتے ہوئے مسلمان کیا اور اسلامی نام عبداللہ رکھا۔

جے پال کے مسلمان ہوتے ہی لوگوں نے جوق در جوق اسلام قبول کرنا شروع کر دیا اور وہ بہتی جہاں کبھی مندروں کی کھنٹیاں گونجا کرتی تھیں اب اذان کی آواز سے فیض یاب ہونے لگی۔ پرتھوی راج اس صورتحال سے بہت جربز ہوا۔ بہت دفعہ اس نے چاہا کہ خواجہ صاحبؒ کے خلاف کوئی سخت قدم اٹھائے لیکن پھر اُس کی ماں آڑے آجاتی اور اسے سمجھاتی کہ ان بزرگوں سے مت الجھو۔ ان کے پاس ماورائی طاقتیں ہیں۔ ہم تم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ہاں ان سے چھیڑ خالی کر کے اپنا آپؐ تباہ و برباد کر سکتے ہیں۔ پرتھوی راج کی باتوں کو اچھی طرح سمجھتا تھا اور اُسے یہ احساس بھی تھا کہ ماں کے دلائل حقیقت پر مبنی ہیں مگر جے پال اور پھر ہندوؤں کی کثیر تعداد کا مسلمان ہونا ایسا امر نہ تھا کہ وہ اسے آسانی سے بھلا پاتا۔ چنانچہ اس نے پھر ایک منصوبہ بنایا اور ایک شخص کو خواجہؒ کے پاس اسلام قبول کرنے کے بہانے بھیجا اور ساتھ ہی ہدایت کی کہ موقع ملے ہی آپؐ کو زہر دے دے۔ وہ شخص انعام کے لالچ میں اسی وقت آپؐ کے دربار میں حاضر ہوا اور اسلام قبول کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

آپؐ نے اُس پر ایک کڑی نگاہ ڈالی اور ناراض ہوتے ہوئے کہا ”بد بخت تجھے اسلام سے کیا غرض، تیری جو تمنا ہے وہ پوری کر اور چلتا بن“ یہ سن کر اُس شخص کی قہر قہری چھوٹ گئی اور رو رو کر آپؐ سے معافی مانگنے لگا ساتھ ہی اُس نے دین حق کو قبول

کر اسلام کی امان میں آنے کیلئے رو رہا تھا۔ آپؐ نے اُسے حلقہ اسلام میں لانے کے لیے کلمہ توحید پڑھایا اور اُس کا نام شادی دیور رکھ دیا۔

رام دیو کے مسلمان ہوتے ہی ہندوؤں اور خود راجہ کے دل میں آپؐ کا خوف جڑ پکڑ گیا۔ ہندوستان میں شعبہ بازی عام تھی۔ وہ لوگ آپؐ کو بھی ایک ساحر سمجھنے لگے اور خیال کرنے لگے کہ آپؐ اپنی انہی ساحرانہ قوتوں کے بل بوتے پر ہندوؤں کو مسلمان کر رہے ہیں چنانچہ راجہ نے سوچا جس طرح زہر کا تریاق ہوتا ہے اسی طرح اس مسلمان ساحر کے مقابلے میں کوئی ساحر ہی لانا چاہیے تاکہ لوہا لوہے کو کاٹ سکے۔ اس زمانے میں اجمیر اور اُس پاس کے علاقوں میں جے پال نامی ساحر کا بڑا چرچا تھا۔ راجہ نے اسے فوراً اجمیر طلب کیا اور خواجہ غریب نوازؒ کے مقابلے کے لیے آمادہ کرنے لگا۔ بدی کا یہ بیٹا جانتا نمونہ جے پال تو خوش ہی ایسے شیطانی کاموں سے ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ جھٹ تیار ہوا اور اس شان سے مقابلے کے لیے نکلا کہ خود تو مرگ چھالے پر سوار ہوا میں اڑتا پھر رہا تھا اور چیلے گرو کے نیچے درندوں پر سوار خواجہؒ کی سرکوبی کے لیے کمر بستہ..... ہو کر جا رہے تھے۔ خواجہ غریب نوازؒ نے انھیں دیکھا تو اپنے ساتھیوں کو اُن کے شر سے بچانے کی خاطر ایک حصار بھیج کر اس میں محفوظ کر لیا۔ اب جے پال اور اس کے چیلے اپنے ہتھکنڈوں سے پورا زور صرف کرنے لگے کہ کسی طرح اس حصار کو توڑ دیں مگر کامیاب نہ ہو سکے جب اُن کا زور کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تو خواجہ غریب نوازؒ نے اپنی کھڑاؤں اتاری اور ہوا میں اُچھال دی۔ کھڑاؤں ہوا میں بلند ہوتی گئی یہاں تک کہ جے پال کی کھوپڑی اس کی پہنچ میں آگئی۔ چنانچہ عین جے پال کے سر پہنچ کر کھڑاؤں نے منڈ لانا شروع کر دیا اور جے پال کے سر پر پڑیں لگانے لگی۔ جے پال نے ہر ممکن کوشش کی مگر کھڑاؤں کی کھڑاؤں کہاں نہ کتنے

اظهار کیا اگرچہ بعد میں انہوں نے اسے مسلمان تو کیا لیکن پہلے انکار کر کے راجہ کی اہانت ضرور کی۔ چنانچہ وہ اور ان کے رفقاء اسی وقت اجمیر کی حدود چھوڑ کر چلے جائیں۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اس حکم پر ذرا بھی توجہ نہ دی اور ایک شان بے نیازی سے گویا ہوئے ”تین دن کی بات ہی کیا ہے جو ہوتا ہے ہو کر رہے گا۔“ مہاراجہ کا اپنی اس گول مول جواب کو لے کر جب پرتھوی راج کے سامنے پہنچا تو راجہ بھی اس کا مفہوم نہ سمجھ سکا لیکن دل میں خیال کرنے لگا کہ شاید خواجہؒ نے تین دن کی مہلت مانگی ہے۔

ہندوستان سے دور شکست خوردہ شہاب الدین غوری راجہ پرتھوی کے ہاتھوں شکست کے بعد انتہائی افسردہ اور غمگین بیٹھا مستقبل کے لیے لائحہ عمل تیار کر رہا تھا اُسے اپنی ناکامی کا انتقام لینا تھا مگر اپنے وسائل پر نظر ڈال کر پھر رہ جاتا کہ اس مٹھی بھر سپاہ سے ہندو راجہ کی کثیر سپاہ سے اُن کی اپنی زمین پر لڑنے جانا خودکشی ہی کہی جائے گی۔ اسی غمزدگی اور طوئی کی کیفیت میں اس نے رات ایک خواب دیکھا کہ ایک بزرگ اُسے کہہ رہے ہیں ”غوری..... اُنھ ہندوستان کا تخت و تاج تیرا انتظار کر رہا ہے۔“

شہاب الدین غوری جو پہلے ہی انتقام کی آگ میں بھڑک رہا تھا اس خوش کن خواب کو دیکھ کر اس نے ہمت و جذبہ کے ساتھ دوبارہ ہندوستان پر حملے کی تیاری کا حکم دیا اور برق رفتاری سے ہندوستان کی طرف کوچ کرنے لگا۔

ادھر پرتھوی راج جو ابھی خواجہ معین الدین چشتیؒ کے اسلام قبول کرنے کے پیغام کو پا کر غصے سے کھول رہا تھا۔ اسے ایک اور اہانت آمیز پیغام موصول ہوا۔ یہ شہاب الدین غوری کی طرف سے اُس کا قاصد لے کر آیا تھا جس میں سلطان نے لکھا تھا:-

کرنے کا سچے دل سے اقرار کیا اور دیر تک اپنی ناپاک سوچ پر توبہ کرتا رہا۔

یہ ایک خاموش اور پراسرار جنگ تھی بلکہ آج کے زمانے کی اصطلاح میں اسے سرد جنگ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ پرتھوی راج کھل کر سامنے نہیں آ رہا تھا مگر اندر ہی اندر آپ کے خلاف محاذ قائم کیے ہوئے تھا اور یہ اُس کی بد قسمتی تھی کہ وہ ہر معرکہ میں خواجہ صاحبؒ کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوتا آ رہا تھا۔ خواجہ صاحبؒ نے پرتھوی راج کو جو یوں مسلسل تنگ کرتے پایا تو ایک جارحانہ قدم اٹھاتے ہوئے اسے اسلام کی دعوت دے ڈالی۔ راجہ پرتھوی جس کے آباء اجداد جنوں کے نام لیوا تھے اور اس پر فخر کرتے تھے آپؒ کی اس جسارت اور دلیری پر غصے سے آگے گولا ہو گیا۔ نفرت اور حسد کی آگ میں وہ دن رات جلنے لگا۔ وہ دیکھا کرتا تھا کہ راجہ ہونے کے باوجود اس کے گرد لوگوں کا وہ ہجوم وہ عقیدت مندی کے مظاہرے نہیں ہوتے جن میں خواجہ غریب نوازؒ گھرے ہوئے ہیں۔

پرتھوی راج نے حضرت خواجہؒ کی خدمت میں اپنا ایک سردار بھیجا جس نے آپؒ کو پرتھوی راج کی طرف سے پیغام پڑھ کر سنایا کہ آپؒ کی بہتری اسی میں ہے کہ آپؒ جلد ہو سکے اجمیر چھوڑ کر کہیں بھی تشریف لے جائیں۔

خواجہؒ نے راجہ کا پیغام سنا مگر اثر کوئی نہ لیا لیکن جب نامہ بر مسلسل آپؒ کے چہرے کی طرف جواب کی امید لیے دیکھتا رہا تو آپؒ نے ارشاد فرمایا ”ہم نے ہتھیوار کو زندہ گرفتار کر کے مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔“

پرتھوی راج کو یہ جواب ملا تو وہ اس کا مفہوم نہ سمجھ سکا چنانچہ جھنجھلا کر اس نے خواجہؒ پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے مہاراجہ کی ہتک عزت کی ہے کیونکہ مہاراجہ نے جب ایک شخص کو اُن کے پاس اسلام قبول کرنے بھیجا تو خواجہؒ نے اس کی نیت پر شبہ کا

## آپ سے تحریریں طلب کرتا ہے

## سیارہ ڈائجسٹ

اور آپ کو صلاحیتوں کے اظہار کے بھرپور مواقع فراہم کرتا ہے  
کیا آپ زندگی میں کبھی عجیب و غریب واقعات سے دوچار ہوئے ہیں؟  
کیا آپ نے کہیں کوئی دلچسپ بات پڑھی ہے؟  
کیا آپ یا آپ کے کسی واقف کار کے ساتھ کچھ ان ہونے واقعات گزرے ہیں؟

زیادہ سے زیادہ دو ہزار الفاظ میں ہمیں لکھ دیجئے، ہم اسے آپ کی تصویر اور  
تعارف کے ساتھ شائع کریں گے

کوئی دلچسپ کہانی جو پڑھنے والوں پر تاثر چھوڑ جائے

اسلامی تاریخ پر پس منظر میں لکھی جانے والی کہانی

انگریزی یا کسی اور غیر ملکی زبان سے ترجمہ شدہ کہانی

### شرائط

- 1- کاغذ کے ایک طرف لکھئے۔
- 2- کھلا اور صاف ستھرا لکھئے۔
- 3- بہتر ہے ٹائپ کروالیجئے۔
- 4- اقتباس یا تلخیص کی صورت میں اصل حوالے یا کتاب کا نام مع مصنف لکھئے۔
- 5- کہانی کے اختتام پر اپنا نام پتا لکھنا نہ بھولئے۔
- 6- مختصر تعارف اور پاسپورٹ سائز تصویر مسودہ کے ساتھ منسلک کریں۔
- 7- مسودہ واپس چاہیے ہو تو جوابی لفافہ ساتھ بھیجئے۔



حضرت خواجہ معین الدینؒ کی عظمت و بزرگی کے سببی قائل رہے اور نگ زیب عالمگیر آپؐ کا بہت مداح تھا۔ وہ آپؐ کے آستانہ مبارک پر کئی بار حاضری دیتا اور اپنی والہانہ چاہت و عقیدت کا اظہار کرتا۔

حضرت خواجہؒ نے اپنی پوری زندگی تبلیغ و اشاعت میں بسر کر دی۔ آپؒ نے دین اسلام کے عروج کی خاطر ہند میں دن رات کام کیا اور اسلام کے نور سے کفر میں گھری سرزمین ہند کو منور کیا۔ حضرت خواجہؒ پچاس برس ہندوستان میں رہے۔ یہاں کی رسومات کا بغور مطالعہ کیا۔ آپؒ نے محسوس کیا کہ یہاں کے باشندوں میں موسیقی کا بڑا دخل ہے اور یہ راگ رنگ کے دیوانے لوگ ہیں۔ ہندوؤں کے مندروں سے دل فریب محسوس کن موسیقی گونجتی رہتی ہے۔ چنانچہ آپؒ نے بھی موسیقی سے تبلیغ کا کام انجام دینے کا سوچا۔ آپؒ نے محفل سماع کی بنیاد ڈالی۔ اس طرح ہندوؤں کے دل پسند طریقے سے اسلام کا موثر پیغام انتہائی دل نشین انداز میں اُن تک پہنچنے لگا۔ یہی محفل سماع آہستہ آہستہ قوالی کی شکل اختیار کر گئی۔

آپؒ کہا کرتے تھے ”لوگو! تم میں ضعیف ترین شخص وہ ہے جو ایک بات کہے اور پھر اُس پر ثابت قدم نہ رہ سکے۔“

ایک بار آپؒ نے فرمایا ”بت پرستی کا دوسرا نام خود پرستی اور نفس پرستی ہے جب تک انسان ان سے چھٹکارا نہیں پاتا وہ خدا پرستی کی منزل سے دُور رہتا ہے۔“

”متوکل وہ ہے جو مصائب اور تکالیف سے بے حال ہو جائے مگر حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے۔“

حضرت معین الدینؒ چشتیؒ تیرانوے سال کی عمر میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ آپؒ کا سن وفات ۱۲۳۶ھ ہے۔

”سرہند اور تھامیر کا علاقہ مسلمانوں کی ملکیت ہے تم اسے خالی کر کے اسی طرح اطاعت گزار بن کر رہو جیسے سلطان محمود غزنوی اور اُس کی اولاد کے باج گزار بن کر رہے ہو۔ ورنہ دوسری صورت میں تم سے بزدل شمشیر یہ علاقے لیے جائیں گے اور تمہیں عبرت ناک انجام سے دو چار ہونا پڑے گا۔“

پرتھوی راج اس پیغام کو پا کر غم و غصہ سے آگ بگولا ہو گیا اور مختارت سے شہاب الدین کے فرمان کو پھاڑ کر قاصد کے ہاتھ کھلوا بیچھا ”اگر تم سرزمین ہند سے اسی وقت نہ نکل کھڑے ہوئے تو میرے قہر سے نہ بچ سکو گے۔“

حضرت خواجہؒ کے بموجب تیسرے دن ترائن کے مقام پر پھر ایک خوفناک گھمسان کا رن پڑا اور پرتھوی راجؒ اپنی سپاہ سمیت مسلمانوں کے غیض و غضب کا شکار ہو کر فرار ہو گیا مگر مسلم لشکر نے اس کا پیچھا کیا اور گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ شہاب الدین غوری ایک فاتح کی حیثیت سے اجیر میں داخل ہوا اور جب اسے معین الدین چشتیؒ سے شرفِ ملاقات ہوئی تو انھیں دیکھ کر وہ حیرت سے اُٹھل پڑا اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا ”آپؒ..... آپؒ ہی وہ بزرگ کامل ہیں جنہوں نے مجھے ہندوستان پر فتح کی بشارت دی تھی۔“

حضرت خواجہؒ نے مسکرا کر شہاب الدین کو سینے سے لگایا اور اسے نصیحت کی ”دیکھو اپنے بندوں کا تجھے اللہ نے خادم مقرر کیا ہے۔ ہمیشہ عدل و انصاف سے حکمرانی کرنا اور اپنے کسی قول و فعل سے خدا کے بندوں کو دکھ نہ دینا۔ پرتھوی راج کا لڑکا نیک ہے، اسے تو اجیر کا حاکم بنادے اور وہ بھی تیرا اطاعت گزار بنارہے گا۔“ سلطان نے آپؒ کی نصیحتوں پر حرف بحرف عمل کیا اور اجیر کی حکمرانی راجہ پرتھوی کے لڑکے کو سونپ کر آگے چل پڑا۔

محمد سلیم اختر

## ”عدالت“

اب اس کی کیفیت حال میں پھنسے شکار کی سی تھی۔ اوپر سے مقتول کے وارث کے پستول لوڈ کرنے کی آواز آئی اور اسے یقین ہو گیا کہ حریف کی گولی پستول کے مہانے سے نکلنے کے لیے بے تاب ہے۔ اسی اثناء میں اس نے چیخ کر کہا۔ ”گولی مت چلانا۔ میں اوپر تمہارے پاس آ رہا ہوں۔“

### ایک قاتل کے تعاقب اور انجام کی کہانی، پشتو ادب سے انتخاب

تبادلہ کر رہے تھے۔ گولیاں ان کے سروں پر سے گزر رہی تھیں۔ دونوں ان سے اپنی جان بچانے کی ٹیک دو دو بھی کر رہے تھے اور بھاگنے میں بھی مصروف عمل تھے۔ قاتل نے مقتول کے وارث سے چھپنے کے لیے کھیت، باغ، کھنڈر، کھڈ، کھائی، پگڈنڈی، غرض

وہ اپنے باپ کے قاتل کے تعاقب میں چیتے کی طرح دیوانہ وار بھاگ رہا تھا۔ قاتل کی ٹانگوں کو بھی موت کے خوف نے بے پناہ قوت بخشی تھی۔ اس لیے وہ بھی اس سے جان چھڑانے کے لیے آندھی کی طرح اڑ رہا تھا۔ دونوں مسلسل پے در پے گولیوں کا



تھیں اور یوں قاتل کے پیر کھیت میں اپنے لیے راستہ بنانے کی کوشش میں تھے اور وہ بھی اس کے بنائے ہوئے راستے پر دوڑتا اس کا پیچھا کر رہا تھا۔

قاتل سمجھ گیا کہ کھیت اس کے لیے ایک موزوں پناہ گاہ کا کام سرانجام نہیں دے سکتا۔ لہذا دوسرے سرے پر پہنچنے کے بعد اس نے پلڈنڈی سے آگے وسیع و عریض علاقے کا بغور جائزہ لیا تو ایک بلند و بالا نیلے کے نیچے تمام زمین اسے عمیق کھڈوں اور تھاہ گہرائیوں کی مانند نظر آنے لگی۔ یوں لگتا تھا جیسے تنگ و تاریک قبروں نے اس کے لیے ایک خونخوار اڑدھس کی طرح اپنے خوفناک جبرے کھول دیئے ہوں۔ اس نے بلا پس و پیش ان میں سے ایک گہرے کھڈ کا انتخاب کر کے اس میں چھلانگ لگادی۔

اور جب مقتول کا وارث کھیت میں سے ہو کر پلڈنڈی تک پہنچ گیا اور اس نے گرد و نواح میں اس کا سراغ لگانے کی کوشش کی تو اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ تب اس نے اپنے آپ کو باور کرانے کی سعی کی کہ اس نے کھڈوں میں سے ضرور کسی کھڈ کو پناہ گاہ کے طور پر اپنا یا ہوگا۔ لہذا وہ ان کھڈوں کا بنظر غائر جائزہ لینے لگا۔ اس دوران زمین پر کسی کے کچڑ سے تھڑے قدموں کے خون آلود نشانات دکھائی دینے لگے جو ایک کھڈ کے دہانے تک پہنچ کر ختم ہو جاتے تھے۔ اس کی تمام تر توجہ متذکرہ کھڈ پر مرکوز ہوئی اور جب وہ اس کی تہہ کو ایک گہرے کنویں کے مانند بغور دیکھنے لگا تو اس نے وہاں قاتل کو ایک خوفناک اور خطرناک سانپ کی طرح سکر کر ہانپتے ہوئے دیکھا۔

”میں قسم کھا چکا ہوں کہ تم مجھ سے سات زمینوں کی تہہ میں بھی بچ نہیں سکتے اور میں تمہیں پکڑ کر ہی دم لوں گا“۔ اس کی آواز کی گونج بجلی کی طرح کڑی ہوئی سنائی دینے لگی۔

کوئی جگہ بھی نظر انداز نہ کی۔ لیکن وہ تیر کی طرح اس کا پیچھا کر رہا تھا اور اسے ہر حالت میں اور ہر قیمت پر جالینے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔ اب قاتل پہاڑ کی ایک بلند و بالا چوٹی تک پہنچ چکا تھا۔ جس کے دامن میں پانی سے لبا لب بھرا ہوا دریا بہہ رہا تھا۔ موت اس سے چند قدم کے فاصلے پر تھی اور قریب تھا کہ وہ اس پر باز کی طرح جھپٹتا اور اپنے فولادی پنجوں میں مضبوطی سے جکڑ لیتا۔ لیکن اسی اثناء میں قاتل نے آنکھیں بند کر کے دریا میں چھلانگ لگادی۔ وہ بھی زکا نہیں اور اس کو دیکھتے ہی اس کے پیچھے دریا میں کود پڑا اور یوں وہ انسان خونخوار مگر مچھوں کی طرح دریا کی لہروں کے ساتھ برسر پیکار رہے۔ جب سرکش اور شور ملی لہریں انہیں دریا کی تہہ میں لے جانے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھیں تو یہ بھی انہیں اپنے مضبوط پھنڈوں کا نشانہ بناتے اور یوں ان سے پیچھا چھڑانے کی حتی الوسع کوشش کرتے تھے۔

دونوں خاصے تھک چکے تھے لیکن دریا کی قوت کے سامنے اپنی ہمت کے ہتھیار ڈالنا بزدلی گردانتے تھے۔ آخر کار مستقل موقعیں ان کے جسموں کو دھکیلنے لگیں اور وہ تھک ہار کر دوسرے کنارے تک پہنچ گئے۔ اس دوران قاتل کا پاؤں مکمل طور پر اس کی دسترس میں تھا لیکن دریا کے کنارے پھیلے ہوئے کچڑ پر پھسلنے کی وجہ سے وہ اس کی زد سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

قاتل کے پاس پھر بھاگ اٹھنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا اور اس نے بھی اس کے تعاقب کو اپنا فرض جانا۔ اس مرتبہ قاتل نے سامنے گئے کے کھیت کو اپنی کمین گاہ اور پناہ گاہ کے طور پر منتخب کیا۔ اس نے بھی تیر کی طرح پوری برق رفتاری سے اس کا پیچھا کیا۔ کنوئوں کے ٹوٹنے اور گرنے کی مخصوص آوازیں ٹک، کٹ، کڑک، کڑاک صاف سنائی دے رہی



سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور عظیم پیشکش

# شرعی احکام

شائع ہو گیا ہے

قیمت 175 روپے

عبادات سے معاملات تک اور معاشرت سے لیکر سیاسیات تک  
تبلیغی نصاب، قرآنی آیات اور صحیح احادیث کی روشنی میں

★ اسلامی ضابطہ حیات جس کی روشنی میں آپ اپنے شب و روز گزار  
سکتے ہیں۔

★ آخرت کا توشہ، دلوں کی بیماریوں کے لیے شفاء۔

★ نیکیوں کی طرف رہنمائی اور گناہوں سے بچنے کے طریقے۔

★ ایسے سنہری حروف جنہیں پڑھ کر آپ اپنے اخلاق و کردار کی  
کوٹاہیوں کو دور کر سکتے ہیں۔

سیارہ ڈائجسٹ 240 ریواڑ گارڈن لاہور فون: 37245412

عاجزی، مایوسی اور لٹی لٹی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا لیکن اس نے چیخ کر اسے کہا: ”مت رکو! عدالت تک پہنچنے کے لیے ابھی فاصلہ باقی ہے!“

اور پھر جب فاصلے طے کرنے کے بعد وہ دونوں گاؤں کے سرے پر واقع مسجد تک پہنچ گئے۔ تو اس نے قاتل کو اپنے بھوتے اتارنے کا حکم دیا۔ دونوں نے اپنے اپنے بھوتے اتارے۔ مسجد میں داخل ہوئے اور مسجد کے خوش نما دیدہ زیب محراب کے سامنے دو زنانہ ہوکر بیٹھ گئے۔ اس نے طاق سے قرآن شریف اٹھایا اور نہایت عقیدت و احترام سے چوم کر قاتل کے عین سامنے رکھ دیا اور کہنے لگا: ”تمہیں یاد پڑتا ہے کہ اسی مسجد میں اسی جگہ

جرم کے معززین کے روبرو تم نے اسی قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر اور اسے گواہ بنا کر میرے باپ سے ہمیشہ کے لیے اپنی دشمنی ختم کرنے کا حلف اٹھایا تھا اور یوں ہماری آپس میں صلہ ہو گئی تھی۔“

قاتل کی سرخ ہوئی آنکھوں سے دو صاف اور شفاف آنسو گرے اور اس نے سسکیوں سے بھری ہوئی آواز میں کہا ”ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے لیکن اب میں اپنی غلطی پر بے حد تادم ہوں“ پھر وہ چیخ چیخ کر رونے لگا اور ندامت و شرمساری کے شدید جذبات سے مغلوب ہو کر اس کے قدموں میں گر پڑا۔ اس نے جھک کر اسے اٹھایا اور محراب کے قریب لے گیا اور اس کے سر کو زمین کے ساتھ اس انداز میں جھکا دیا کہ وہ سر بسجود ہو اور پھر اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف کر کے چیخنے لگا۔

”اے اللہ! میں نے تیرا باغی تیری عدالت تک پہنچا دیا اور اب یہ تیرے ابدی فیصلے کا منتظر ہے۔“

یہ کہہ کر وہ دوڑتا ہوا اکیلا مسجد سے باہر نکل آیا۔

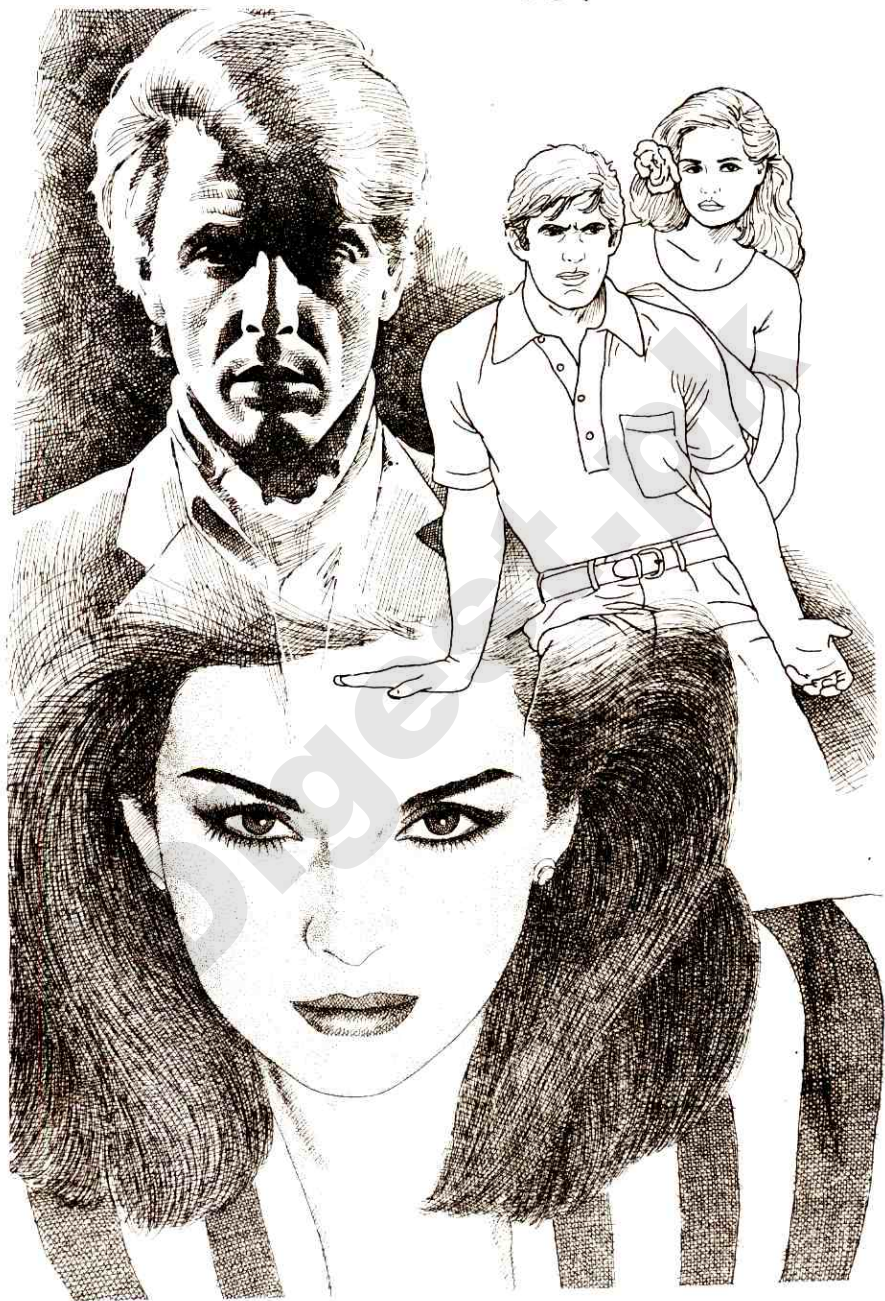
قاتل نے اپنے پستول کو جس میں صرف ایک گولی تھی اٹھایا۔ اور جب اس کا نشانہ باندھنے کے بعد اسے چلانے کی کوشش کی تو گولی نہ چل سکی۔ اب اس نے اپنے آپ کو مکمل طور پر موت کی آغوش میں پایا اور دیوانہ وار اپنی سرخ اور تھرا آلود آنکھوں سے کبھی پستول کو اور کبھی ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس نے پھنسی ہوئی گولی کو چلانے کی بھرپور کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ اب اس کی کیفیت چال میں پھنسنے شکار کی سی تھی۔ اوپر سے مقتول کے وارث کے پستول لوڈ کرنے کی آواز آئی اور اسے یقین ہو گیا کہ حریف کی گولی پستول کے مہانے سے نکلنے کے لیے بے تاب ہے۔ اسی اثناء میں اس نے چیخ کر کہا: ”گولی مت چلاتا۔ میں اوپر تمہارے پاس آ رہا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ بلاتردد اور چڑھ آیا۔ اس نے اپنا پستول قاتل کے سر سے لگا کر اس کا منہ گاؤں کی طرف پھیر دیا اور اسے مسلسل چلنے کی تاکید کی۔ یوں دونوں ساتھ ساتھ چلنے رہے۔ قاتل خوف کی وجہ سے لرز رہا تھا، اس کے پاؤں کانپ رہے تھے اور وہ بے حس ہو چکے پاؤں بمشکل گھسیٹ رہا تھا۔ وہ پیچھے اور ادھر ادھر دیکھنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا کیونکہ اسے حکم دیا گیا تھا کہ وہ خاموشی سے چلتا رہے۔ وہ دونوں گاؤں کے اس مقام تک پہنچ گئے جہاں اس کے باپ کو اس قاتل نے جواب عمل طور پر اس کے پستول کی زد میں تھا..... موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور جسے پکڑنے کے لیے اسے اتنی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

مقتول کا خون تاحال جوں کا توں تھا جبکہ لاش کو دفنایا گیا تھا۔

ادھر قاتل کرب سے مغلوب ہو کر نہایت







نواز خان

## ”اوہ وہ بدل گئی.....!“

”وہ حوا کی بیٹی مرد کو حیران کرنا چاہتی تھی اور اس کے لیے کچھ بھی کر گزرتی تھی“

روپے ہفتہ تک پہنچ جاتا تھا۔ اس وقت کا 300 آج کل سات آٹھ ہزار سے کم نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی ان کا بچہ میں کھاتے پیتے لوگ ہی قیام کرتے تھے۔ ان کا بچہ میں سے ایک کا بچہ گلزار نامی ایک نوجوان کا تھا۔ گلزار چوڑے چلکے جسم کا مالک ایک ہنس کھ اور سادا لڑکا تھا۔ اس کی کل جائیداد اور پونجی یہی ایک کا بچہ تھا جو اسے اپنے باپ سے تر کے میں ملا تھا۔ سال میں چھ مہینے تو یہ کا بچہ دوسرے کا بچہ کی طرح ویران ہی پڑا رہتا تھا۔ اصل سیزن جون جولائی ہی ہوتا تھا جب میدانی علاقوں کی گرمی سے گھبرائے ہوئے عوام و خواص پہاڑی مقامات پر بلے بولتے تھے اور ہر اچھی بُری جگہ کرائے پر چڑھ جاتی تھی۔ ان دنوں گلزار کو بھی معقول آمدنی ہو جاتی تھی اور وہ اپنے اور اہل خانہ کے لیے سال بھر کا راشن اکٹھا کر لیتا تھا۔ گلزار کی دو چھوٹی بہنیں تھیں اور ایک بڑا بھائی۔ یہ بھائی بیمار رہتا تھا اور کسی کام کاج کے قابل نہیں تھا۔ اس طرح آٹھ افراد پر مشتمل کنبے کا سارا بوجھ گلزار کے کندھوں پر تھا۔ اس کے اہل خانہ

اس دلچسپ کس کا تعلق بھی ڈلہوڑی سے ہے۔ ڈلہوڑی میں میری رہائش بڑی پرفضا جگہ پر تھی۔ سڑک سے صرف دس بارہ فٹ نیچے ڈھلوان پر یہ بڑے صاف ستھرے کوارٹر تھے۔ عقب میں وسیع و عریض وادی تھی اور وادی میں بکھرے ہوئے خوبصورت مناظر تھے۔ دائیں طرف گھنے درخت جہاں ایک انگریزی سکول تھا اور سکول کے بچوں کے لپے خوبصورت پارک بنا ہوا تھا۔ بائیں طرف چشمے کا پانی ایک آبشار کی صورت نشیب میں گرتا ہے۔ اس آبشار کے گردلو ہے کہ سرخ جنگلے لگے ہوئے تھے۔ سیاح ان جنگلوں کے سہارے جھک کر گھنٹوں آبشار کا نظارہ کرتے تھے۔ کوارٹر کے سامنے سڑک تھی اور اس پر صرف پیدل لوگ ہی آجاسکتے تھے۔ کوارٹروں کے پچھواڑے وادی کے رخ پر چھوٹے چھوٹے خوبصورت کانچ بنے ہوئے تھے۔ ان کی مخروطی چھتیں سرخ تھیں اور ہر کانچ میں گھاس کے چھوٹے چھوٹے لان تھے۔ اکثر کانچ دو یا تین کمروں پر مشتمل تھے۔ جون، جولائی میں ان کا کرایہ 300

ست دھارا سے آگے ایک چھوٹے سے ”جاہو“ نامی گاؤں میں رہتے تھے۔

ایک سیزن میں میری والدہ مجھ سے ملنے ڈلہوزی آئیں۔ ڈھائی تین ماہ میرے پاس کوارٹر میں رہیں۔ مجھے اپنے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی کھلا کر انہیں بڑی تسلی ہوا کرتی تھی۔ کچھ یہی حال میرا بھی تھا۔ رات کو سوتے وقت اُن کے پاؤں دبا کر جو خوشی ملتی تھی وہ ہر خوشی سے بے نیاز کر دیتی تھی۔ پڑوسی ہونے کے ناتے گلزار بھی اکثر، رے گھر آجایا کرتا تھا۔ میری غیر موجودگی میں وہ ماں جی کو تنہائی کا احساس نہیں ہونے دیتا تھا۔ ماں جی اُس کو بہت پیار کرنے لگی تھیں اور بیٹا کہہ کر نکالتی تھیں۔ ماں جی کے آنے سے پہلے میں گلزار کو پڑوسی سے زیادہ اہمیت نہیں دیا کرتا تھا لیکن وہ ماں جی کو اچھا لگنے لگا تو مجھے بھی لگنے لگا۔ ڈھائی تین ماہ بعد ماں جی تو واپس چلی گئیں لیکن میرے اور گلزار کے درمیان قریبی تعلق قائم کر گئیں۔ گلزار اب اکثر میرے کوارٹر میں آجاتا تھا اور ہم بے تکلفی سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے تھے۔ گلزار کی سب سے بڑی خوبی اس کی سادگی تھی۔ کوئی لالچ دھوکا فریب اس میں نہیں تھا۔ نہ اُس نے کبھی مجھ سے کسی کی سفارش کی۔ نہ کسی پر دباؤ ڈلوایا اور نہ کوئی اور فائدہ اٹھایا۔ وہ بس کام سے کام رکھنے والا اور اپنے حال پر خوش رہنے والا بندہ تھا۔

مجھے یاد ہے وہ ستمبر اکتوبر کے دن تھے۔ سردی نے اپنے پر پُرنے نکالنے شروع کر دیے تھے اور خزاں دے پاؤں سرسبز وادیوں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ گلزار چند دنوں سے کچھ اُداس اور اکھڑا اکھڑا ہے۔ میں نے اُسے کریدنے کی کوشش کی لیکن وہ حسب معمول ہنس کر ٹال گیا۔ میں نے سوچا شاید یہ سیزن ختم ہونے کی اُداسی ہے۔ سیاحوں کی میزبانی کرنے والے ایسی اُداسی کا

اکثر شکار ہو جاتے ہیں لیکن پھر جلد ہی یہ اُداسی ختم بھی ہو جاتی ہے۔ برف باری کا نظارہ کرنے والے اکا دکا سیاح ہل شیٹیں پر آنے لگتے ہیں اور سنان گلیوں میں زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت رونق کا سامان ہو جاتا ہے۔ میں نے بھی گلزار سے زیادہ پوچھنا کچھ مناسب نہیں سمجھی اور اسے اُس کے حال پر چھوڑ دیا۔ پھر ایسا ہوا کہ دو تین ہفتے گلزار سے ملاقات ہی نہیں ہو سکی۔ میں تو مصروف تھا مگر گلزار کو ایسی کیا مصروفیت آن پڑی تھی؟ اس شریف آدمی نے اپنی صورت تک نہیں دکھائی تھی۔ مجھے دوسرے ہونے لگا کہ شاید میری کوئی بات اُسے بُری لگ گئی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ناراض ہے۔ ایک روز مقامی چھٹی تھی۔ میں نے ایک سنتری کو گلزار کی طرف بھیجا..... سنتری گلزار کو تو نہیں لایا تاہم گلزار کا ایک قریبی دوست جماعت علی خاں اس کے ساتھ چلا آیا۔ جماعت علی ایک کانچ کا ٹکڑا لے کر گلزار سے اُس کی خاصی بے تکلفی تھی۔ گلزار کے ساتھ وہ ایک دو دفعہ میرے کوارٹر میں بھی آچکا تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور جھجکتا ہوا ایک کرسی پر بیٹھ گیا..... کوارٹر کا صحن تھا اور یہاں بڑی مزیدار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے سنتری سے کہا کہ وہ گرما گرم قبوہ پلائے۔ سنتری چلا گیا تو میں نے جماعت علی سے پوچھا ”ہاں بھئی..... کدھر ہے وہ تمہارا لنگوٹیا۔ مجھے تو اُس کی شکل بھی بھول گئی ہے کہیں ڈلہوزی تو نہیں چھوڑ گیا؟“

جماعت علی کے ہونٹوں پر پھینکی سی مسکراہٹ اُبھری، پشتو کے لہجے میں بولا ”خو..... وہ ہے تو ڈلہوزی میں لیکن اس کا دل و دماغ ڈلہوزی میں نہیں ہے۔ ام کئی دن سے سوچ رہا تھا کہ آپ سے بات کرے لیکن موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ اب آپ کا سنتری گلزار کو ڈھونڈتا ہوا ادھر جیسے پر آیا تو ام نے بولا چلو آؤ ام تمہارا ساتھ چلتا ہے۔“

بھی دیکھا ایسی جگہ کھڑے دیکھا جہاں ”نو پارنگ“ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ جینی اور پریم کا لباس بھی اپنی مثال آپ ہوتا تھا۔ کبھی دس سال پیچھے کا فیشن کبھی دس سال آگے کا فیشن۔ ایک روز میں نے جینی کو ایسے لباس میں شاپنگ کرتے دیکھا کہ سکتے میں رہ گیا۔ میں ہی کیا جس نے بھی دیکھا ہوگا سانس لینا بھول گیا ہوگا۔ لباس کے نام پر اُس نے مشکل سے ڈیڑھ دو گز کپڑا استعمال کیا ہوگا۔ اسکرٹ جسم سے چپکا ہوا تھا اور کولہوں سے نیچے اترتے ہی ختم ہو جاتا تھا۔ یہی حال بازوؤں اور گریبان وغیرہ کا تھا۔ لوگ رُک رُک کر اُسے دیکھ رہے تھے۔

میں نے جماعت خاں کی زبانی گلزار کے بارے میں سنا تو حیران رہ گیا۔ کہاں وہ اونچی سوسائٹی کی خڑے باز لڑکی کہاں یہ نچلے سے نچلے طبقے کا معمولی سا لڑکا۔ گلزار سے زیادہ آن بان والے تو جینی کے ملازم تھے۔ فوراً میرے ذہن میں آیا کہ گلزار کے ساتھ ضرور کوئی شرارت ہوئی ہے یا پھر وہ بے وقوف خود ہی کسی غلط فہمی کا شکار ہو گیا ہے۔ شکل و صورت سے وہ بڑا رومان پسند نظر آتا تھا۔ خاص طور پر اُس کی سوئی سوئی آنکھیں تو جیسے ہر وقت خواب دیکھتی رہتی تھیں۔ میں نے جماعت خاں سے پوچھا ”کیا اُسے پاگل کتے نے کاٹا ہے کہ آپیں بھرتا پھرتا ہے؟ جس لڑکی کا وہ نام لے رہا ہے اُس کے تو ملازم بھی اُس سے کہیں زیادہ حیثیت والے ہیں۔ میرے خیال میں تو وہ میرے تمہارے جیسے بندوں سے بات کرنا بھی گوارا نہ کرتی ہوگی۔“

جماعت خاں نے عجیب سے لہجے میں کہا ”آپ ٹھیک کہتا ہے نواز صاحب۔ وہ امارے تمہارے جیسے بندوں سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتی..... لیکن..... یہ حرامی گلزار صاحب تو اُس کے ساتھ سوچا ہے۔“

”لیکن اُس کو بیماری کیا ہے بھائی..... کچھ پتہ بھی چلے۔“

جماعت خاں کے چہرے پر ایک دم سنجیدگی کے سائے گہرے ہو گئے۔ کچھ دیر سر کھجاتا رہا۔ پھر دائیں بائیں دیکھ کر ذرا رازداری سے بولا ”کم بخت خود کو روگ لگا بیٹھا ہے خواخواہ..... ادھر ایک میم صاحبہ ٹھہرا تھا ناں اُس کے کانچ میں۔ بس اُسی کا نام لے لے کر آپیں بھرتا ہے کہتا ہے وہ ام کو نہ ملا تو ام مر جائے گا۔“ حیرت سے میری آنکھیں کل گئیں۔ جماعت خاں جس میم صاحبہ کا ذکر کر رہا تھا اُس کا نام جینی تھا اور وہ سچ سچ کی میم تھی۔ بے حد تیز طرار اور چلبلی لڑکی تھی۔ اسے دیکھ کر ہالی وڈ کی کسی حسین دلکش ساحرہ کا تصور ذہن میں آتا تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ اُس کا والد صنعت کار ہے اور لاہور کے نواح میں پرزے ڈھالنے کی اُس کی بہت بڑی فیکٹری ہے۔ جینی کے ساتھ اُس کی سہیلی تھی۔ اس کے علاوہ ایک شو فرار خانساں بھی تھا۔ جینی اور اُس کی سہیلی کے لیے ایک کانچ بھی ضرورت سے زیادہ تھا لیکن انہوں نے ایک ساتھ تین کانچ کرائے پر لیے تھے۔ ایک میں جینی اور اس کی سہیلی نے قیام کیا تھا۔ دوسرے میں شو فرار خانساں صاحب قیام فرما ہوئے تھے۔ تیسرا کانچ اس لیے خالی پڑا رہتا تھا کہ کہیں کوئی مہمان نہ آجائے۔ جینی کی سہیلی پریم کو مقامی تھی لیکن انگریزی لباس پہنتی تھی۔ انگریزی بولتی تھیں اور انگریزوں سے بڑھ کر ماڈرن تھی۔ وہ کسی اعلیٰ افسر کی بیٹی تھی۔ یہ دونوں لڑکیاں تقریباً دو مہینے ڈیہوڑی میں رہی تھیں اور جینی دیر رہی تھیں اودھم چائے رکھتا تھا۔ لگتا تھا جیسے انہوں نے قسم کھا رکھی ہے کہ کوئی کام سیدھا کرنا ہی نہیں۔ اُن کے پاس نئے ماڈل کی شادار گاڑی تھی مگر اس گاڑی پر انہوں نے چھ طرح کے رنگ کر رکھے تھے۔ میں نے اس گاڑی کو ڈیہوڑی میں جب



اشر د کھائے گا صرف ...

کیر

پریکی ہیٹ پاؤڈر



گرمی گھونٹ گھونٹ

کیونکہ صرف کے پیر میں ہے **TRICLOSAN**

گرمی اور پسینے سے بننے والے جراثیم کا نمبر دن توڑ!



Coslab Private Limited E-mail: coslab@mul.paknet.com.pk  
coslabcosmetics@hotmail.com website: www.carecos.net

کوئی اس پر سوار نہیں ہوگا۔ خود گلزار بھی نہیں۔ گلزار اس حکم کی پوری پابندی کرتا تھا۔ ہر روز بجے کے قریب گھوڑے کو بنا سنوار کر لگام سے تھامتا تھا اور کانچ میں لے آتا تھا۔ اگر میم صاحبہ نے گھڑ سواری کے لیے جانا ہوتا تھا تو شو فر گلزار کو بتا دیتا تھا۔ دوسری صورت میں گلزار اُسے واپس لے جاتا تھا۔ ایک روز گلزار گھوڑا لے کر کانچ پہنچا تو شو فر اور خانساں کہیں گئے ہوئے تھے۔ کانچ میں صرف پریم اور میم صاحبہ تھیں۔ پریم نے گلزار سے کہا کہ وہ لان میں بیٹھ جائے میم صاحبہ ابھی ہاتھ روم میں ہیں۔ تھوڑی دیر میں نکلیں گی تو بتائیں گی کہ گھوڑا چاہئے یا نہیں۔

گلزار وہیں لائن کے ایک گوشے میں گھاس پر بیٹھے گا۔ گھوڑا اُس نے کانچ کے گیٹ کے سے باندھ دیا تھا۔ وہ قریب ایک گھنٹہ وہاں بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ میم صاحبہ کی صورت دکھائی دی نہ اس کی سیٹلی کی۔ دوسرے گھوڑے والا بھی کہیں دکھائی نہیں دیا۔ ساڑھے دس پونے گیارہ بجے کے قریب پریم باہر نکلی اور اس نے گلزار سے کہا کہ میم صاحبہ نہیں اندر بلا رہی ہیں۔ گلزار کے اوپر کا سانس اوپر رہ گیا۔ اسے اندیشہ ہوا کہ ضرور اس سے کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس طرح میم صاحبہ کی موجودگی میں وہ کانچ کے اندر قدم رکھ رہا تھا۔ دھڑکتے دل اور کاپتی ٹانگوں سے وہ اندر پہنچا اور اس کے ساتھ ہی اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹنے شروع ہو گئے۔ وہ جیسے ایک حسین اور عجیب و غریب خواب میں کھو گیا تھا۔ اُس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا کہ میم صاحبہ اُس سے اس طرح پیش آئیں گی۔ کہاں وہ آسمان کا ستارہ کہاں وہ زمین کا کنکر..... لیکن آسمان کا ستارہ کنکر سے کھیلنے کے لیے زمین پر آ گیا تھا۔ وہ کھیل تھا خواب تھا یا فریب تھا۔ گلزار کی سمجھ میں کچھ

میں سکتے میں رہ گیا۔ جماعت خاں کے ہونٹوں سے نکلے ہوئے الفاظ دھماکوں کی طرح میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ جماعت خاں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”ام جھوٹ نہیں بولتا نواز صاحب۔ ام کو جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ ام نے اب تک کسی کو نہیں بتایا۔ آپ کو بھی صرف اس لیے بتا رہا ہے کہ آپ اس کا سچا دوست ہے۔ اُس پاگل کو اس مصیبت سے نکالنے کا کوئی چارہ کرے۔ ام سولہ آنے بیچ کہہ رہا ہے جناب..... آپ کی یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ میم صاحبہ جیسا اعلیٰ لوگ اور ام جیسا گھٹیا لوگ کے درمیان ہزاروں میل کا پاصلہ ہوتا ہے۔ پر یہ پاصلہ مٹ گیا ہے جناب۔ اور مٹانے والا خود وہ میم صاحبہ ہے۔ ام کو خبر نہیں اُس نے ایسا کیوں کیا پر اُس نے کیا اور گلزار کو نیم پاگل بنا کر چلا گیا۔“

میں نے اُٹھ کر بیرونی دروازہ بند کر دیا اور جماعت خاں سے کہا کہ وہ مجھے اس واقعے کی پوری تفصیل بتائے۔ جماعت خاں نے اپنے مخصوص لہجے میں بولنا شروع کیا اور دھیرے دھیرے اس واقعے کے اسرار و رموز سے پردہ ہٹانے لگا۔ اُس نے بتایا کہ یہ ڈیڑھ ماہ پہلے کا واقعہ ہے۔ میم صاحبہ کو ڈیہوڑی میں آئے چار ہفتے ہو چکے تھے۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن اپنی سیٹلی پریم کے ساتھ گھڑ سواری کے لیے نکلتی تھی۔ جتنی اُس گھوڑے پر سوار ہوتی تھی جو گلزار کے پاس ہے۔ (گلزار کے پاس دو تین گھوڑے بھی تھے۔ ان میں سے ایک گھوڑا بڑا شاندار تھا۔ کانچ میں ٹھہرنے والے لوگ اکثر اُس سے یہ گھوڑا کرائے پر لے لیتے تھے) جتنی نے پورے دو ماہ کے لیے اس گھوڑے کا ایڈوانس کرایہ گلزار کو دے رکھا تھا اور اُسے حکم تھا کہ ان دو مہینوں کے دوران گھوڑا ہر وقت تیار رہے گا۔ جتنی کے علاوہ

لیکن چند ہفتے پہلے ایک بات ایسی ہو چکی تھی جس کے سبب میں ایسا نہیں کر سکا اور جماعت خاں کی باتیں سن کر میری رگوں میں سنسانہٹ سی دوڑنے لگی مجھے لگا جیسے یہ واقعہ حقیقت سے زیادہ دُور نہیں ہے۔ اب میں آپ کو چند ہفتے پہلے کا وہ واقعہ بتاتا ہوں جو ایسی تھانے میں اسی سیزن میں میرے سامنے پیش آیا تھا اور وقت گزرنے کے باوجود میرے ذہن میں پہلے روز کی طرح تازہ تھا۔ قریبی آبادی سے میرا عملہ ایک سیوک سنگھ نامی شخص کو پکڑ کر لایا۔ یہ شخص راج مزدور تھا اور آبادی میں تعمیر ہونے والی ایک عمارت میں مزدوری کر رہا تھا۔ ٹھیکیدار نے سیوک پر الزام لگایا تھا کہ اُس نے اُس کے کوٹ کی جیب سے سو روپے چوری کیے ہیں۔ یہ کوٹ ٹھیکیدار نے اُتار کر کرسی کی پشت پر ڈالا ہوا تھا۔ میرا اے ایس آئی سیوک کو پکڑ کر تھانے لے آیا۔ سیوک شکل و صورت سے ہی آوارہ سا نظر آتا تھا۔ اُس کی عمر بائیس سال کے لگ بھگ تھی۔ ہاتھ پاؤں مضبوط اور شانے چوڑے تھے۔ اُس کے ساتھیوں نے بتایا کہ یہ ٹھہرا پیتا ہے اور جو پیسے باقی بچتے ہیں اُن سے ٹاکی (فلم) دیکھ لیتا ہے۔ میرے اے ایس آئی نے تھانے میں سیوک کو مار لگوائی تو اُس نے سو روپے کے علاوہ چھوٹی موٹی چند اور چوریاں بھی قبول کر لیں۔ جب حوالاتی کہنے لگے تو تفتیش کرنے والے کا حوصلہ بلند ہو جاتا ہے اور اُسے اطمینان ہو جاتا ہے کہ وہ ایک بے گناہ شخص کو مار پیٹ کا نشانہ نہیں بن رہا۔ وہ زیادہ اعتماد کے ساتھ اُسے پھینٹی لگاتا ہے اور اس پھینٹی کا نتیجہ کبھی کبھی کسی انکشاف کی صورت میں نکل آتا ہے۔ سیوک سنگھ کے معاملے میں بھی یہی کچھ ہوا۔ مار پیٹ سے جان بچانے کے لیے سیوک سنگھ نے انکشاف کیا کہ وہ ایک بہت بڑی میم صاحبہ کے ساتھ اُس کے گھر میں رات گزار چکا ہے اور وہ سب

نہیں آرہا تھا۔ خواب گاہ کی نیم تاریک فضا میں وہ تھا اور میم صاحبہ کی مہربان مسکرائشیں تھیں۔ ایک حسین جسم ریشمی تھان کی طرح گلزار کے سامنے کھلتا چلا گیا۔ یہ خود سپردگی اُسے ہوش و حواس سے بیگانہ نہ کرتی تو اور کیا ہوتا..... اور وہ بیگانہ ہوتا چلا گیا..... اُس کی کون سی خواہش تھی جو اُس روز پوری نہ ہوئی۔ اُس سے خدمت کرانے والی اُس کی خدمت گار بنی ہوئی تھی۔ دل و جان سے اُس کی میزبانی کر رہی تھی۔ اُس روز گلزار نے اپنی زندگی کا بہترین کھانا کھایا۔ بہترین سگریٹ پیئے۔ بہترین بستر پر لیٹا اور بہترین عورت کی قربت حاصل کی۔ یہاں تک کہ شام کے سات بج گئے۔ میم صاحبہ نے خواب گاہ کی گہری تاریکی میں گلزار کو مخاطب کیا ”آج جو کچھ ہوا۔ اُسے بھول جاؤ..... ہمیشہ کے لیے“ اگلے روز جب گلزار پھر نو بجے گھوڑا لے کر آیا تو میم صاحبہ بالکل اجنبی نظر آ رہی تھی۔ وہ نہ مسکراہٹ نہ وہ نرم لہجہ نہ وہ ناز و ادا۔ کچھ بھی کل والا نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا کل کا دن میم صاحبہ کی زندگی میں آیا ہی نہیں لیکن یہ دن گلزار کی زندگی میں تو آیا تھا اور ایسے آیا تھا کہ وہ مرکز بھی اُسے بھول نہیں سکتا تھا۔ اس واقعے کے بعد میم صاحبہ تین چار ہفتے مزید ڈیہوڑی میں رہیں لیکن پھر کبھی انہوں نے گلزار سے آنکھ ملائی اور نہ مطلب کے علاوہ بات کی۔ یہاں تک کہ اگست کے آخر میں وہ واپس چلی گئیں۔ اب گلزار تھا اور اُس کی بے قراریاں تھیں۔ وہ میم صاحبہ کے عشق میں گرفتار ہو چکا تھا اور رات دن آپس بھرتا تھا۔

یہ ایک عجیب کہانی تھی جو جماعت خاں کی زبانی مجھ تک پہنچی۔ ایسے واقعات عموماً جنوں پر یوں کی کہانیوں میں ملتے ہیں اور کسی ہوش مند آدمی کے لیے اُن پر یقین کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ شاید میں بھی اس کہانی کو سنتے ہی جھوٹ اور خرافات قرار دے دیتا



ساتھیوں کو میں نے اپنی کہانی سنائی تھی انہوں نے میری بات پر یقین نہیں کیا لیکن انہوں نے جس تیسرے شخص کو اس بارے میں بتایا وہ بے وقوف قسمت آزمائے کے لیے ”پال کالونی“ کے آٹھ نمبر گیٹ پر چلا گیا۔ وہ وہاں گیٹ کے سامنے ٹھہر رہا تھا کہ دو آدمیوں نے اسے پکڑ لیا اور مار مار کر پکڑے پھاڑ دیے۔ پھر اسے سڑک پر مرغا بنادیا اور چھڑیوں سے پیٹا۔ بعد میں اُس پر کتے کھول دیے جو اسے پال کالونی سے دو فرلانگ دُور چھوڑ کر آئے۔

سیوک سنگھ کا وہ بیان آج دو تین مہینے بعد حرف بحرف میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ اب اس بیان پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ یہ بات اب ثابت ہو رہی تھی کہ ایک مہینہ پہلے تک گلزار کے خوبصورت کانچ میں کچھ ”بدصورت“ کام ہوتے رہے ہیں۔ مزدور سیوک سنگھ ان دنوں جوڈیشل ریماٹر پرنسپل میں تھا اور مجھے تسلی تھی کہ ضرورت پڑی تو میں اُس سے تفصیلی بیان لے سکوں گا۔

بڑے لوگوں کی بڑی غلطیاں ہوتی ہیں اور وہ چھپ جاتی ہیں۔ چھوٹے لوگ اگر چھوٹی سی غلطی کرتے ہیں تو وہ بھی چھپ نہیں سکتی۔ میم صاحبہ نے گلزار کے کانچ میں جو ”کارنامے“ دکھائے وہ معمولی نہیں تھے لیکن نہ تو اس پر پکڑ ہوئی اور نہ کسی نے اس بات کو اچھالا۔ کسی اور کی بات تو رہی ایک طرف خود میں نے اس معاملے کو دبانے کی کوشش کی۔ سب سے پہلے جب سیوک سنگھ نے میم صاحبہ کے بارے میں بیان دیا تو میں نے اسے سختی سے ڈانٹ دیا تھا کہ وہ اپنی اس بکواس کو اپنے تک رکھے اور کسی کے سامنے زبان نہ کھولے۔ جیسی کوئی معمولی لڑکی نہیں تھی۔ اُس نے جو کچھ کیا تھا بغیر کوئی ثبوت چھوڑے کیا تھا۔ اب اگر کوئی اُس پر الزام لگاتا تو یہ سمجھا جاتا کہ وہ اسے بدنام کر رہا ہے۔ اور ایک بار سوخ انگریز

کچھ کر چکا ہے جو مرد اور عورت کرتے ہیں۔ اے ایس آئی نے اُس سے میم صاحبہ کا نام پوچھا تو سیوک نے یہ بتا کر اے ایس آئی کے پچھلے چھڑا دیئے کہ وہ ”پال کالونی“ کے آٹھ نمبر گیٹ میں رہتی ہے۔ یہ پتہ لکھ پتی انگریز صنعت کار کی حسین و جمیل بیٹی جین شیلڈ عرف جینی کا تھا۔ اے ایس آئی فوراً میرے پاس آیا اور بتایا کہ سیوک نامی حوالاتی یہ بات کہتا ہے۔ میں نے خود جا کر سیوک سے پوچھ کچھ کی۔ وہ حلفیہ کہہ رہا تھا کہ ایسا ہو چکا ہے۔ اُس نے بتایا کہ ایک روز میں ڈاک خانے کے سامنے بنی والے چوک میں دوسرے مزدوروں کے ساتھ دیہاڑی لگانے کے لیے بیٹھا ہوا تھا۔ سرخ رنگ کی ایک کار آئی اس میں دو میم صاحبہ تھیں۔ انہوں نے مجھے پاس بلایا۔ دیہاڑی طے کی اور گاڑی میں بٹھا کر پال کالونی لے آئیں۔ یہاں کوئی خاص کام نہیں تھا میں سارا دن ایک باغیچے میں مٹی ادھر سے ادھر کرتا رہا۔ دوپہر کو مجھے بڑا لمبا چوڑا کھانا بھی لکھی والوں نے ہی کھلایا۔ شام کو میں واپس جانے لگا تو انگریز میم صاحبہ مجھے اندر لے گئی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا۔ وہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ میں خود کو میم صاحبہ کی بھرتیوں میں بیٹھنے کے قابل نہیں سمجھتا تھا پر اُس نے مجھے سر آنکھوں پر بٹھالیا۔ صبح میں جانے لگا تو اُس نے پچاس روپے میری جیب میں رکھ دیئے اور کہا کہ جو کچھ ہوا اُسے بھول جاؤ اور آئندہ کبھی اس طرف آنے کی کوشش نہ کرنا۔ نہ ہی کسی کو اس واقعہ کے بارے میں بتانا..... میں چند دن حیران پریشان پھرتا رہا۔ پھر میں نے اپنے دو مزدور ساتھیوں کو اس بارے میں بتادیا۔ وہ مجھ پر ہنسنے لگے۔ انہوں نے کہا کہ نشہ کر کے ساری رات کی گندی نالی میں پزار ہا ہوں اور انہیں بزر پری کی کہانی سنا رہا ہوں۔ انہیں میری کسی بات پر یقین نہیں آیا۔ تھک ہار کر میں چپ ہو گیا۔ جن دو مزدور

کے سیزن میں میم صلیب پھر یہاں آ رہی ہے اور اُس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ میرے ہی کانچ میں ٹھہرے گی۔ دن گزرتے رہے۔ اکتوبر کا سارا مہینہ سرد اور خشک ہوا نہیں چلتی رہیں۔ نومبر میں خشکی کچھ اور بڑھ گئی۔ درختوں کے پتے زرد ہو کر گرنے لگے۔ خزاں جو دبے پاؤں ان حسین چوٹیوں کی طرف بڑھ رہی تھی ایک دم جست لگا کر نشیب و فراز پر چھا گئی۔ نومبر کے ختم ہوتے ہوتے برف باری کے آثار نمودار ہونے لگے۔ دسمبر کے پہلے ہفتے میں شدید برف باری ہوئی اور ”ڈلہوڑی“ نے برف کا خوبصورت لباس پہن لیا۔ اس لباس کو دیکھنے کے لیے میدانی علاقوں سے لوگ ٹولیوں کی صورت میں یہاں پہنچنے لگے۔ اکاڈکا ہوٹل کھل گئے اور گلیوں بازاروں کی ویرانی دُور ہونے لگی۔ گلزار بڑی شدت سے میم صلیب کا انتظار کر رہا تھا۔ کچھ عجیب سی حالت ہو چکی تھی اس کی..... ہر وقت کھویا کھویا رہتا۔ گھنٹوں چشمے کے کنارے خاموش بیٹھا رہتا کبھی گھوڑے پر بیٹھ کر وادی میں نکل جاتا اور دو تین روز بعد لوٹا۔ میم صلیب نے اُس سے دسمبر کے تیسرے ہفتے میں آنے کا وعدہ کیا تھا۔ بچوں دسمبر کا تیسرا ہفتہ نزدیک آ رہا تھا اُس کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ جب بھی مجھ سے ملا سب سے پہلے تاریخ پوچھتا کہ لاہور میں موسم کیسا ہوگا۔ بارشوں کی وجہ سے راستے خراب تو نہیں ہو گئے ہوں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ صاف طور پر پتہ چلتا تھا کہ وہ میم صلیب کے انتظار کی ایک ایک گھڑی گن کر گزار رہا ہے..... مگر اب زبانی طور پر وہ اس کا اقرار نہیں کرتا تھا۔ کم از کم مجھ پر وہ یہی ظاہر کر رہا تھا کہ میم صلیب کے متعلق اُس نے سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ مجھ سے اس نے وعدہ کیا تھا کہ اپنی ماں کے کہے پر عمل کرتے ہوئے وہ اس ماہ اپنی مغلّی بھی کرا لے گا۔ اُس کا رشتہ اپنی ہی برادری میں ایک قبول صورت لڑکی سے ہو رہا تھا۔

کی بیٹی کو بدنام کرنا کوئی معمولی ”جرم“ نہیں تھا۔ میں تو رہا ایک طرف اس جرم میں ہمارے ایس پی صاحب تک کی پٹنی اُتر سکتی تھی..... سیوک سنگھ کے بعد اب گلزار کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ میں نے گلزار کو اپنے کوارٹر میں بلایا اور دو دھاتی گھنٹے لگا کر اطمینان سے اسے سمجھایا کہ جو کچھ ہو گیا ہے وہ اب اُسے بھول جائے۔ یہ ایک خطرناک معاملہ ہے اور جہاں رُک گیا ہے اسے وہیں رُک جانا چاہیے۔ میں نے اُس سے یہ بھی کہا کہ وہ بھول کر بھی اس واقعے کا ذکر کسی اور سے نہ کرے۔

گلزار نے مجھے جو جواب دیا وہ بڑا بیوقوفی کا تھا۔ کہنے لگا ”لالہ جی! میں یہ نہیں کہتا کہ میم صلیب پاک صاف اور مجھ سے پہلے وہ کسی اور سے نہیں ملی لیکن ایک بات کا مجھے یقین ہے۔ اُس نے مجھے پسند کیا ہے اور یہاں سے جا کر وہ دن رات مجھے یاد کرتی ہوگی“ (وہ مجھے لالہ کہا کرتا تھا)

میرا جی چاہا کہ ہوتا اُتار کر گلزار کے سر پر ماروں تاکہ اُس کے دماغ سے عشق کے کیڑے جھڑکیں۔ وہ خود کو پرلے درجے کا چغند ثابت کر رہا تھا۔ اُس کا رویہ اُس نوجیز لڑکے جیسا تھا جو پہلی بار کسی طوائف کے پاس جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اب یہ طوائف اپنا کاروبار بند کر کے بیٹھ جائے گی اور ساری عمر اس کی راہ بگتی رہے گی۔ میں نے گلزار کو سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ ”ہوں ہاں“ میں سر ہلاتا رہا مگر کوئی بات بھی اس کے دل پر اثر نہیں کر رہی تھی..... میں نے اندازہ لگایا کہ میم صلیب اس کی زندگی میں آنے والی پہلی عورت ہے اور اُس سے مل کر گلزار نے جو انوکھا تجربہ حاصل کیا ہے وہ روگ کی طرح اس کے ذہن سے چمٹا ہوا ہے۔ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی وہ خیال کر رہا تھا کہ میم صلیب اُس سے خاص اخص انداز میں ملی ہے اور کبھی اُسے بھول نہیں پائے گی۔ اُس نے بڑے فخر سے مجھے بتایا کہ برف باری

وہ بولا ”لالہ! تم دیکھتے نہیں ہو، چھ بچے ہیں ان کے ساتھ، بچوں والی ٹیلی تو کباز کر دیتی ہے ہر چیز کا“ میں نے کہا ”بھلے ماس“ آدھا سیزن گزر گیا ہے۔ باقی جو آدھا رہ گیا ہے وہ بھی خالی گزر گیا تو کیا کرو گے، کسٹر تو کہیں نظر نہیں آ رہا، تمہیں قسمت سے مل رہا ہے تو کیوں ٹھکرا رہے ہو؟“ وہ جل کر بولا ”لالہ! ایسے کسٹر سے کامیاب خالی ہی رہے تو بہتر ہے۔“

میں نے کہا ”گزارے! کسٹر تو وہی ہے جسے تم نے پچھلے سال بڑے شوق سے کامیاب دیا تھا مگر اب تمہاری سوچ وہ نہیں ہے..... بڑی بے وقوفی کا کام کر رہے ہو تم۔ یہ بھی نہیں سوچتے ہو کہ پورے ایک گھرانے کا بوجھ تمہارے کندھوں پر ہے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ تنک کر بولا۔

”مطلب یہ کہ عشق سے خالی پیٹ نہیں بھرتا..... جس کا انتظار کر رہے ہو وہ نہیں آئی اور نہ ہی آئے گی۔ یہ لکھ لومیری طرف سے کاغذ پر۔“

اُس کا رنگ ایک دم پھیکا پڑ گیا۔ کچھ دیر خاموش رہا، پھر ذرا سنبھل کر بولا۔

”لالہ! تم بالکل غلط سمجھ رہے ہو۔ ایسی بات نہیں یہ لو چاہی..... جس کو مرضی دے دو کامیاب“ وہ چاہی میرے سامنے میز پر رکھ کر تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

اُسی ہفتے وہ بیمار پڑ گیا۔ پہلے سر میں درد ہوا پھر تیز بخار چڑھ گیا۔ پانچ چھ روز اُس نے ڈاکٹر کی دوائی کھائی پھر کامیاب کا کام اپنے دوست جماعت علی کے سپرد کر کے گاؤں چلا گیا۔ گاؤں سے اُس کی واپسی کوئی ایک ماہ بعد ہوئی۔ میں نے اُسے دیکھا تو بہت حیران ہوا۔ وہ بے حد کمزور نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں میں جیسے ایک مستقل آگ سی جل رہی تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ جہلم جا رہا تھا۔ وہاں اُس کا ایک چچا

دسمبر کا تیسرا ہفتہ گزرا اور چوتھا بھی گزر گیا۔ لیکن میم صاحبہ نہیں آئی۔ گزار کی حالت قابل رحم تھی۔ وہ ظاہر کچھ نہیں کرتا تھا لیکن ایسی ”بیاریاں“ چھپی کب رہتی ہیں۔ اُس کا کھانا چنا چھوٹا ہوا تھا۔ رنگ زرد ہو چکا تھا اور ریتجے سے آنکھیں دھندلائی رہتی تھیں۔ ہر روز علی صبح وہ اپنے ہاتھوں سے کامیاب کی جھاڑ پونچھ کرتا، جھاڑو دیتا۔ گراؤنڈ میں پانی وغیرہ لگاتا۔ پھر گھوڑے کے کھانے دانے اور مالش سے فارغ ہو کر چشمے کے کنارے جا بیٹھتا اور اپنی نگاہیں دُور نیچے وادی میں بل کھاتی ہوئی سیاہ سڑک پر لگا دیتا..... یہاں تک کہ شام ہو جاتی۔

یہ جنوری کی دو یا تین تاریخ کی بات ہے۔ چھٹی کا دن تھا۔ میں اپنے کوارٹر کے صحن میں بیٹھا سورج اور بادلوں کی آنکھ پھولی دیکھ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میرے ملازم نے دروازہ کھولا۔ سرگودھے سے آئے ہوئے ایک پارسی ڈاکٹر صاحب مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ ساتھ میں ان کے بیوی بچے بھی تھے۔ میں نے ذہن پر زور دیا تو ان کی صورت یاد آ گئی۔ وہ ڈیڑھ سال پہلے گرمیوں کے سیزن میں یہاں چند روز قیام کر چکے تھے۔ ”یہاں“ سے میری مراد گزار کا کامیاب ہے۔ اس قیام کے دوران مجھ سے اُن کی تھوڑی بہت علیک سلیک ہو گئی تھی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو اندر بلایا۔ انہوں نے اپنا مسئلہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ اُن کی بیوی بچے ایک بار گزار کے کامیاب میں رہ چکے ہیں اب وہ خد کر رہے ہیں کہ گزار کے کامیاب میں ہی رہیں گے۔ دوسری طرف گزار کا کامیاب خالی ہونے کے باوجود انہیں دینے پر رضامند نہیں ہے۔

میں نے گزار کو بلایا۔ وہ کچھ برہم دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اُسے ایک طرف لے جا کر کہا ”کیا بات ہے بھئی کیوں انکار کر رہے ہو ڈاکٹر صاحب کو؟“



اور جگہ ہونے لگی تھی تو اُس نے محبوبہ سے کہا تھا ”پیارا! میری جان تو تمہارے پاس ہے میرا باپ مجھے نہیں میری لاش کو سہرا باندھ رہا ہے۔“ لاش نے سہرا باندھا تھا، اپنی شادی کے چاول کھائے تھے..... اور پھر اس لاش نے دس عدد بچے پیدا کیے تھے۔ اب یہ لاش سب کچھ بھول چکی تھی۔ دودھ جلیبیاں کھاتی تھی۔ ادھر رڈ کے پٹی تھی اور بالکل ”زندہ انسانوں“ کی طرح لمبے لمبے ڈکار لیتی تھی۔

رات آٹھ بجے کے قریب جب میں اپنی سرکاری جب میں گلزار کے گاؤں ”جاہو“ جانے کی تیاری کر رہا تھا جماعت خاں میرے پاس آیا اور اُس نے بتایا کہ گلزار جہلم جانے کے لیے آج تین بجے ڈلہوزی سے روانہ ہو گیا ہے اور میں سرپکڑ کر رہ گیا۔ دو ہفتے بعد میں نے جہلم کے ایڈریس پر گلزار کا پتہ کرایا۔ میرے ہیڈ کوائسٹریل کو گلزار کے چچا زاد بھائی نے بتایا کہ گلزار اُس کے پاس آیا تھا۔ پانچ چھ روز اُس نے کام کیا۔ بیماری سے اٹھا تھا، ابھی کمزوری باقی تھی اُسے پھر بخار چڑھنے لگا۔ کہنے لگا کہ لاہور جا کر بڑے ہسپتال میں دکھاؤں گا بس میں بیٹھا اور لاہور چلا گیا۔ ابھی تک واپس نہیں آیا۔

یہ اطلاع میری توقع کے عین مطابق تھی۔ مجھے گلزار کی بیماری کا پتہ تھا اور اُس ”بڑے ہسپتال“ کا بھی جہاں اُس نے جانا تھا۔ وہ یقیناً جن جن عرف جینی کی تلاش میں تھا۔ وہ کوئی بچہ ہوتا تو میں اسے ڈانٹ ڈپٹ کر سمجھا لیتا۔ وہ عاقل بالغ اور اپنے اچھے بڑے کا ذمے دار تھا۔ میں اُسے کہاں تک رسی ڈال کر رکھتا اور پھر میری اپنی مصروفیات بھی تھیں۔ تمنا دار کو تو بعض اوقات آٹھوں پہر ڈیوٹی پر رہنا پڑتا ہے۔ میرے لیے بھی اُس تھانے میں سو طرح کے بکھیرے تھے۔ ہر تیرے چوتھے روز کوئی نہ کوئی سنگین واردات ہو جاتی تھی۔ مارچ کے آخر میں

زاد بھائی ویلڈنگ کا کام کرتا ہے۔ ابھی ادھر ڈلہوزی میں تو کوئی کام ہے نہیں وہ سوچ رہا ہے کہ وہاں جہلم میں چچا زاد بھائی کے ساتھ دو تین ماہ لگا آئے۔

میں جانتا تھا بات کچھ اور ہے۔ پولیس والوں کا واسطہ رات دن جھوٹ بولنے والوں سے رہتا ہے۔ انہیں جھوٹ سچ کی پہچان عام آدمی سے زیادہ ہوتی ہے۔ مجھے شبہ تھا کہ جہلم کا صرف بہانہ ہے۔ گلزار داتا کی مگر لہور جائے گا اور وہاں میم صاحبہ کو تلاش کرے گا..... اور اگر جہلم گیا بھی تو بہت جلد وہاں سے بستر بوریا اٹھا کر لاہور پہنچ جائے گا۔ لاہور سے جہلم کا فاصلہ ہی کتنا ہے۔ زیادہ سے زیادہ سو میل۔ میں نے سوچا کہ گلزار کو روکنا چاہئے۔ وہ آگ سے کھیلنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کا جلنا یقینی تھا کیونکہ حالات نے اُس کے لباس پر غریبی کا تیل چھڑک رکھا تھا۔ گلزار میری والدہ کو اچھا لگتا تھا اس لیے مجھے بھی اچھا لگتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جسے ماں جی نے بیٹا کہہ کر پکارا ہے وہ اجنبی شہر میں رسوا ہو اور ایک فاحشہ کی خاطر اپنی عزت اور جان خطرے میں ڈالے۔ میں نے ارادہ کیا کہ آج رات اپنی نیند گلزار کی بہتری کے لیے قربان کروں، چھٹی کے بعد گلزار کے گاؤں پہنچوں اور اُس کے گھر والوں سے کہوں کہ وہ منگنی شہنشی کو چھوڑیں اور سیدھے سبھاؤ دو بول پڑھوا کر گلزار کے پاؤں میں بیوی کی زنجیر ڈال دیں۔ یہ حقیقت ہے کہ شادی عشق کے بڑے بڑے ڈھیت بھوتوں کو بھی مار بھگاتی ہے۔ عاشق ”شوہر“ بن کر گھر گرجھتی کے ایسے چکروں میں اُلجھتا ہے کہ دھیرے دھیرے سب کچھ بھول جاتا ہے۔ خود میرے پیارے بھتیجے بلال شاہ کے ساتھ بھی اس سے ملتا جلتا واقعہ ہو چکا تھا۔ آغاز شباب میں وہ ایک لڑکی کے عشق میں گرفتار ہوا تھا۔ وہ بھڑبھڑایاں پالنے والے لوگ تھے۔ جب بلال شاہ کی شادی کسی

اطلاع دی وہ ہرگز تسلی بخش نہیں تھی۔ انہوں نے بتایا کہ پچھلے مہینے گلزار نہ صرف لاہور پہنچا تھا بلکہ میم صاحبہ سے ملنے اُس کی رہائش گاہ تک بھی گیا تھا۔ یہ وسیع و عریض رہائش گاہ ماڈل ٹاؤن کے ایک شاندار علاقے میں تھی اور اس علاقے سے ایریا غیرہ شخص حاصل قدم بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ میرے کانسیلوں کی حاصل کردہ معلومات کے مطابق میم صاحبہ کے والد گرامی کا نام الفرید تھا۔ الفرید کی عمر کا ایک بہت لمبا چوڑا انگریز تھا۔ وہ کئی گز لمبی کار میں گھومتا تھا اور اُس کی کار میں ہر وقت ایک نہایت خوفناک صورت کا براؤن کتا موجود رہتا تھا۔ الفرید کی رہائش گاہ کے نزدیک ہی ایک کٹھی میں کوئی کرٹل صاحب رہتے تھے۔ کرٹل کوٹھی کا چوکیدار پولیس کار میٹارڈ ملازم تھا۔ میرے کانسیلوں نے اسی ملازم سے رابطہ کر کے گلزار کے بارے میں سن گن لی تھی۔ کرٹل کے چوکیدار نے بتایا تھا کہ پچھلے مہینے پندرہ سولہ تاریخ کو انگریز الفرید کی کٹھی میں کوئی پارٹی تھی۔ گیٹ پر روشنیاں لگی تھیں اور پندرہ بیس گاڑیاں کھڑی تھیں۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے شلوار قمیص والا ایک نوجوان گیٹ پر آیا اور چوکیدار سے باتیں کرنے لگا (اس نوجوان کا حلیہ گلزار سے ملتا جلتا تھا) اُس نے پہاڑی چپل پہن رکھی تھی اور سر پر چڑالی طرز کی ٹوپی تھی۔ وہ کافی دیر مسٹر الفرید کے چوکیدار سے باتیں کرتا رہا۔ پھر ان باتوں نے بحث کی شکل اختیار کر لی۔ ایک دو اور ملازم بھی اکٹھے ہو گئے اور انہوں نے نوجوان کو دھکے دے کر گیٹ سے ہٹا دیا۔ اگلے روز کرٹل کے چوکیدار نے اس پہاڑی نوجوان کو پھر کٹھی کے گرد منڈلاتے دیکھا۔ اس سے پہلے کو وہ اُس سے پوچھ گچھ کرتا مسٹر الفرید کی کٹھی سے سرخ رنگ کی گاڑی نکلی..... نوجوان نے ہاتھ دے کر گاڑی کو روکا۔ اُس کی کھڑکی سے جھک کر کچھ دیر

سست دھار کے نزدیک ڈکیتی کی ایک بڑی واردات ہوئی اور میں اُس میں ایسا الجھا کہ دو تین ہفتے ارد گرد کی خبر نہ رہی۔ پٹھانکوٹ اور چمہا میں گفتیش کرنے کے بعد ایک روز میں ڈلہوزی واپس آیا تو میرے اے ایس آئی نے کئی دوسری اطلاعات کے ساتھ ساتھ گلزار کے بارے میں بھی اطلاع دی۔ اُس نے بتایا کہ گلزار کی ماں گاؤں سے آئی ہوئی ہے اور میرے ہی کوارٹر میں قیام پذیر ہے۔ وہ گلزار کے بارے میں بہت پریشان تھی اور چاہتی تھی کہ لاہور میں گلزار کا پتہ کرایا جائے۔ میرے اے ایس آئی نے مجھ سے پوچھے بغیر ہی دو ہیڈ کانسیبل روانہ کر دیئے تھے تاکہ وہ گلزار کا پتہ معلوم کریں۔

اے ایس آئی اس کے سوا اور کچھ بھی کیا سکتا تھا۔ بہر حال میں گھر پہنچا۔ گلزار کی ماں کے ساتھ اُس کی بڑی بیٹی بھی آئی تھی۔ دونوں زار و قطار رو رہی تھیں۔ گلزار نے ڈلہوزی سے جانے کے بعد کوئی پیسہ نہیں بھیجا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا تھا کہ گھر میں فاقے چل رہے تھے۔ یہ فاقے بھی برداشت کیے جاسکتے تھے مگر یہ تو پتہ چلتا کہ گلزار ہے کہاں۔ جہلم سے گلزار کے چچا زاد نے جو خط لکھا اُس میں یہی بتایا تھا کہ وہ چند روز اُس کے پاس ٹھہرنے کے بعد لاہور چلا گیا ہے۔ میں نے ماں بیٹی کو ہر طرح تسلی دی اور انہیں خود واپس گاؤں چھوڑ کر آیا۔ میں نے انہیں کہا جیسے ہی گلزار کا پتہ معلوم ہوتا ہے میں انہیں خود بتاؤں گا۔ واپس آتے ہوئے میں نے گلزار کے بھائی کی جب میں چپکے سے چند روز کا خرچہ ڈال دیا۔

لاہور گئے ہوئے کانسیبل پورے ایک ہفتے بعد واپس آئے۔ بڑے ہوشیار کانسیبل تھے اور سادہ کپڑوں میں سن سمن لینے کا انہیں وسیع تجربہ تھا۔ ان میں سے ایک کانسیبل نے ”شاہی“ والے کیس میں بڑی مدد کی تھی۔ ان کانسیبلوں نے گلزار کے متعلق جو

# حقوق العباد کونسا ہے شائع ہو گیا ہے

## تاریخ انسانیت کی شاہکار دستاویز جس میں

- ▶ جنگ وجدل اور مذہب کے ہاتھوں استحصال انسانیت کب، کیوں اور کیسے ہوا؟
  - ▶ انسان کے ہاتھوں انسان کی تذلیل کب، کیوں اور کیسے ہوئی؟
  - ▶ نظام کائنات کے اندر موجود عدل و مساوات کے رنگارنگ مناظر کو انسان نے کیسے کیسے روپ دیئے؟
  - ▶ حقوق انسانی اور فرائض انسانی کی تشریح و توضیح مذاہب انسانی میں کیا ہے؟
  - ▶ اسلام میں حقوق انسانی کی غرض و غایت اور اس کی انقلابی اصلاحات کیا ہیں؟
  - ▶ دنیائے عالم میں حقوق انسانی کا احترام کیسے، کیوں اور کب پیدا ہوا؟
  - ▶ پاکستان میں حقوق انسانی کی صورتحال کا کیا منظر ہے؟
  - ▶ ان سب سوالات کا جواب آپ کو اس عظیم نمبر میں ملے گا جو سیارہ ڈائجسٹ کی ایک عظیم روایت کا دلکش اور اچھوتا اقدام ہے۔
- قیمت: 160 روپے

سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ ریوازا گارڈن لاہور۔ فون: 042-37245412



دو تین روز کے اندر میں نے تھانے میں اپنے ضروری کام نیتائے اور کانٹیل احسان الہی کو لے کر ڈلہوڑی سے عازم لاہور ہو گیا۔ ہم پٹھانکوٹ سے ٹرین میں پنڈی پہنچے اور وہاں سے بذریعہ بس ایک دشوار سفر کے بعد لاہور آ گئے۔ یہ اپریل کا مہینہ تھا۔ لاہور میں ابھی گرمی کا زور نہیں ہوا تھا لیکن ڈلہوڑی کی ٹھنڈی ٹھار ہواؤں سے نکل کر آئے تھے لہذا ہمیں کافی گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ لاہور پہنچنے ہی میں نے مقامی تھانے کا رخ کیا۔ ایس ایچ او تھانہ سگھ ایک مددگار شخص تھا۔ میرے دونوں کانٹیل پہلے ہی اُس سے مل چکے تھے لہذا اس کیس کی الف ب اُسے معلوم تھی۔ وہ مجھے کچھ ڈرا ڈرا نظر آیا۔ اس ڈر کی وجہ کوئی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ میں جس معاملے کی چھان بین کے لیے یہاں آیا تھا اُس میں مسٹر الفریڈ اور لالہ ہریشاد جیسے لوگوں کا نام آ رہا تھا۔ اگر خدا خواستہ یہ معاملہ بڑھ جاتا تو تھانہ سگھ کے لیے تو قیامت ہی آ جاتا تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ کوئی بھی کارروائی کرنے سے پہلے تھانہ سگھ کو سب کچھ بتا کر پوری طرح اعتماد میں لے لوں۔ میں نے اُسے گلزار اور جین (میم صاحب) کی پوری سنواری سنائی۔ جب میں نے تھانہ کو بتایا کہ مسٹر الفریڈ کی یہ خوبصورت بیٹی گھر سے دُور جا کر کیا کل کھاتی رہی ہے تو وہ بھی ششدر رہ گیا۔..... ناجائز تعلقات اور وہ بھی بالکل معمولی قسم کے لوگوں سے..... حیرت کی بات تھی۔ جین جیسی لڑکیاں تو جس پھل کی طرف ہاتھ بڑھائیں وہ شاخ سمیت جھک آتا ہے۔ اعلیٰ خاندان کے حسین و جمیل نوجوان جین جیسی لڑکی سے دوستی کے خواہشمند ہو سکتے تھے۔ پھر وہ کیوں راج مزدوروں ڈرائیوروں اور چوکیداروں پر نگاہ کر رہی تھی..... تھانہ سگھ میری بات سن کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کہنے لگا۔

”نواز خان! میری سمجھ میں ایک ہی بات آتی ہے۔ یہ جو ٹکڑی ہے ناں ٹھسی (اُٹلی) پیدا ہوئی

باتیں کرتا رہا۔ اس کا انداز بڑا خوشامدی تھا۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی کا دروازہ کھل گیا اور نوجوان اُس میں بیٹھ کر چلا گیا۔ اس واقعے کے بعد کرٹل کے چوکیدار نے اُسے پھر نہیں دیکھا..... کرٹل کے چوکیدار نے جو کچھ بتایا تھا اُس کے مطابق سرخ رنگ کی وہ گاڑی ماڈل ٹاؤن کے سب سے امیر اور بااثر شخص لالہ ہریشاد کے اکلوتے بیٹے پر تھی پال کی تھی۔ چوکیدار کے مطابق پر تھی پال ایک بہت بڑھا لکھا اور فیشن ایبل نوجوان ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑا غنڈہ بھی ہے۔ درجنوں لوگوں کے ہاتھ پاؤں توڑ چکا ہے اور اُسے جانے والے اُس کے نام سے کانپتے ہیں۔ یہ پر تھی پال مسٹر الفریڈ کی بیٹی جین کا منگیتر ہے اور اکثر مسٹر الفریڈ کے گھر آتا جاتا رہتا ہے۔ اُس کی گاڑی میں پہاڑی نوجوان کا بیٹھ کر چلے جانا خطرے کی نشانی ہے۔

دونوں کانٹیلوں نے اپنے طور پر بہت کوشش کی تھی کہ گلزار کا کوئی سراغ ملے لیکن پر تھی پال کی گاڑی میں بیٹھ کر چلے جانا اُس کا آخری سراغ ثابت ہوا تھا۔

کانٹیلوں کی دی ہوئی اطلاع کسی طور پر تسلی بخش نہیں تھی۔ حالات بالکل ویسا رخ اختیار کر رہے تھے جیسا میں نے اندازہ لگایا تھا۔ گلزار میم کی سنہری زلفوں میں اُلجھ کر لاہور پہنچا تھا اور وہاں سے گم شدہ ہو گیا تھا۔ ادھر ڈلہوڑی میں اُس کے گھر والوں پر قیامت گزر رہی تھی۔ میں نے گلزار کی والدہ سے وعدہ کیا تھا کہ جلد گاؤں آ کر اُسے گلزار کی خیر خیریت سے آگاہ کروں گا اور ہو سکتا ہے گلزار کو اپنے ساتھ ہی لے آؤں اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس منہ سے گاؤں جاؤں اور انہیں تسلی دوں۔ گلزار کو ڈلہوڑی سے نکلے اب قریباً سات ہفتے ہو چکے تھے اور گزرنے والے ہر دن کے ساتھ اُس کی گمشدگی سنگین ہوتی جا رہی تھی۔

سے جانتے تھے اور کئی کیسوں میں میری مدد کر چکے تھے۔ انہوں نے میری بات تسلی سے سنی۔ ”مسٹر الفریڈ اور لالہ ہر پر شا دونوں شہر کے معزز لوگوں میں سے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ قانون سے بالاتر کوئی نہیں۔ تم اگر ہر پر شا کے بیٹے سے پوچھ گچھ کرنا چاہتے ہو تو ضرور کرو۔ ہاں..... یہ بات کہ وہ بہت مصروف شخص ہے۔ میں فون پر بات کر کے اُس سے وقت لے لوں گا پھر تمہیں بتاؤں گا۔“

مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ جہاں اتنے دن انتظار کیا تھا وہاں ایک آدھ دن مزید انتظار کرنے سے کیا فرق پڑتا تھا۔ تیسرے روز ایس ایس بی صاحب نے انسپکٹر ناتھا سنگھ کو فون کر کے بتایا کہ انسپکٹر نواز خان آج سہ پہر ٹھیک تین بجے پر تھی پال کے آفس واقع ڈپوس روڈ پہنچ جائے۔

میں ٹھیک تین بجے پر تھی پال کے دفتر پہنچ گیا۔ یہ دفتر ایک بہت بڑی عمارت میں تھا۔ عمارت کی پیشانی پر دھات کے بڑے خوبصورت الفاظ میں ”ونڈر کارپس ڈیپارٹمنٹ“ کے الفاظ آویزاں تھے۔ پر تھی پال نے ایک آراستہ پیراستہ دفتر میں مجھے ملاقات کا ”اعزاز بخشا“ وہ شکل و صورت سے ہی ایک گڑا ہوا رئیس زادہ نظر آتا تھا۔ گلے میں سونے کی موٹی زنجیر، ہاتھوں میں ڈائمنڈ کی انگوٹھیاں۔ آنکھوں پر سنہری فریم کی عینک۔ وہ ایک وسیع میز کے پیچھے مجھے خشمک نظر سے گھور رہا تھا۔ جیسے پوچھ رہا ہو۔ اچھا..... تو یہ تم ہو وہ دو ٹکے کے انسپکٹر جس نے مجھ سے پوچھا تھا چھ کی جرأت کی ہے۔

”بیٹھو“ اس نے اپنے بھاری بھر کم لہجے میں کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں بیٹھ گیا۔ ”کہو! میں کیا سیوا کر سکتا ہوں تمہاری“ وہ اُکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ اُس کے انداز سے لگتا تھا جیسے پلڑم میں ہوں اور وہ تمہارا ہے۔

تھوڑا بہت میں بھی جانتا ہوں اسے۔ اس میں کوئی گل سیدھی ہے ہی نہیں۔ بس دوسروں کو حیران کرنا چاہتی ہے۔ چاہے اس کے لیے سارے کپڑے اُتار کر بھرے بازار میں کھڑا ہونا پڑے۔ یہ کچھل دیوالی کی بات ہے۔ وہ اور اُس کی سہیلی حرا حمادی..... کیا نام ہے اُسکا..... ہاں پریم..... وہ دونوں اپنی دس گز لمبی کار میں بیٹھ کر پرانی اتار کلی میں دہی کچے کھانے پہنچ گئیں۔ اوپر سے لباس ایسا پہن رکھا تھا کہ چھ سال کا بچہ بھی دیکھے تو ایک دم اٹھارہ سال کا ہو جائے۔ وہاں تو بھی جمع لگ گیا تھا تماشا بینوں کا۔ ایک سے بڑھ کر ایک بہن کا دیر تھا۔ راگبیر بھی رُک رُک کر دیکھنے لگے۔ ٹریفک جام ہو گئی۔ میرا ایک سب انسپکٹر اُدھر سے گزر رہا تھا۔ اُس نے اُن دونوں کو سمجھایا کہ وہ کیوں اپنا اور دوسروں کا تماشا بنا رہی ہیں۔ بازاروں میں اچھے بُرے ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ کوئی مصیبت پڑ جائے۔ اگر دہی کچے کھانے کا اتنا ہی شوق ہے تو گھر جا کر کھالیں..... بس اتنی سی بات پر حرا حمادی آگ بگولا ہو گئیں۔ سب انسپکٹر کی بے عزتی کر ڈالی وہ تو بندہ سمجھ دار تھا ہوا کا زرخ دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا ورنہ ہو سکتا تھا پتھر شہ ہی پڑ جاتے پتھارے کو۔“

انسپکٹر ناتھا سنگھ اور میں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ناتھا سنگھ نے بڑی ہمدردی کے ساتھ مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ معمولی لوگ نہیں ہیں اور اگر میں ان سے پوچھ گچھ کرنا ہی چاہتا ہوں تو اپنے آپ کو پوری طرح تیار کر لوں۔ ناتھا سنگھ کی بات میں وزن تھا میں نے اُسی روز ہیڈ کوارٹر میں انگریز ایس ایس بی صاحب سے رابطہ قائم کیا اور انہیں تمام صورتحال بتائی۔ عام طور پر انگریز افسر اپنے کسی ہم وطن کے خلاف کسی مقامی کو کارروائی کی اجازت نہیں دیا کرتے تھے لیکن ایس ایس بی صاحب مجھے عرصے



جاتے ہیں اکثر پارٹیاں رات دیر تک چلتی رہتی ہیں اور شام کو گئے ہوئے مہمان صبح ہی واپس آتے ہیں۔ میں نے کہا ”پرچی پال صاحب! آپ کے بیان سے ظاہر ہے کہ شام کے وقت آپ مسٹر الفریڈ کی کوٹھی میں تھے۔ چند گواہیوں کے مطابق شام کے وقت کوٹھی کے گیٹ پر چھوٹا سا جھگڑا ہوا تھا۔ ایک اجنبی نوجوان کوٹھی میں جانا چاہتا تھا۔ چوکیداروں نے اُسے روکا تھا، اور بحث و تکرار کے بعد دھکے دے کر اُسے وہاں سے چلا کیا تھا۔ آپ کو اس جھگڑے کے بارے میں پتہ ہے؟“

پرچی پال بولا ”تم نے ذکر کیا ہے تو مجھے یاد آیا ہے۔ شام کے وقت گیٹ پر کچھ ہلاکلا ہوا تھا۔ ایک خنٹی سا پہاڑی لڑکا تھا۔ کپڑے بوسیدہ تھے اور داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ غالباً اُس نے کچھ نشہ وغیرہ بھی کر رکھا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ میں نے میم صاحبہ سے ملنا ہے۔ میم صاحبہ سے اُس کی مراد غالباً جینی ہی تھی۔ چوکیدار نے پوچھا میم صاحبہ سے تمہارا کیا واسطہ ہے۔ وہ بولا بس میں میم صاحبہ کا خادم ہوں اُن کا سیوک ہوں۔ انہوں نے میرا بنگلہ بک کر رکھا ہے۔ میں نے اُن سے پوچھا ہے کہ وہ میرے بنگلے میں رہنے آئیں گی یا نہیں..... پتہ نہیں کیا وہی جانی بک رہا تھا۔ چوکیدار پہلے تو اُسے سمجھاتے رہے، وہ باز نہیں آیا تو انہوں نے اس کی مرمت کردی اور دھکے دے کر وہاں سے ہٹا دیا۔“

میں نے پوچھا ”موقع پر موجود مہمانوں کا نوجوان کے بارے میں کیا خیال تھا؟“

وہ بولا ”خیال کیا ہوتا تھا۔ وہ اُسے ولی اللہ سمجھنے سے تو رہے۔ سب دیکھ رہے تھے کہ وہ پاگل سانفے باز ہے۔ میں نے پوچھا ”اس نوجوان سے آپ کی دوسری ملاقات کب ہوئی۔“

وہ بولا ”ابھی تک تو نہیں ہوئی اگر ہوگئی تو میں

میں نے کہا ”پرچی پال صاحب! ڈھوڑی کا ایک نوجوان گھرار پچھلے ڈیڑھ ماہ سے لاپتہ ہے ہم اُس کی تلاش میں یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہ نوجوان مسٹر الفریڈ کی رہائش گاہ کے آس پاس دیکھا گیا تھا۔ میں اسی سلسلے میں آپ سے چند سوال کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ طنزیہ لہجے میں بولا ”میں آپ کے سوالوں کے جواب دینے کے لیے ہی تو یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔ اب آپ منہ سے کچھ نکالیں گے تو مجھے پتہ چلے گا ناں کہ مجھے کیا جواب دینا ہے۔“

میں نے کہا ”پچھلے مہینے سولہ تاریخ کو بروز جمعرات مسٹر الفریڈ کی رہائش گاہ پر ایک سالگرہ پارٹی تھی کیا آپ اس پارٹی میں شریک ہوئے تھے؟“

”بالکل ہوا تھا“ پرچی پال نے جواب دیا ”ہوتا کیوں نہ وہ جینی کی سالگرہ تھی اور جینی میری ہونے والی الانف پارٹنر یعنی کیا کہتے ہیں بیوی ہے۔“

”آپ اُس پارٹی میں کب تک رہے۔“

”شروع سے آخر تک“

”میں ناٹم پوچھنا چاہتا ہوں۔“

پرچی پال مجھے گھورتے ہوئے بولا ”بال کی کھال اُتارنا چاہتے ہو تو یہ کوئی اچھا شوق نہیں ہے۔“

”گستاخی، معاف، میں شوق کے لیے نہیں قانونی ضرورت کے تحت پوچھ رہا ہوں۔“

وہ گہری سانس لے کر بولا ”پارٹی قریباً ساری رات چلتی رہی تھی۔ صبح دم اکثر مہمان اینکسی میں ہی سو گئے تھے۔ میں بھی صبح دس گیارہ بجے اُٹھ کر آیا تھا۔“

میں نے پوچھا ”کیا اس سے پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے کہ آپ نے اپنی مگیت کے گھر شب بسر کی ہو؟“

وہ خٹکے لہجے میں بولا ”بالکل ہوتا رہا ہے نچلے لوگوں جیسی تنگ نظری ہمارے گھرانوں میں نہیں ہوتی۔ ہم اکٹھے گھومتے پھرتے ہیں۔ پارٹیوں میں



کونھی کا جہازی ساز گیٹ تھا۔ چوکیدار محمد حسین نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ وہ کہاں تھا۔ شلوار قمیص والا پہاڑی نوجوان کہاں ٹھوم رہا تھا اور پرتھی پال نے کس جگہ گاڑی روک کر نوجوان کو گاڑی میں سوار کرایا تھا۔

میں نے چوکیدار محمد حسین سے کہا ”تم جو کچھ بتا رہے ہو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ 17 مارچ کی صبح پرتھی پال نے گلزار کو کسی بُرے ارادے کے ساتھ اپنی گاڑی میں بٹھایا اور کہیں لے کر چلا گیا۔ اب دوہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ وہ اُسے قتل کر چکا ہے یا پھر کسی محفوظ جگہ پر جس بیجا میں رکھا ہوا ہے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایسی محفوظ جگہ کون سی ہو سکتی ہے۔“

محمد حسین نے کہا ”جناب! اس بارے میں میں نے بھی سوچ بچار کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو کالا شاہ کاکو والی فیکٹری سے پتہ کرنا چاہئے۔“

میں کالا شاہ کاکو کی فیکٹری کا ذکر پہلی بار سن رہا تھا۔ میں نے پوچھا ”یہ کس کی فیکٹری ہے؟“

محمد حسین نے بتایا ”جناب! میرے علم کے مطابق اس فیکٹری کی زمین پرتھی پال صاحب کو اپنی منگنی کے تختے میں ملی ہے۔ اب اس زمین پر وہ اپنے خرچے سے فیکٹری بنوا رہے ہیں۔ بڑی لمبی چوڑی عمارت ہے۔ سیلاب کی وجہ سے فیکٹری میں پانی چلا گیا تھا۔ اس لیے پچھلے پانچ سات مہینے سے وہاں کام نہ چلا ہوا ہے۔ پرتھی پال صاحب وہاں اکثر آتے جاتے رہتے ہیں۔ سنا ہے وہاں رنگ رلیاں بھی ہوتی ہیں۔ پرتھی پال صاحب نے وہاں دو تین کمرے بنوا رکھے ہیں۔ جہاں اپنے دفتر کی ملازم لڑکیوں کو ”نوکری پکی کرنے“ کے لیے لے جاتے رہتے ہیں۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ اگر پرتھی پال صاحب نے اُس لڑکے کو کسی بُری نیت سے گاڑی میں بٹھایا تھا تو ضرور اُس فیکٹری میں لے گئے ہوں گے وہاں ایک تو کیا سو پچاس بندے بڑی آسانی

سب سے پہلے تمہیں اطلاع دوں گا۔“

”لیکن کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ نوجوان پارٹی سے اگلے روز دس بجے کے قریب آپ کی گاڑی میں بیٹھ کر آپ کے ساتھ گیا تھا۔“

وہ سگریٹ کا کش لے کر بولا ”جن لوگوں کا یہ خیال ہے انہیں چار نمبر بس پر بٹھا کر پاگل خانے پہنچا دو۔۔۔۔۔ یا پھر انہیں باؤ لے کتے نے کاٹا ہوگا اُن کا علاج شلاج کراؤ۔۔۔۔۔“

پرتھی پال کا لہجہ بڑا تند تیز تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اگر میں نے اُسے مزید کریدنے کی کوشش کی تو وہ بھڑک جائے گا۔ میں نے موضوع بدل دیا اور تھوڑی دیر ادھر اُدھر کی باتیں کر کے اُس کے پاس سے اُٹھ آیا۔

پرتھی پال سے ملاقات کے بعد میں نے ضروری سمجھا کہ اُس چوکیدار سے ملاقات کی جائے جس نے

ایک مہینہ پہلے گلزار کو پرتھی پال کی سرخ کار میں سوار ہوتے دیکھا تھا۔ اس چوکیدار سے ملاقات کرل کی کونھی

میں ہی ہو سکتی تھی۔ شام کو میں سادہ لباس میں کرل کی کونھی جا پہنچا۔ چوکیدار کا نام محمد حسین تھا اور وہ پنجاب

پولیس میں حوالدار رہ چکا تھا۔ مہندی رنگے بالوں والا یہ ادھیڑ عمر شخص مجھے بڑے تپاک سے ملا۔ میرے

کانٹریبلوں سے اُسے میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ کرل کی کونھی سے گیٹ پر گزری کا بتا ہوا ایک

سبز رنگ کا کیمین تھا۔ اس کیمین میں دو کرسیاں اور ایک چار پائی بڑی تھی۔ ایک تھری ناٹ تھری رائفل۔ گولیوں

والی ایک بیٹل ایک نارچ، چائے کے برتن اور چایوں کا ایک بڑا کچھا۔ یہ اس کیمین کی کل کائنات تھی۔

میں محمد حسین کے ساتھ چار پائی پر جا بیٹھا۔ کونھی میں مکمل تاریکی تھی۔ معلوم ہوا کہ کرل صاحب بمعہ اہل و عیال

کہیں گئے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ کیمین کی ایک کھڑکی سے تارکول کی صاف ستھری سڑک نظر آتی تھی۔ اس سڑک

کی دوسری جانب کوئی سونے کے فاصلے پر مسٹر الفریڈ کی

ایک عورت نما لڑکی تھی۔ رنگ گندمی، آنکھیں بڑی بڑی اور جسم نازک لیکن فاقہ زدہ۔ مدقوق بوڑھا مجھے اور لڑکی کو آنسنے سامنے چھوڑ کر گناہ گار انداز میں جھونپڑے کے اندر غائب ہو گیا۔ میں چند سیکنڈز مہبوت کھڑا رہا۔ پھر تیزی سے فیصلہ کیا اور ایک طرف چل دیا۔ لڑکی پائل اور چوڑیاں چھینکائی میرے ساتھ آئی۔ کیسی سادی تھی قربان ہونے کو دل چاہ رہا تھا۔ نہ پتہ پوچھا، نہ آنے کی وجہ، نہ کوئی سوال کیا اور لڑکی میرے ساتھ روانہ کر دی..... چینی مفکر کنفیوشس کہتا ہے کہ معدہ خالی ہو تو عقل دماغ سے نکل کر معدے میں اتر جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ بھوکا شخص روٹی سے آگے کی نہیں سوچتا۔ اس بھوکے ننگے شخص کو بھی شاید صرف روٹی نظر آ رہی تھی جو اسے اپنی بہو بیٹی کی عزت کے بدلے میں ملتی تھی۔ میں لڑکی کو درختوں میں چلاتا ہوا چپ کی طرف لے آیا۔ جیب دیکھ کر وہ ایک دم حیران بلکہ خوفزدہ نظر آنے لگی۔ اس کے ہونٹوں سے ڈری سہمی آواز نکلی ”بابو صاحب! کہاں جاتا ہے؟“

”تھانے میں“ میں نے تسلی سے جواب دیا۔ لڑکی کا زرد چہرہ ایک دم تاریک نظر آنے لگا مجھے محسوس ہوا کہ وہ ایک دم بھاگ اٹھے گی۔ میں نے لپک کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ وہ تھر تھرا کپ رہی تھی۔ روہاسی آواز میں بولی ”میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے تھانیدار جی۔ میرے گھر والے کا باپ جو کہتا ہے میں وہ کرتی ہوں۔ میرا گھر والا ہسپتال میں ہے جی۔ اُس کی گردن میں جہر باد کا پھوڑا ہے۔ ہمارے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے، خالی پیٹ ہم کسی سے ٹکرا ہے کو لے سکتے ہیں۔ وہ بابو لوگ بڑے جور والے ہیں ہم اُن کا کہنا نہ مانیں گے تو کیا کر لیں گے۔ حجت تو پھر بھی جائے گی ہی، جو چند روپے پیٹ کا دو بخ بچانے کو ملتے ہیں وہ بھی نہیں ملیں گے“ وہ چہرہ ہاتھوں

سے قید رکھے جاسکتے ہیں اور اگر کسی کو قتل کر کے مدعا غائب کرنا ہوا تو بھی وہ جگہ بڑی مناسب ہے۔

رات خنک اور پرسکون تھی۔ چودھویں تاریخ تھی اپریل کی اور چاند کی بھی غالباً چودھویں پندرھویں ہی تھی۔ زرد چاند گندم کے سنہری کھیتوں پر گر کر کچھ اور بھی زرد نظر آ رہی تھی۔ میں نے اپنی جیب فیکٹری کے بلندو بالا گیٹ سے کوئی ایک فرلانگ دُور جنترا اور ٹیکر کے گھنے درختوں میں روک دی۔ میں سادہ لباس میں تھا۔ قمیص کے نیچے میں نے ہولسٹر باندھ رکھا تھا اور اُس میں بھرا ہوا سرکاری ریوالور تھا۔ فیکٹری کا اندر باہر مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا صرف لوہے کے رنگ آلود گیٹ کے قریب کچھ روشنی نظر آ رہی تھی۔ روشنی کی موجودگی میں اشارہ ملتا تھا کہ شاید فیکٹری میں چوکیدار موجود ہو لیکن یہ کوئی ضروری بھی نہیں تھا۔ میں گیٹ کے قریب سے گزرا اور درختوں میں ٹھٹھا ہوا چار دیواری کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ جونہی میں فیکٹری کے پچھوڑے پہنچا مجھے ٹھٹھک کر رُک جانا پڑا۔ فیکٹری کی دیوار کے ساتھ ہی مزدوروں کی چند جھونپڑیاں نظر آ رہی تھی۔ ایک شخص لپک کر میرے سامنے آیا اور بڑے ادب سے جھک کر سلام کی۔ وہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا، جسم پر فقط ایک لنگوٹی تھی اور چاندنی میں کپکپاہٹ نمایاں نظر آ رہی تھی۔ وہ ہاتھ جوڑ کر بولا ”معاف کرنا صاحب! اُس کا بچہ بیمار تھا وہ آنے نہ سکی۔ آج آپ نہ آتے تو میں ابھی خود چھوڑ کر آتا اُسے۔ معاف کر دیں صاحب۔ وہ بالکل تیار ہے میں ایک سیکنڈ میں حاضر کرتا ہوں اُسے.....“ پھر وہ تیزی سے مڑا اور جھونپڑے کی طرف منہ کر کے دہلی آواز میں بولا ”او راجی..... او راجی..... چل آجا باہر۔ بابو صاحب آئے ہیں.....“

میں حیرت سے گم یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ دو سیکنڈ بعد جھونپڑے کا پردہ ہلا اور ایک ہیولا سا نکل کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ چوبیس پچیس سال کی

# سیارہ ڈائجسٹ کی ایک منفرد تحقیقی اور عظیم پیشکش

## قرآنی وظائف

❖ یہ وظائف ہماری آپ کی اور ہر گھر کی پریشانیوں،  
الجھنوں اور مشکلات کا حل ہیں۔

❖ قرآن مجید کی چھوٹی چھوٹی آیات پر مشتمل یہ وظائف  
آسان، سادہ اور عام فہم زبان میں اس طور سے پیش  
کیے جا رہے ہیں کہ ہر قاری بھی ان پر بغیر کسی دشواری  
کے عمل پیرا ہو کر ان قرآنی وظائف سے اپنی  
بگڑی بنا سکے۔

❖ اولیائے کرام اور بزرگانِ دین کے مصدقہ آزمودہ اور  
پُر اثر قرآنی وظائف۔

❖ انشاء اللہ یہ نمبر بھی ماضی کی طرح آپ کی امنگوں  
پر پورا اترے گا۔



سیارہ ڈائجسٹ 16-B ساندہ روڈ، لاہور فون: 7245412



بڑے بابو صاحب نے چوکیدار کے ہاتھ پیغام بھیجا تھا کہ حنفی فیکٹری میں آجائے۔ اُسے سخت بخار تھا اور پھر بارش بھی شروع ہو گئی تھی۔ وہ نہ جا سکی۔ آج وہ اور اُس کا سسر خوف سے کانپ رہے تھے، اتنے میں میں وہاں پہنچ گیا۔ حنفہ کا سسر مجھے اندھیرے میں دیکھ کر یہی سمجھا کہ بڑے بابو صاحب نے اپنے کسی ساتھی کو بھیجا ہے۔ اُن کے سوا یہاں اور آ بھی کون سکتا تھا۔ اُس نے فوراً بھوکو میرے ساتھ روانہ کر دیا۔

میں نے حنفہ نامی ایک لڑکی سے اندر کی تمام معلومات حاصل کر لیں۔ اُس نے بتایا کہ آج کل فیکٹری میں صرف ایک چوکیدار ہے اور وہ بڑے گیٹ کے پاس لیٹا رہتا ہے یا کرسی پر بیٹھا رہتا ہے۔ بڑے بابو صاحب (پڑھی پال) کے ساتھ تین یا چار لڑکے ہوتے ہیں۔ اُن کے پاس کوئی اسلحہ وغیرہ نہیں ہوتا۔ ہاں بڑے بابو کی گاڑی میں ایک عجیب سا پستول پڑا رہتا ہے..... میں نے حنفہ کو پوری طرح اعتماد میں لے لیا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ آج سے کوئی ایک مہینے پہلے پڑھی پال نے ڈلہوڑی سے آئے ہوئے ایک لڑکے کو اغوا کیا ہے۔ ہم اُسی کو تلاش کر رہے ہیں۔ کیا وہ اس سلسلے میں ہماری کوئی مدد کر سکتی ہے۔

وہ ڈری ہوئی آواز میں بولی ”صاحب چچی! اپنے بچے کی قسم مجھے اس بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ پچھلے ایک ڈیڑھ مہینے میں میں صرف تین بار کارخانے میں گئی ہوں۔ مجھے تو وہاں بڑے بابو اور اُس کے یاروں کے سوا اور کوئی خبر نہیں آیا۔“

میں نے پوچھا کارخانے میں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں کسی کو بند رکھا جاسکے اور کارخانے میں آنے جانے والے اُسے دیکھ بھی نہ سکیں؟

وہ بولی ”ہاں جی! جورو ہے ایسی جگہ..... اور.....“ ایک دم وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ مجھے اُس کے

میں چھپا کر زار و قتار رونے لگی۔

میں نے اُسے پوچھا ”کون ہیں وہ بابو لوگ؟“ وہ روتے روتے بولی ”اس کارخانے کے مالک وہ بڑی بڑی گاڑیوں میں یہاں آتے ہیں۔“

صورت حال کافی حد تک میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ میں نے لرزتی کانٹنی لڑکی کے شانے پر ہاتھ رکھا اور بڑی نرمی کے ساتھ اُسے گاڑی کے اندر لے آیا۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ بابو اور اُس کے ساتھیوں پر زبردست چھاپہ پڑنے والا ہے۔ اگر وہ تھانے پکھری کے چکروں سے بچتا چاہتی ہے تو ہر بات صاف صاف بتا دے..... میری یہ بات ڈبلی تپتی لڑکی کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ پہلے تو ہچکچاتی رہی پھر اُس نے ہمت کر کے سب کچھ میرے گوش گزار کر دیا۔ اُس کا نام حنفہ تھا اور کوئی ایک برس پہلے اُس کی شادی ہوئی تھی۔ اُس نے جو کچھ بتایا وہ مختصر اُس طرح ہے۔

فیکٹری میں سیلاب آنے سے پہلے بابو پڑھی پال اور اس کے یار دوست ہر ہفتے اس جگہ محفل جماتے تھے۔ شراب اور جوا وغیرہ تو اس محفل میں ہمیشہ چلتا تھا کبھی کبھی کوئی لڑکی بھی بلالی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ انہیں کوئی لڑکی نہ ملی تو حنفہ کو زبردستی اٹھا کر اپنی محفل میں لے گئے۔ شیر کے سامنے کون احتجاج کر سکتا ہے۔ یہ

بھوکے شکے مزدور بھی بھوکے گھونٹ پنی کر چپ ہو رہے۔ حنفہ اس جموڑا ہستی کی سب سے خوبصورت لڑکی تھی۔ وہ ایک بار فیکٹری میں گئی تو پھر اکثر جانے لگی۔ پہلے وہ روٹی منہ بسورتی جاتی تھی لیکن جب نوٹ وغیرہ ملنے لگے تو اپنی مرضی سے جانے لگی۔ بلکہ ایک موقع ایسا آیا کہ بستی کی دوسری لڑکیاں اُس پر رشک کرنے لگیں۔ انہی دنوں فیکٹری میں سیلاب کا پانی ٹھس گیا اور کئی مہینوں کے لیے یہ خرمستیاں دم توڑ گئیں..... اب مہینے ڈیڑھ مہینے سے یہ سلسلہ پھر شروع ہو گیا تھا۔ کل بھی فیکٹری میں محفل بھی ہوئی تھی۔

اُس نے انکار کیا لیکن پھر یہ بات اُس کے دماغ میں آگئی کہ میری بات مان کر وہ پولیس کی مدد کرے گی اور بڑا باؤ کتنا بھی زور آور ہے پولیس سے زور آور تو نہیں ہو سکتا۔

اُس نے بتایا کہ فیکٹری کے اندر شمالی دیوار کے ساتھ بڑے بابو نے ایک چھوٹا سا مکان بنا رکھا ہے۔ اس میں تین چار کمروں کے علاوہ کام کرنے کا دفتر، غسل خانہ اور باورچی خانہ وغیرہ بھی ہے۔ اس مکان کا ایک چھوٹا سا دروازہ فیکٹری سے باہر کھیتوں میں کھلتا ہے۔ حسہ نے بتایا کہ اس دروازے میں اندر کی طرف اکثر تالا پڑا ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی تالا نہیں بھی ہوتا۔ وہ بولی ”صاحب جی! اگر مجھے اُس طرف آنے کا موقع مل گیا اور دروازے پر تالا نہ ہوا تو میں اندر کی کنڈی گرا دوں گی۔ آپ دروازہ کھلیں کر اندر چلے آنا۔“

..... اور اُس کمزور سی لڑکی نے یہ مشکل کام کر دکھایا۔ اُس کے فیکٹری میں چلے جانے کے ایک گھنٹے بعد میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور فیکٹری کی بلند و بالا دیوار کے ساتھ چلتا ہوا شمالی رخ پر اُس چھوٹے سے آہنی دروازے کے سامنے پہنچ گیا جواپنے گیرواں رنگ کی وجہ سے دیوار کا ہی حصہ نظر آ رہا تھا۔ قیص تھکتا کر میں نے ریوالور کی موجودگی کا یقین کیا اور پھر بہ آہستگی دروازے کو دھکیلا۔ وہ بڑی روانی کے ساتھ بے آواز کھلتا چلا گیا۔ میں نے اندر قدم رکھا اور اس کے ساتھ ہی مجھے احساس ہوا کہ میں نرم قالین پر کھڑا ہوں اور جس کمرے میں کھڑا ہوں وہ ایک دفتر ہے۔ میں نے دفتر کے اندرونی دروازے کو دھکیلا اور اُسے کھول کر ایک برآمدے میں آ گیا۔ اس برآمدے کے سامنے فیکٹری کا وسیع و عریض احاطہ نظر آ رہا تھا۔ یہ قریباً چار پانچ ایکڑ جگہ تھی۔ ہر طرف تعمیر کا سامان بکھرا ہوا تھا۔ کچھ حصے تعمیر ہو چکے تھے، کچھ ادھورے تھے اور کچھ ابھی شروع ہی ہوئے تھے۔ برآمدے کے عین

چہرے پر گہری سوچ اور تحیر کے آثار نظر آئے۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ اُسے کوئی بہت اہم بات یاد آئی ہے۔ پوچھنے لگی ”صاحب جی! یہ جو آپ نے انخواہی بات بتائی ہے یہ کب کی ہے.....“

میں نے کہا ”پچھلے مہینے سترہ اٹھارہ تاریخ کی“ وہ بولی ”مجھے انگریزی مہینے کا تو پتہ نہیں..... چاند کی وہ چندہ تاریخ تھی، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اُس رات بڑی دیر تک کارخانے کے اندر سے چکیوں کی آوازیں آتی رہی تھیں۔ آپ نے دیکھا ہی ہے ہمارے جھونپڑے کارخانے کی دیوار کے بالکل ساتھ ہیں اندر کی ساری آوازیں باہر آتی ہیں۔ ہمارا خیال ہے اُس رات بڑے بابو اندر کسی بندے کو مار رہے تھے۔ وہ جور جور سے روتا تھا اور ہائے ہائے کرتا تھا۔ بڑا ڈر لگتا تھا اُس کی آواز سن کر۔“

لڑکی کا بیان بڑا اہم تھا۔ میں نے حساب لگایا وہ چاند کی جو تاریخ بتا رہی تھی اُس کے مطابق عین سترہ مارچ کی رات آتی تھی۔ ایک طرح سے اب بات واضح ہوتی جا رہی تھی۔ 16 تاریخ ہی کی شام مسٹر الفریڈ کی کونٹری پر ہنگامہ ہوا تھا اور چونکیدا محمد حسین نے ہنگامہ کرنے والے نوجوان کا جو حلیہ بتایا وہ سو فیصد گھزار کا تھا۔ اگلے روز دس بجے یہی گھزار اپنے رقیب پر تھی پال کی سرخ گاڑی میں بیٹھ کر کسی نامعلوم مقام کی طرف چلا گیا۔ یہ سترہ تاریخ تھی، سترہ اور اٹھارہ تاریخ کی درمیانی شب کو پرچی پال کی زیر تعمیر فیکٹری سے نامعلوم مظلم کی آوازیں باہر تک سن گئیں۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ ابھی اندھیرے میں تھا۔ مجھے اسی اندھیرے کا پردہ چاک کرنا تھا۔

میں نے حسہ نامی اس لڑکی کو حفاظت کی ضمانت دی اور پوری طرح اعتماد میں لینے کے بعد کہا کہ وہ آج رات کسی طرح فیکٹری کے اندر جانے میں میری مدد کرے۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی۔ پہلے تو







کیوں تشدد کر رہا تھا۔ میرا دھیان رہ رہ کر اس تحریر کی ابتدائی سطروں کی طرف جا رہا تھا اور مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ان سطروں میں ایک اہم نقطہ چھپا ہوا ہے۔ پرتھی پال نے لکھا تھا کہ وہ پورچ میں پہنچا تو پتہ چلا کہ گاڑی کو سونا لے گئی ہے۔ یہ کوئی دس بجے کا مکمل تھا۔ اور یہی وقت تھا جب گرل کے چوکیدار محمد حسین نے سرخ گاڑی کو گیٹ سے نکلنے اور آگے جا کر اس میں گزار کو سوار ہوتے ہوئے دیکھا۔ میں پرتھی پال کی سرخ گاڑی کو اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔ اُس کی پچھلی کھڑکیوں اور ایک سکرین پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ چوکیدار محمد حسین نے جب اپنے کیمین سے اس گاڑی کو دیکھا ہوگا تو اُسے ٹھیک سے پتہ نہیں چل سکا ہوگا کہ گاڑی کون چلا رہا ہے لیکن چونکہ پرتھی پال کی گاڑی تھی اور وہ اسی پر یہاں پہنچا تھا لہذا محمد حسین نے تصور کیا کہ گاڑی پرتھی پال چلا رہا تھا۔

اب اس ڈائری کی تحریر بتا رہی تھی کہ گاڑی پرتھی پال نہیں وہ سونا نامی لڑکی چلا رہی تھی۔ سونا نامی یہ لڑکی کون تھی اور پرتھی پال سے اُس کا کیا رشتہ تھا؟ اس بارے میں ڈائری کچھ نہیں بتاتی تھی۔ میں نے ڈائری کی اچھی طرح ورق گردانی کی۔ پچھلے ڈھائی مہینوں کی روداد میں تین چار جگہ اس سونا نام کی لڑکی کا ذکر آیا تھا لیکن اس ”ڈکر“ سے لڑکی کے حدود اربے پر کوئی روشنی نہیں پڑتی تھی۔

میں اپنی سوچوں میں کم بیٹھا تھا۔ یہ انسپکٹر تھا سنگھ بی کا کرہ تھا۔ وہ کسی تفتیش پر گیا ہوا تھا۔ اُس کا سنتری دروازے پر چوکس کھڑا تھا۔ ذہناً مجھے محسوس ہوا کہ سنتری کسی عورت سے باتیں کر رہا ہے۔ چند لمحے بعد سنتری نے اندر آکر کھٹاک سے سیلوٹ کیا اور مجھے اطلاع دی کہ ایک میم صاحبہ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔ میم صاحبہ کا نام سن کر میری رگوں میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ دھیان سیدھا چین عرف جینی کی طرف گیا۔ میرا اندازہ

کپڑے بیٹھا تھا۔ اس ڈائری نے میری تفتیش کو آگے بڑھانے کی بجائے فل سٹاپ لگا دیا تھا۔ میں نے اس ڈائری کو کوئی جگہ سے پڑھا تھا خاص طور پر سترہ مارچ والا صفحہ میرے زیر مطالعہ رہا تھا۔ مارچ کی دوسری تاریخوں کی طرح اس تاریخ میں بھی پرتھی پال نے ایک معروف دن گزارا تھا۔ صبح دس بجے سے رات بارہ بجے تک مصروفیات لکھی ہوئی تھیں۔ اس ڈائری میں پرتھی پال نے جو کچھ بھی لکھا تھا بڑی احتیاط سے لکھا تھا۔ کم از کم اس ڈائری کی وجہ سے اُس پر کوئی حرف نہیں آ سکتا تھا اور اُس کی سترہ تاریخ کی مصروفیات تو ویسے بھی بالکل سیدھی سادی تھیں۔ اس نے لکھا تھا ”رات پارٹی دیر سے ختم ہوئی تھی۔ اس لیے دیر سے سویا اور دیر سے اُٹھا۔ سر بہت بھاری تھا۔ سو جاگھر جا کر نہا ہوں لیکن باہر پورچ میں آیا تو پتہ چلا کہ گاڑی سونا لے کر گئی ہے۔ سونا کسی ہی حرکتیں کیا کرتی ہے۔ یہ ساڑھے گیارہ کے قریب واپس آئی۔ میں اُس وقت تک نہادھو کر ناشتہ کر چکا تھا۔ پھر بھی اپنے شیڈول سے آدھ گھنٹہ لیٹ تھا۔ پہلی کی بجائے دوسری فلائٹ سے پنڈی جانا پڑا۔ وہاں میٹنگ بھی کافی دیر تک چلی یوں رات گیارہ بجے سے پہلے واپسی نہ ہو سکی۔ کالا شاہ کا کوجانے کا تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فلپینز میں ڈنر کیا، وہاں ڈاکٹر رائے سے ملاقات ہو گئی۔ اُن کی خوبصورت وائف بھی ساتھ تھی۔ ڈاکٹر رائے اپنے کینٹ والے پلاٹ کا ذکر لے بیٹھے۔ اُن کا خیال ہے۔۔۔۔۔ اس سے آگے پلاٹ کے جھگڑے کا طویل ذکر تھا جس کا اس کہانی سے تعلق نہیں۔

یہ تحریر دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ سترہ اور اٹھارہ مارچ کی درمیانی شب ایک بجے تک اور غالباً اس کے بعد بھی پرتھی پال فلپینز ہوئیں میں تھا۔۔۔۔۔ اب سوچنے کی بات یہ تھی کہ اُس رات کالا شاہ کا کوئی فیکٹری میں ایک نامعلوم شخص پر تشدد کرنے والا کون تھا اور

نشے میں نہ ہونے میں اُس کو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ تم نے اس بارے میں اُس بات کیا؟“  
میں نے کہا ”بات کی ہے لیکن وہ ایسا بھلا مانس کہاں ہے کہ آسانی سے بتا دے۔“

جینی کے چہرے پر اب سوچ کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ وہ سیلانی لڑکی نظر نہیں آتی تھی جو راہ چلتے مردوں کو پکڑ کر ”پرستان“ کی سیر کرا دیتی تھی۔ وہ دبے لہجے میں بولی ”انسپکٹر! ہم مانتا ہے کہ پرچی ہمارا منگیتر ہے مگر ہم انصاف کا گلا کاٹنا نہیں مانگتا۔ ہم چاہتا ہے کہ جو بھی سچ ہے وہ سامنے آئے۔ ہم تم سے درخواست کرتا کہ تم اس کیس کو اچھی طرح دیکھو۔“

جینی کی باتوں سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ جیسے وہ خود بھی پرچی کے متعلق شے میں پڑی ہوئی ہے اور سمجھتی ہے کہ گلزار کے غائب ہونے میں پرچی یا اُس کے کسی ساتھی کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ کتنے گھنٹیاں کردار کے لوگ تھے یہ اور کتنے کمزور تھے ان کے رشتے۔ وہ ایک دوسرے کو دھوکہ دے رہے تھے اور ساتھ ساتھ اس خیال سے بھی ڈر رہے تھے کہ اُن سے دھوکا ہوگا۔ جینی سے میری باتوں کے دوران ہی ٹیلیفون کی کھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریسپورڈ اٹھایا تو دوسری جانب ایک جانی پہچانی آواز آئی۔ یہ پرچی پال تھا وہ مجھے انسپکٹر نا تھا ساتھ مجھ رہا تھا اور پوچھ رہا تھا کہ جینی ادھر پولیس سٹیشن تو نہیں آئی۔ جینی نے فوراً اندازہ لگایا کہ یہ پرچی پال کا فون ہے اور وہ اُس کے متعلق پوچھ رہا ہے۔ وہ اشاروں میں مجھے منع کرنے لگی کہ میں اُسے نہ بتاؤں میں نے پرچی پال سے کہہ دیا کہ نہیں، یہاں کوئی نہیں آیا۔ پرچی پال نے فون بند کر دیا۔

پرچی پال سے گفتگو کر کے میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ چند لمحوں کے اندر انگلر گلزار کی اُلجھی ہوئی سطحی سلجھ گئی تھی۔ دراصل اس گفتگو کے دوران پرچی پال کے ہونٹوں سے ایک لفظ اُٹھا تھا

درست نکلا۔ وہ جینی ہی تھی سنتری نے جتن اٹھائی تو وہ جھک کر اندر آگئی۔ میں اُسے پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ آج وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت اور ماڈرن نظر آ رہی تھی۔ اُس نے چٹون کے اوپر ایک پتلی سی بنیان پہن رکھی تھی۔ اس ”بیجاری بنیان“ سے میم صلبہ کا جو بن سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا۔ حد یہ تھی کہ وہ اپنا گدھے کے سائز کا کتا بھی ساتھ ہی لیتی چلی آئی تھی۔ یہ بلڈاگ بڑی خوشخوار نظروں سے ارد گرد چیزوں کو گھور رہا تھا۔ ظاہر ہے میں اور سنتری بھی ”ان چیزوں“ میں شامل تھے۔

اچھی طرح اطمینان سے بیٹھنے کے بعد جینی نے گفتگو کا آغاز کیا۔ وہ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اُردو بولی تھی۔ کہنے لگی ”انسپکٹر نواز خاں! ہم نے تم کو ڈلہوڑی میں دیکھا تھا۔ آج یہاں دیکھا تو بڑا خوش ہوا۔ ہم کو مالوم ہوا ہے کہ تم گول زار (گلزار) کا انوشی گیشن کرنے کے لیے ادھر آیا۔ گاڈ جانتا ہے ہم کو اُس کا لاپتہ ہونے کا بڑا ڈھک ہے۔ وہ گڈ مین تھا۔ بڑا اچھا آدمی تھا۔ ہم کو مالوم ہوتا کہ وہ ہم سے ملے آیا ہے تو ہم خود اُس کو اپنے پاس بلاتا لیکن وہ پال واج مین سے جھگڑا کرتا رہا پھر مالوم نہیں کدھر چلا گیا۔

میں نے کہا ”مس جین! وہ گیا نہیں اسے لے جایا گیا ہے اور لے جانے والی کار آپ کے منگیتر محترم پرچی پال صاحب کی ہے۔“

”یہ تم کو کس نے بتایا“ اُس نے ماتھے پر ٹکٹیں ڈال کر پوچھا۔

میں نے چونک کر امجد محمد حسین کا نام ظاہر کیے بغیر جینی کو بتایا کہ سترہ مارچ کی صبح کوٹھی سے نکلنے والی سرخ کار کو گلزار نے ہاتھ دے کر روکا تھا اور کار چلانے والا اُسے اپنے ساتھ سوار کر کے لے گیا تھا اس کے بعد گلزار کا کچھ پتہ نہیں۔“

وہ بولی ”سرخ کار تو پرچی کا ہی ہے لیکن ہم کو یقین نہیں آ رہا کہ وہ ایسا کر سکتا، ہاں..... وہ نہیں

رہی تھی ”کک“..... کیا کہتا ہے اسپیکر..... تمہارا برین تو خراب نہیں ہو گیا“۔

”میرا دماغ خراب نہیں ہے مس جین..... اور ابھی تمہارا دماغ بھی ٹھکانے پر آجائے گا“۔ میں نے سب اسپیکر کو آواز دی۔ وہ ڈرانگ روم سے باہر بیٹھا تھا۔ اندر آ کر اُس نے سیلوٹ کیا۔ میں نے کہا ”جاؤ..... گاڑی سے چوکیدار کو لے آؤ“۔

وہ میرے کہنے سے پہلے ہی چوکیدار کو اندر لا چکا تھا۔ دروازہ کھول کر اُس نے چوکیدار کو ڈرانگ روم میں داخل کر دیا۔ یہ کالا شاہ کا کووالی فیکٹری کا چوکیدار تھا۔ اس کا نام کیکر سنگھ تھا۔ تھانے میں کیکر سنگھ کے سارے کس بل نکل چکے تھے۔ اُس کے نچلے ہونٹ سے خون رس رہا تھا اور پیشانی پر بڑا سا گوڑ پڑا ہوا تھا۔

میں نے کہا ”ہاں کیکر سنگھ سترہ اور اٹھارہ تاریخ کی درمیانی شب رات نو بجے کیا ہوا تھا؟“

کیکر سنگھ گلوگیر آواز میں بولا ”میم صاحبہ اپنی گاڑی میں ایک شخص کو لے کر آئی تھیں۔ ان کے ساتھ پریمانی بی بھی تھیں۔ میں اُس وقت نشے میں تھا۔ انہوں نے پہلے مجھے جھازیں پلا میں پھر پوچھا کہ پریمی پال صاحب کہاں ہیں؟ میں نے کہا انہوں نے آنا تو تھا لیکن آئے نہیں، سنا ہے پٹری گئے ہوئے ہیں۔ میم صاحبہ غصے میں بڑبڑانے لگیں۔ پھر انہوں نے گیٹ کھلویا اور گاڑی اندر لے گئیں۔ میں گیٹ پر بیٹھا رہا اور وہ گاڑی میں ساتھ آنے والے بندے کو لے کر مکان میں چلی گئیں۔ میرے اوپر نشہ زور مار رہا تھا۔ چارپائی پر بیٹھے بیٹھے میں پھر سو گیا۔ گہری نیند میں مجھے بھی بھی چیخوں کی آوازیں آتی رہیں۔ ان آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ میم صاحبہ اُس شخص کی دھنائی کر رہی ہیں۔ ایسی مار پیٹ اس فیکٹری میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کئی دفعہ ایسا ہوا تھا کہ پریمی پال صاحب کسی بندے کو پکڑ کر یہاں

جس نے اُس کیس کے سارے انچر بنجر ڈھیلے کر کے مجرم کو چاروں شانے چت کر دیا تھا۔

میں نے اطمینان سے سگریٹ سلگایا اور جینی سے کہا ”مس جین! آپ اطمینان سے گھر جائیں میرا خیال ہے میں آج شام تک اس معے کو حل کر لوں گا۔ بلکہ ہو سکتا ہے میں جب شام کو آپ کے پاس آؤں تو گلزار بھی برآمد ہو چکا ہو“۔

”او گاڈ“ وہ حیرانی سے بولی ”اتنا جلدی؟..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”ایسا ہی ہوگا“ میں نے اُسے یقین دلایا پھر گھڑی دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا ”ویری ساری..... مجھے ذرا جلدی لگتا ہے“ اُس نے کتے کی زنجیر بھیج کر اسے جلدی سے میرے راستے ہٹالیا۔ میں لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر صحن میں آ گیا۔ جینی بھی میرے پیچھے ہی پیچھے نکل آئی۔

شام آٹھ بجے میں مسٹر الفریڈ کی کونھی میں اُن کے شاہانہ ڈرانگ روم میں بیٹھا تھا۔ یوں لگتا تھا وکٹوریہ دور کے کسی محل میں آ گیا ہوں۔ مسٹر الفریڈ خود گھر میں نہیں تھے۔ اُن کی شوخ و خشک بیٹی بڑی ادا سے میرے سامنے بیٹھی تھی۔

”ہاں کیا رپورٹ ہے مسٹر اسپیکر کچھ اتہ پتہ چلا؟“ ”میں نے آپ سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کیا ہے۔“ ”او مائی گاڈ“ جینی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا ”کہاں ہے گول زار ہم اُس کے بارے میں بڑا دری تھا۔ بڑے بڑے قراری تھا ہم کو کہاں ہے گول زار کس نے اغوا کیا تھا اس کو“۔

میں نے سگریٹ کا شل لے کر اطمینان سے کہا ”تم نے مس جین..... تم نے اغوا کیا تھا اُسے اور پھر کالا شاہ کا کوکی فیکٹری میں اُس پر تشدد کر کے ختم کر ڈالا اُسے“۔

وہ حیرت سے منہ پھاڑے میری طرف دیکھ



جینی نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر ایک بہت گہری سانس لی اور بولی ”تم جو کچھ کہہ رہا ہے اس کا قیمت تم کو بہت زیادہ ادا کرنا پڑے گا۔“ (چوکیدار) کے بیان سے یہ بات کیسے ثابت ہوتا ہے کہ ہم نے گلزار کو اغوا کیا یا مارا ہے۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”اس میں اب شک شے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے مس جین شیلڈ..... تمہیں پتہ چل چکا تھا کہ گلزار رات کو کوئی کے گیٹ پر آیا ہے اور اس نے تمہارا نام لے کر ہنگامہ کیا ہے۔ یہ صورت حال تمہارے لیے کسی طرح بھی خوشگوار نہیں تھی۔ اتفاقاً اگلے روز صبح دس بجے ہی تمہیں اپنے بے وقوف عاشق سے بننے کا موقع مل گیا۔ تمہیں اپنی ایک دوست کو سی آف کرنے ہوائی اڈے پر جانا تھا۔ تم شرارت کے طور پر اپنے منگیتر پر تھی کی گاڑی لے گئیں۔ اس واقعے کا ذکر پھر میں اپنی ڈائری میں کیا ہے اور یہ ڈائری اس وقت بھی میرے پاس موجود ہے۔ تم گاڑی لے کر گیٹ سے باہر نکلیں تو گلزار نے آگے بڑھ کر تمہارا راستہ روک لیا اور تم سے باتیں کرنے لگا۔ وہ تمہارے عشق میں نیم دیوانہ ہو رہا تھا۔ اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کس پتھر سے سر پھوڑ رہا ہے۔ تم ایک ایسی عورت ہو جو مرد کے سینے پر اپنا حسین پاؤں رکھ کر گزرتی ہے اور پھر کبھی مڑ کر نہیں دیکھتی۔ تمہیں گلزار کے والہانہ پن سے زبردست خطرہ محسوس ہوا۔ اُس کی بے وقوفی اور ہٹ دھرمی کی سزا دینے کے لیے تم نے اُسے گاڑی میں بٹھالیا اور اپنی سیکلی پر بیما کے فلیٹ میں لے گئیں۔ تم نے اُسے شام تک وہیں رکھا۔ شام کو پریمانے اور تم نے اُسے گاڑی میں بٹھالیا اور کالا شاہ کا کو والی فیکٹری جا پہنچیں..... وہاں تم دونوں نے مل کر اُسے ظالمانہ تشدد کا نشانہ بنایا اور پھر مار کر زمین میں گاڑ دیا۔“

جینی نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھاما اور چیخ

لے آئے اور اس کی خوب مرمت بنائی۔ اُن کا ایک پارٹی سے کاروباری جھگڑا چل رہا ہے اور اس جھگڑے میں کئی بار مار پیٹ تک نوبت آچکی ہے۔ میں نے سمجھا شاید یہ بھی کوئی ایسا ہی معاملہ ہے۔ پتہ نہیں کیا وقت تھا جب میم صاحبہ اور ان کی سیکلی گاڑی لے کر واپس چلی گئیں۔ جس شخص کو مار پیٹا جا رہا تھا وہ مجھے گاڑی میں نظر نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے وہ میم صاحبہ کے جانے سے پہلے ہی فیکٹری سے نکل گیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پچھلی سیٹ پر لہبا پڑا ہو اور مجھے نظر نہ آیا ہو۔“

اس بیان کے دوران جینی سکتے کی حالت میں بیٹھی رہی۔ اُس کا رنگ ہمیشہ سے زیادہ سفید نظر آ رہا تھا۔ چند منٹ پہلے اُس کی آنکھوں میں ناچنے والی تمام تیزی طراری رخصت ہو چکی تھی..... میں نے کہا ”مس جین! اب تم سوچو گی کہ میں تم تک کیسے پہنچ گیا..... دراصل مجھے معلوم ہوا تھا کہ سترہ تاریخ کی صبح گلزار جس گاڑی میں بیٹھ کر گیا تھا وہ پھر پال کی ضرورت تھی مگر اُسے پتہ چل چلا نہیں رہا تھا۔ اُسے سونا نام کی کوئی لڑکی یا عورت چلا رہی تھی۔ اب مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ سونا نامی یہ لڑکی یا عورت کون ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اس بارے میں معلومات حاصل کرتا تم تھانے پہنچ گئیں اور مجھ سے کیس کے بارے میں بات چیت کرنے لگیں۔ تمہیں یاد ہو گا صبح ہونے والی اس بات چیت کے دوران ہی پرتھی پال کا فون آیا تھا اور یہ فون سننے کے فوراً بعد میں نے تمہارے سامنے دعویٰ کیا تھا کہ شام تک میں یہ معہ حل کر لوں گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے ”سونا“ کا پتہ چل گیا تھا۔ سونا تمہارا ہی ”نک نیم“ ہے اور یہ ”نک نیم“ پرتھی پال نے رکھا ہوا ہے۔ وہ بے تکلفی سے تمہیں ”سونا“ کہتا اور لکھتا ہے۔ میرا خیال ہے اب پوری بات تمہاری سمجھ میں آگئی ہوگی۔“

کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ خود بھی بڑی خاموش اور آزرده سی دکھائی دے رہی تھی۔ گردن جھکا کر میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے معنی خیز انداز میں ناتھاسنگھ کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ ناتھاسنگھ چلا گیا تو وہ گلوگیر آواز میں بولی ”ہم تم سے اکیلے میں بات کرنا ناکٹا“۔

میں نے کہا ”تم جو کچھ کہنا چاہو، یہاں پوری تسلی سے کہہ سکتی ہو“۔

اُس نے اپنا خوبصورت رومال ناک پر رکھ کر سوسوں کی آواز نکالی اور بولی ”انسپکٹر! تم ٹھیک کہتا ہے کہ سترہ تاریخ کو گلزار ہمارے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر گیا تھا لیکن گاڑی جاتا ہے، ہم نے اُس کو کوئی تکلیف نہیں دیا۔ اُس کو انگلی تک نہیں لگایا وہ..... وہ اس وقت زندہ سلامت ہمارے پاس موجود ہے..... ہمارا مہمان ہے وہ“۔

گلزار کے زندہ ہونے کی اطلاع میرے لیے خوش کن تھی۔ اُس کی بوڑھی والدہ اور بہنوں کے چہرے میری نگاہوں میں گھوم گئے..... اور یہ اُمید پیدا ہو گئی کہ میں ڈھوڑی واپس جا کر اُن کے سامنے سرخرو ہو سکوں گا۔ میں نے مس جین سے پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟ وہ بولی ”پریمہ کے فلیٹ میں ہی ہے۔ پریمہ نے ایک کمرہ اس کو دے رکھا ہے اور وہاں وہ بڑے سکون سے رہ رہا ہے“۔

میں نے کہا ”اگر میں تمہاری بات مان لوں تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ تم نے اُسے یوں منظر سے غائب کیوں کیا؟“

میرے اس سوال پر جینی کی حسین آنکھوں میں ایک دم آنسو اُٹھ آئے۔ وہ روتے ہوئے بولی ”اس لیے کہ ہم اُس سے سچ سچ محبت کرنے لگا تھا..... ہم بہت بُرا کر لے ہے انسپکٹر ہم مرد کو کھلونا سمجھتا تھا۔ کسی اجنبی مرد کے ساتھ وقت گزارتا تھا۔ اسے سر پرانز

پڑی ”نہیں..... نہیں..... یو آر آر اگ..... یہ بالکل غلط ہے ہم نے ایسا کچھ نہیں کیا..... کچھ بھی نہیں کیا، تم یہاں سے چلے جاؤ۔ آئی سے گیٹ آؤٹ.....“ اُس پر جیسے اچانک ہی ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا تھا۔ چہرہ اپنے بازوؤں میں چھپا کر وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔

میں نے کہا ”مس جین! تمہارا رے ماننے نہ ماننے سے اب کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم نے جرم کیا ہے اور یہ جرم عدالت میں ثابت ہو کر رہے گا..... میں تمہیں اقبال جرم کا ایک موقع دے رہا ہوں۔ سارے معاملے پر ٹھنڈے دل سے غور کرو اور فیصلہ کرو کہ تمہیں اپنا جرم چھپانا چاہئے یا نہیں..... خدا حافظ“۔ اس کے ساتھ ہی میں چوکیدار لیکر سنگھ کو لے کر ڈرائنگ روم سے باہر آ گیا۔

منظر تھانے کا تھا۔ میں انسپکٹر ناتھاسنگھ کے ساتھ اُسی کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ ناتھاسنگھ نے اپنی بھوری داڑھی کو کھچاتے ہوئے کہا ”کیا واقعی مس جین گلزار کو ٹھکانے لگا چکی ہے؟“

میں نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا ”یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ صرف ایک بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ سترہ مارچ کی صبح گلزار جس کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو کر گیا تھا وہ مس جین تھی۔ اب وہ اُسے کہاں لے گئی۔ اُس کا کیا کیا اور اب وہ کہاں ہے؟ یہ سب کچھ فی الحال تاریکی میں ہے“ ناتھاسنگھ بولا ”لیکن تم نے تو بڑے دعوے کے ساتھ جین پر قتل کا الزام لگا دیا ہے“۔

”صرف اُسے مجذبانے کے لیے..... تاکہ وہ سچ بول دے میں نے.....“۔

ابھی میری بات منہ میں ہی تھی کہ سنتری نے اندر آ کر کھٹاک سے سیلوٹ کیا اور اطلاع دی کہ میم صاحبہ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔ چند لمحوں بعد مس جین اندر آئی۔ آج خوفناک صورت والا بلڈاگ کتا اس

غریب لڑکی تھی اور اُس نے عجب و غریب کام کیا تھا۔ شاید وہ ٹھیک کہہ رہی تھی کہ قدرت نے اُسے سزا دی ہے اور وہ ایک ایسے شخص کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے جس سے محبت کرنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

میں نے اُس سے پوچھا ”اگر تمہاری یہ ساری باتیں درست ہیں تو پھر چوکیدار نیکر سنگھ کا بیان کس خانے میں فٹ ہوتا ہے؟ کیا تم اُس رات کسی شخص کے ساتھ فیکٹری میں نہیں گئی تھیں؟“

وہ بولی ”ہاں..... ہم گیا تھا لیکن ہمارے ساتھ اُس وقت گلزار نہیں چوکیدار مہابت خاں تھا۔ وہی مہابت خاں جس نے ایک روز پہلے گلزار کو مارا پیٹا تھا اور ذلیل کیا تھا۔ یہ بڑا بد بخت چوکیدار ہے۔ اُس نے ڈلہوڑی میں بھی ایک مزدور کو بہت مار بٹھا اور اس کا کپڑا بھاڑ کر اس کو مرغا بنادیا تھا۔ ہم کو اس بد بخت پر بہت غصہ تھا۔ ہم اور پریماس کو گاڑی میں ڈال کر فیکٹری لے گیا۔ ہمارا ارادہ اُسے پر تھی پال کے حوالے کرنے کا تھا لیکن وہ فیکٹری میں نہیں تھا۔ ہم نے خود ہی مہابت خاں کا مرمت کیا اور جب اُس کا حالت بہت بُرا ہو گیا تو اُسے ایک انڈرویئر میں فیکٹری سے بھگا دیا..... ہم نے کسی کامرڈر نہیں کیا انسپکٹر اور نہ ہی ایسا کر سکتا ہے۔“ وہ ایک بار پھر سسکتی گئی۔

مس جین کی نشاندہی پر گلزار کو پریماس کے فلیٹ سے برآمد کر لیا گیا۔ وہ ہشاش بشاش اور صحت مند تھا۔ اس ڈیزہ مہینے کے عرصے میں اُسے نہ صرف لباس پہننے کا سلیقہ آ گیا تھا بلکہ وہ اپنی گفتگو میں کہیں انگریزی کے لفظ بھی ٹھوٹک لیتا تھا۔ اُس نے تھانے میں آ کر اپنا طویل بیان قلمبند کر لیا۔ اس میں واضح طور پر کہا کہ وہ کسی کی جس بیجا میں نہیں تھا۔ اس نے علیحدگی میں مجھے جو باتیں بتائیں وہ خاصی اہم تھیں۔ اُس نے انکشاف کیا کہ میم صاحبہ اور ان کے

دیتا تھا اور حیران پریشان چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا تھا۔ پھر گاڈ نے ہمیں ہمارے کیے کا سزا دیا۔ ہمیں ایک ایسا مرد ملا جس نے اُلٹا ہم کو سر پرانز دیا اور ہمیں پریشان کر دیا..... وہ مرد گول زار (گلزار) ہے انسپکٹر۔ آج ہم تم کو سب کچھ سچ سچ بتائیں گا۔ گلزار ایک معمولی شخص تھا۔ مگر معلوم نہیں اُس میں کیا بات تھا ہم ایک بار اُسے مل کر پھر بھول نہ سکا۔ دن رات اُس کا خوبصورت فیس ہماری نگاہوں میں رہا۔ ڈلہوڑی سے واپس آ کر ہم دن رات اُس سے ملنے کو ترستار ہا اور ساتھ ساتھ اپنے دل کو سمجھاتا رہا کہ وہ یہ نادانی نہ کرے..... ہم جانتا تھا کہ پر تھی پال جیسا کروڑ پتی شخص ہم سے شادی بنانا چاہتا ہے اور یہ شادی ضرور ہونی ہے..... پھر ہم کیوں ایک فوش لڑکی کی طرح سوچ رہا تھا۔ ہم اپنے دل کو سمجھانے کی بہت کوشش کرتا رہا اور اس میں بہت حد تک کامیاب بھی ہو گیا لیکن پھر ایک دن اچانک گلزار پھر ہمارے سامنے آن کھڑا ہوا۔ ہم کو مالوم ہوا کہ اس نے ہماری خاطر کٹھنی کے گیٹ پر جھگڑا کیا ہے اور چوکیدار مہابت خاں نے اُسے بُری طرح مارا ہے اور ذلیل کر کے نکال دیا ہے۔ ہم کو فکر تھا کہ پر تھی پال کو مالوم ہوا تو وہ گلزار سے بہت بُری طرح پیش آئے گا اور یہ بھی کوئی بڑا بات نہیں کہ اُس کا دماغ ٹھکانے لگاتے لگاتے اُسے جان سے ہی مار ڈالے۔ وہ بہت ہی سخت آدمی ہے۔ ہمارا فکر مندی بڑھتا جا رہا تھا، پھر گاڈ نے ہمارا مدد کیا۔ ہم صبح ایر پورٹ جانے کے لیے پر تھی پال کا گاڑی لے کر نکلا تو تھوڑا آگے جا کر گلزار نے ہمارا راستہ روک لیا۔ ہم نے اُسے اپنے ساتھ سوار کیا اور پریماس کے فلیٹ پر لے گیا اور ہم نے اُسے فلیٹ پر ہی رکھا اور اب تک وہ وہیں ہے.....“

مس جین کی زوداد حیران کن تھی۔ وہ عجیب و



وہ سات پردوں میں رہتی تھی۔ اُس نے ماضی سے ہر ناطہ توڑ لیا تھا۔ نہ کسی سے ملتی تھی نہ کوئی اُس سے ملنے آتا تھا۔ صرف مسٹر الفریڈ کی ”چھ گز“ لمبی کار کبھی کبھی کانچ کے دروازے پر کھڑی نظر آتی تھی۔ وہ بھی جس طرح خاموشی سے آتے تھے اسی طرح خاموشی سے چلے جاتے تھے۔ مس جین نے اپنا مذہب تبدیل نہیں کیا تھا لیکن مذہبی طور پر وہ بالکل بدل چکی تھی اور گلزار بتاتا تھا کہ اتوار کو اپنی عبادت کرنے کی بجائے وہ نماز پڑھتی ہے۔ گلزار اُس سے بہت خوش تھا اور اُسے پختہ یقین تھا کہ ایک روز وہ اپنی رضا و رغبت سے کلہ بھی بڑھ لے گی۔

مجھے ڈر تھا کہ کہیں گلزار کی یہ خوشیاں عارضی ثابت نہ ہوں..... یہ نہ ہو کہ امیر زادی کی آنکھوں سے وقتی محبت کی پٹی بٹے اور وہ چیخ مار کر اپنی دنیا میں لوٹ جائے۔ مگر میرے یہ تمام اندیشے اور اندازے اُلٹ ثابت ہوئے۔ گزرنے والے وقت کے ساتھ جین خود کو نئے ماحول میں ڈھالتی چلی گئی۔ پہلے وہ گلزار کے گھر والوں سے علیحدہ رہنا چاہتی تھی پھر اُس نے انہیں بھی ڈھبوزی میں بلوایا۔ گلزار نے بتایا کہ اُس نے مغربی لباس بالکل چھوڑ دیا ہے اور مقامی رواج کے کپڑے پہنتی ہے۔ پھر گلزار کا پہلا بچہ پیدا ہوا۔ اس کا نام جینی نے اپنی مرضی سے رحمان رکھا۔ یہ درحقیقت اسلام کی طرف اُس کا سفر تھا۔ آخر ایک ایک روز یہ سفر مکمل ہوا۔ شام کا وقت تھا..... گلزار بھاگتا ہوا تھا نے میں داخل ہوا۔ اُس نے مجھے بے تکلفی سے بازوؤں میں بھینچ لیا اور لرزی سرگوشی میں بولا ”لالہ..... لالہ جین مسلمان ہو گئی ہے۔“

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے  
سچ کہا ہے کسی نے کہ بُد اُفص جب دل کی گہرائی  
سے اچھا بنتا ہے اچھوں اچھوں کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔

مگیت پر تھی پال کے تعلقات کئی ماہ سے خراب تھے اور اب وہ مزید خراب ہو گئے ہیں۔ پرچی پال کی نظر میم صاحبہ کی دولت و جائیداد پر ہے اور وہ ہر صورت یہ دونوں چیزیں حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اپنے اس لالچ میں کسی کی جان لے سکتا ہے اور اپنی جان دے بھی سکتا ہے۔ یہی خوف تھا جس کے سبب مس جین نے گلزار کو موقع سے غائب کر دیا تھا اور بعد میں پرچی پال سے جان چھڑانے کے لیے میری تفتیش کا رخ پرچی کی طرف موڑنے کی کوشش کی تھی۔ میرے ساتھ اپنی بات چیت میں گلزار نے جو سب سے بڑا اور دھماکہ خیز انکشاف کیا وہ یہ تھا کہ مس جین اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔

میں فوری طور پر اس بات پر یقین نہیں کر سکا۔ کوئی ہوش مند بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کہاں ایک شرا ماڈرن جین اور کہاں دس جماعتیں پاس گلزار۔ کوئی جوڑ کوئی جواز ہی نہیں تھا لیکن ایک بات میں بھول رہا تھا اور ہم سب بھول رہے تھے یہ بات کسی عام لڑکی نے نہیں کہی تھی، مسٹر الفریڈ کی بیٹی نے کہی تھی۔ وہ بیٹی جس نے آج تک جو کام کیا تھا عجیب کیا تھا۔ شاید اس کی زندگی کا مقصد ہی دوسروں کو حیران اور ششدر کرنا تھا۔ وہ انوکھی تھی اور اُس کے ہر کام میں انوکھا پن تھا..... اور پھر ایک روز وہ اپنی زندگی کا سب سے انوکھا کام بھی کر گئی۔ وہ ”سبز پری“ جس کے لیے لکھ پتی نوجوانوں کے رشتے قطار باندھے کھڑے تھے۔ اس نے ڈھبوزی کے ایک مقامی نوجوان سے کورٹ میرج کی اور اُسی کانچ میں جا کر آباد ہو گئی جہاں سے اُس کی انوکھی محبت کا آغاز ہوا تھا۔

میں اُسی کانچ کے پھوواڑے میں رہتا تھا اور گلزار کی شادی کے بعد بھی قریباً ایک سال رہا لیکن شادی کے بعد میں نے مس جین کو کبھی نہیں دیکھا۔

# ہائی بلڈ پریشر سے بچاؤ کی تدابیر

حکیم راحت نسیم سوہدروی

۱۱۱۱۱۱۱۱  
ایک خطرناک مرض کے حاملے سے رہنا تحریر، جانتناں کا  
ناموں دشمن کہلاتا ہے



موجودگی کے باوجود اکثر لوگ بے خبر رہتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ گاہے بگاہے اپنے بلڈ پریشر کا معائنہ کراتے رہیے اور بڑھنے کی صورت میں باقاعدہ علاج کیا جائے۔ ورنہ یہ عارضہ حملہ قلب

ہائی بلڈ پریشر (ہلند فشارخون) ایک عام مرض ہے۔ اندازہ ہے کہ ایک ہزار افراد میں سے 200 افراد اس کا شکار ہوتے ہیں۔ ہائی بلڈ پریشر کو چور مرض یا خفیہ دشمن بھی کہا جاتا ہے کیونکہ مرض کی

### خواتین ڈرائیور

”کیا تمہیں ابھی تک یہی نہیں معلوم کہ خواتین ڈرائیوروں کے لئے ہمیشہ آدھی سڑک چھوڑ دینا چاہئے۔“ ”معلوم ہے! لیکن یہ علم نہیں کہ کس طرف کی آدھی سڑک وہ پسند کرتی ہیں۔“

### فائل

محبوبہ کی مسلسل خاموشی سے بے قرار ہو کر عاشق نے اسے حلقہ لکھا کہ اگر تمہارا رویہ آئندہ یہی رہتا ہے تو مہربانی سے میرے تمام خطوط واپس کر دو۔ محبوبہ کی طرف سے جواب ملا۔ ”آپ کی فائل مل ہی نہیں رہی۔ براہ کرم آئندہ خط لکھتے وقت حوالہ نمبر ضرور تحریر کیجئے۔“

### فکر مند

”اگر تم کام چھوڑ کر جا رہی ہو تو میرے شوہر کے لئے کھانا کون پکائے گا؟ تم بھول گئیں کہ وہ تمہارے ہاتھ کے پکائے کھانے کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ پلیز مجھے مصیبت میں ڈال کر مت جاؤ۔ میں انہیں کیسے راضی رکھ سکوں گی۔“ مالک نے منت آمیز لہجے میں گھریلو خوبصورت ملازمہ سے کہا۔ ”بیگم صاحبہ! آپ شوہر کی تو بالکل فکر نہ کریں کیونکہ وہ میرے ساتھ ہی جا رہے ہیں۔“ نوکرانی نے مسکرا کر جواب دیا۔

(مرسلہ: نعمان سلیم۔ حیدر آباد)

رہے تو یہ مرض ہے۔ عمر کے مختلف حصوں میں بھی یہ دباؤ مختلف ہوتا ہے۔

جن لوگوں کے والدین کو یہ عارضہ ہو۔ ان میں اس کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ خون میں کولیسترول کا بڑھ جانا، مائع حمل ادویات کا استعمال، امراض گردہ سنگ گردہ موٹاپا اور ذیابیطس اور عارضہ رگ دل میں مبتلا لوگ زیادہ شکار ہوتے ہیں۔ نیز یہ ہر عمر کے لوگوں میں ہو سکتا ہے۔ اس

(ہارٹ ایک)، دماغی فالج (اسٹروک) کا باعث بن سکتا ہے۔ دیکھایہ گیا ہے کہ بلڈ پریشر بڑھنے کی صورت میں بمشکل نصف لوگ علاج کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ حالاں کہ اس کی تشخیص و علاج آسان ہے۔ بلڈ پریشر کی تشخیص ایک آلہ کی مدد سے کی جاتی ہے۔ صرف ایک باری ریڈنگ کافی نہیں بلکہ کم از کم تین بار ریڈنگ کے بعد فیصلہ کرنا چاہیے۔

معمول کے مطابق درست بلڈ پریشر ایک بالغ فرد میں 120/80 اور 130/85 کے درمیان ہونا چاہئے۔ اگر ان حدود سے تجاوز کر جائے تو ہائی بلڈ پریشر کہلاتا ہے۔ جسے مناسب تدابیر احتیاط اور پریز سے معمول پر لانا چاہئے تاکہ اس عارضہ سے پیدا ہونے کے عوامل سے محفوظ رہا جاسکے۔ ہائی بلڈ پریشر کی صورت میں سر چمکاتا ہے۔ کھینچی اور گردن کے پیچھے کی شریانیں تڑپتی محسوس ہوتی ہیں۔ چہرے کی رنگت سرخ، نبض تیز اور پسینے کی زیادتی ہوتی ہے۔ ان علامتوں کی صورت میں آلہ کی مدد سے بلڈ پریشر کا معائنہ کرنے پر درست تشخیص ہو جاتی ہے۔ فشارخون (بلڈ پریشر) وہ طبعی دباؤ ہے جو تمام جسم کو خون ترسیل کرنے والی سرخ رگوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ دباؤ بہت ضروری ہے اور یہ دباؤ طاقت سے ہوتا ہے تاکہ خون کی رگوں میں باقاعدگی سے دوڑ سکے۔ اس باقاعدگی کی وجہ سے دل کے ذریعے خون جسم کے تمام اعضاء تک پہنچتا ہے۔ اس طرح تمام اعضاء اپنے افعال درست طور پر سرانجام دیتے ہیں۔ جب بلڈ پریشر کا معائنہ کیا جاتا ہے تو اوپر کا ہندسہ اس وقت کے دباؤ کو ظاہر کرتا ہے۔ جب قلب سکڑتا ہے اس کو انقباضی (سٹ لک پریشر) کہتے ہیں۔ جبکہ نیچے کا ہندسہ دھڑکنوں کے درمیان کا دباؤ (سٹ لک دباؤ) کہلاتا ہے یعنی انبساطی دباؤ۔ بلڈ پریشر کام کی نوعیت سے بھی بدلتا رہتا ہے۔ اگر تبدیلی کے بغیر قائم



لیونی پھل (نارنگی، سگریٹ، مالٹا) کھائے جائیں۔

نشیات سے دور رہیں: نشیات سے بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے تمباکو نوشی سے احتیاط کریں۔ شراب نوشی سے دور رہیں۔

گوشت کا استعمال کم رکھیں: گوشت سے چکنائی حاصل ہوتی ہے۔ جو کولیسٹرول کا سبب بنتی ہے۔ لہذا زیادہ گوشت نہ کھائیں بلکہ تھوڑی مقدار میں ضرورت کے مطابق کھائیں۔

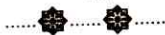
وٹامن سی والی غذائیں: وٹامن سی والی غذائیں ایچ ڈی ایل کی سطح بڑھا دیتی ہیں۔ غذا میں بند گوبھی، نارنگی استعمال کریں تو غذا میں لمبیت کے فوائد ملیں گے اور ایچ ڈی ایل کی سطح کم ہوگی۔ وٹامن سی کا استعمال ایچ ای ایل کی سطح بڑھاتا ہے مگر بعض غذاؤں میں وٹامن سی ہوتی ہے ان میں اسٹرابری، کنو، مالٹا، نارنگی، تازہ آلو، ٹماٹر شامل ہیں۔ یہ خون کے تھکے بنے کو روکتی ہے۔

پانی زیادہ پئیں: پانی پیاس سے زیادہ پئیں تاکہ گردے پتھریوں سے محفوظ رہیں۔ گردے کی پتھریاں بھی بلڈ پریشر بڑھانے کا سبب بن جاتی ہیں۔

بلڈ پریشر کے بڑھنے کا درست اندازہ صرف اس کی پیمائش سے ہو سکتا ہے۔ خود کو اچھا محسوس کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بلڈ پریشر بڑھا ہوا نہیں ہے۔

بعض لوگ ادویہ کے استعمال سے بلڈ پریشر کنٹرول ہونے پر یہ خیال کرتے ہیں کہ نارمل ہو گیا ہے اگرچہ یہ نارمل احتیاط اور ادویات کے سبب ہے۔ ایسے لوگوں کو باقاعدہ طبی مشورہ کرتے رہنا چاہیے اور احتیاطیں ضروری رکھیں۔ ورنہ اس عارضے کے

سبب اعضاء امراض میں مبتلا ہونے سے فاج، حملہ قلب، ناکاری گردہ اور پیتائی جانے کا امکان ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا تدابیر اختیار کر کے آپ بلڈ پریشر کو بڑھنے سے روک سکتے ہیں۔



کے علاوہ زیادہ نمک خوری، نشہ آور اشیاء کا استعمال بھی سبب بن سکتا ہے۔ خواتین میں حمل اور خصوصاً حمل کی آخری سہ ماہی میں ہو سکتا ہے۔ چنانچہ قیام حمل کے بعد بلڈ پریشر پر نظر رکھنی چاہیے۔ اگر زیادہ ہو تو ضروری تدابیر اختیار کی جائیں ورنہ ماں اور حمل (بچہ کا بچہ) دونوں کو نقصان ہو سکتا ہے۔

### بچاؤ کی تدابیر

ورزش: روزانہ باقاعدہ ورزش کریں تاکہ جسم میں آکسیجن جذب ہو۔ روزانہ سیر بھی مفید ہے۔

نمک خوری سے بچیں: نمک سے خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے اسی لیے اس کا استعمال کم سے کم کریں۔

وزن کم رکھیں: بڑھا ہوا وزن خون کے دباؤ کو بڑھاتا ہے اس لیے وزن کم رکھنے کے اقدامات کریں۔

کولیسٹرول کنٹرول رکھیں: چکنائی سے کولیسٹرول بڑھ کر خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے چکنائی والی غذائیں کم سے کم استعمال کریں۔

لمبیت کا استعمال بڑھادیں: غذا میں سبزی خوری زیادہ رکھیں تاکہ لمبیت زیادہ ہو اس طرح بڑی آنت درست رہتی ہے۔ قبض نہیں ہوتی، سبزیوں کے علاوہ

پھلوں میں لمبیت ہوتا ہے۔

ڈپریشن سے بچیں: عہد حاضر میں خون کا دباؤ بڑھنے کی بڑی وجہ ڈپریشن ہے۔ اعصابی تناؤ اور ذہنی

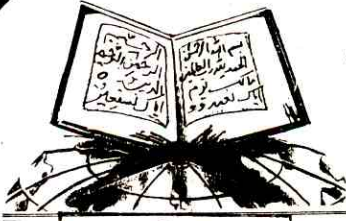
دباؤ سے محفوظ رہنے کے لیے خوش و خرم رہیں۔ کسی کی دل آزاری نہ کریں۔ غم و غصہ سے دور رہیں۔

عبادات: نماز روزہ سے روحانی سکون ملتا ہے۔ اس لیے بلڈ پریشر سے بچنے کے لیے خشوع و خضوع سے

عبادات کریں۔ اس طرح خون کا دباؤ نارمل رہتا ہے۔

کیمیاہ والی غذائیں: کیمیاہ اور پوناشیم والی غذاؤں کے استعمال سے خون کا دباؤ نہیں بڑھتا۔ اس لیے کیمیاہ کے لیے دودھ سے بنی اشیاء، بے ملائی دودھ،

دہی اور پھل استعمال کریں اور پوناشیم کے لیے



”دُعا تقدیر بدل دیتی ہے“ (حدیثِ رسول)

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک ایمان افزہ پیشکش



# دُعائیں

شائع ہو گیا ہے

- ❁ ستہ آتی دُعائیں۔
- ❁ عظیم پیغمبرانِ خدا کی وہ دُعائیں جو نسلِ انسانی کے لیے نجات اور ہدایت کا باعث بنیں۔
- ❁ خالقِ کائنات کے آخری نبی محمد رسول اللہ کی تمام مسنونہ دُعائیں جو رحمت اللعالمین کی ذاتِ برکات کا مقدس پرتو ہیں۔
- ❁ صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کی دُعائیں۔
- ❁ ائمہ اکرام اور اسلام کے عظیم اور باکمال صوفیائے عظیم کی بابرکات دُعائیں۔

جدید دنیا کے گھمبیر اور اعصاب شکن مسائل میں گھرے  
پریشان حال انسان کے تمام مسائل کا تشریف آمیز  
روحانی اور ایمانی علاج

قیمت 175 روپے

سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ ریواڑ گاؤں لاہور۔ فون: 37245412

انتظار کی چاشنی میں کھوئی ہوئی ہے۔ ہیرو ہے کہ ہیروئن کے لیے بے تاب و بے قرار جان تک کی بازی لگادینے کو تیار اور ولن بے چارہ یا تو اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے لیے ہیروئن کو تباہ و برباد کر دے گا یا پھر دنیا سے منہ موڑ کر محبت کا بھرم رکھ لے گا۔ جانے کیوں اُسے ان سارے افسانہ نگاروں کی اوٹ پٹانگ لفاظیوں سے زندگی میں پہلی بار نفرت سی محسوس ہوئی۔ وہ جو تجلیات کی اوپچی پرواز میں حقیقت سے آنکھیں چرا لیتے ہیں جانے اپنے احساسات کی جھوٹی تسکین کے لیے قاری کے دکھوں پر تازیانے لگا کر انہیں کیا ملتا ہے؟ افسانے اور حقیقت کی تخیلوں کا موازنہ کرتے ہوئے وہ ابھی کسی نتیجے پر بھی نہ پہنچ پائی تھی کہ سکوائر سٹارٹ کرنے کی آواز پراس کی نگاہیں بے ساختہ سامنے بچکے کے کینوں پر جا پڑیں۔ نیلی ساڑھی میں لمبوس ایک پیاری سی لڑکی اپنی گود میں گول مٹول خوبصورت بچہ سنبھالے اپنے شوہر کو اولوداع کہہ رہی تھی۔ جو اب اس کے شوہر نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھا اور بچے کو پیار کرتا ہوا اُس روانہ ہو گیا۔ تو کیا ازدواجی زندگی اتنی پر بہار ہو سکتی ہے؟ کیوں نہیں؟ زندگی تو اس سے بھی زیادہ حسین ہے۔ کسی اجنبی سرگوشی نے اُسے گدگدایا تو وہ بھی اپنی جد بانی دنیا میں ایسے پیکر کو ڈھونڈنے لگی جسے صرف اس سے والہانہ پیار ہو۔ اب تو ہر لمحہ اُس کا دل چاہنے لگتا تھا کہ وہ اپنے فلیٹ کی بالکنی میں بیٹھی اُس پیاری سی لڑکی کی دن بھر کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیا کرے جیسی تو وہ بڑے غور سے اُسے چلتے پھرتے دیکھتی۔ بچے کو پیار کرتے دیکھتی، رنگ برنگے کپڑے پہنتے دیکھتی۔ لان میں بیٹھے سوٹر بننے دیکھتی اور کچھ نہیں تو اُسے مطالعہ کرتے دیکھ اُس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ وہ ان کتابوں کا نام جان لے جنہیں وہ بغور

ہے کہ متوسط طبقہ کی لڑکی ہے؟ کیا نیلوانے اپنی دوستی کا حق یہ کہہ کر ادا کیا ہے کہ کون اس روکھی پھینکی لڑکی کو جیون ساٹھی بنا کر روگ مول لے گا؟ ہوں! تو وہ خشک اس لیے ہے کہ نیلو کی طرح اُس کا اپنا بچکھ نہیں شوہر نہیں بچے نہیں..... جن کی وہ مالک بکر نگرانی کرے۔ کیا ایک عورت کی زندگی کی کل کائنات کے یہی وہ مادی عناصر ہیں جن کے حصول پر وہ خوشی سے سرشار ہو جاتی ہے؟ لیکن نہیں! باجی تو اپنی زندگی سے مطمئن نہیں ہیں اور ہوں بھی تو کیوں؟ دوپہا بھائی کے ساتھ انہیں نہ صرف معاشی کفالت کرنی پڑتی ہے بلکہ ان کی جھک جھک بھی سنی پڑتی ہے۔ زندگی کی وہ ساری لطافتیں مسکراہٹیں اور راحتیں ایک خواب بن چکی تھیں جسے باجی جیتی جاگتی دنیا میں دیکھنے کی خواہش مند تھیں لیکن اس کے باوجود بھی ان کی محرومیاں لیوں پر گلے شکوے بن کر نہ آئیں حالانکہ دیکھنے والی آنکھیں انہیں دیکھ کر مٹولیں تو وہ مسکرا کر نگاہیں موند لیتیں جیسے اپنے غموں کو آنکھوں کے پیمانوں میں میسنے کی نام کوشش کر رہی ہوں۔

کالج کی تعطیلات میں جب وہ گھر لوٹی تو اپنی شادی کی باقاعدہ تیاریوں میں مسرور ہونے کی بجائے گم سم سی رہ گئی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی باجی سے اپنے حق کے لیے لڑنے لگی۔ اتنا بھی تو نہ کہہ پائی کہ باجی کیا آپ نے مجھے جانور سمجھ رکھا ہے کہ جس کے پلے باندھ دیا..... لیکن نہیں..... غلطی اس کی اپنی تھی۔ باجی نے تو بار بار خط کے ذریعے اس کی پسند اور رائے معلوم کرنا چاہی تھی مگر وہ ہر بار بے نیازی سے ٹال دیتی تھی جیسے وہ ابھی بچی تھی اور اس گراں ذمہ داری کو قبول کرنے سے قاصر۔

وقت گزاری کے لیے اس نے ڈھیروں افسانے پڑھ ڈالے تھے۔ تقریباً ہر افسانہ رومان کے کیف و سرور میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہیروئن ہے کہ لذت



فخص جو دولت سمیٹنے کے چکر میں پتھردل بن چکا تھا۔ ایک عورت کے حسین و نازک احساسات کا قدرداں کیوں ہو سکتا تھا؟ اُس نے تو کبھی بھول کر بھی یہ نہ پوچھا کہ تمہارے چہرے پر تلخی اور ناگواری کے احساسات کیوں ہیں؟ تم کن مصائب سے دوچار ہو؟ بے وقت کھانا کھا کر تم اپنی صحت کیوں برباد کر رہی ہو؟ کیوں لباس میں تساہل پسندی تمہاری عادت بن رہی ہے۔ اُس کی بلا سے وہ جیسے مرے یا جہنم میں جائے۔ سماج کے جس بندھن میں گرفتار ہو کر وہ نامعلوم اذیتوں سے دوچار تھی اُس کا مداوا تو دُور کی بات باجی اور بھیا تک کو اُس کی خبر نہ تھی۔

اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ جب اُس کی باجی نے اُسے گلے لگاتے ہوئے پوچھا؟ کیوں رباب تجھے ملازمت کی کیا پڑی جب گلفام کی ماہانہ آمدنی ہزاروں میں ہے۔ ہاں باجی اُن کی آمدنی ہزاروں میں ہے۔ پھر بھی چند سو کی رقم کے لیے انہوں نے مجھے کہہ دیا کہ میں گھر میں فالتو بیٹھ کر ڈگری ضائع نہ کروں۔ ٹھیک ہی تو کہا ہے باجی انہوں نے، میرا دل بھی لگ جاتا ہے اور خرچ بھی نکل آتا ہے۔ وہ طنزیہ مسکرائی۔ خرچ اور تیرا۔ وہ بھی گنی چنی رقم میں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ رباب؟ کیا وہ تیرا کفیل نہیں؟ اگر نہیں تو پھر اُس سے شادی کیوں کی تھی؟ میں آج ہی گلفام سے بات کروں گی، نہیں باجی نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں کچھ کہنے سننے کی۔ آپ کے کہنے سے ان کی فطرت بدل نہیں سکتی۔ عادت چھٹ نہیں سکتی۔ انہیں اگر میری پروا نہیں تو مجھے بھی گلہ کرنے کا کوئی حق نہیں۔ لیکن رباب تم یہ بھول رہی ہو کہ وہ تمہارا شوہر ہے۔ باجی نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ آپ بھی یہ بھول رہی ہیں کہ خوشیاں زبردستی خریدی نہیں جاسکتیں۔ میرا مقدر جن

پڑھا کرتی ہے۔ پھر شام کے چھپٹے میں تو اس کی نگاہیں غیر ارادی طور پر صاف و شفاف سڑک پر پھسلنے لگتیں۔ سکوڑی آواز کے ساتھ ساتھ اس کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہو جاتیں۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگتے اور جسم میں چوٹیاں سی ریگنے لگتیں۔ بمشکل اپنے آپ پر قابو پا کر وہ اس دلفریب منظر میں کھو جاتی کہ کیسے وہ پیاری سی لڑکی اُس فائل اپنے شوہر سے لے کر دل میں اُتر جانے والی مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرتی ہے اور بچہ باپ کی ٹانگوں سے لپٹ کر اپنے پیار کا اظہار کرتا تو وہ جھپٹ کر اُسے گود میں لے کر چومنے لگتا۔ اور..... اور جب رات کے سائے لہرانے لگتے، دونوں میاں بیوی ٹھونسنے لگتے تو اُس کے جذبات میں ہلچل سی بچ جاتی۔ پھر وہ گھنٹوں آنکھیں موندے مستقبل کے حسین تانے بانے میں اُبھی نیند کی پرسکون وادی میں چلی جاتی۔

شادی کی ہنگامہ آرائی میں وہ خود کو بھلا بیٹھی تھی۔ اُس نے صرف اور صرف ایک بار اپنے گلفام کو دیکھا تھا۔ گلفام تو اس کے تصور سے بھی کہیں حسین تھا۔ کاش اُس کا دل بھی اتنا ہی حسین ہو۔ ایک انجانا خوف جب کبھی اُسے ڈر دیتا تو اُس کی نظریں اُس بنگلے کا طواف کرنے لگتیں جس سے اُسے بے حد اُنسیت ہو چکی تھی۔

او! جانے یہ کیسی شادی تھی کہ گلفام نے اُسے کچر پارٹی، پینک یا چھوٹی موٹی تفریح میں سے کسی ایک کی بھی پیش کش نہ کی تھی۔ شادی کے ابتدائی دنوں کی رنگین بہاروں کا تصور تو خیر خزاؤں کا روپ دھاری ہی چکا تھا۔ پر اب تو وہ اپنی خشک زندگی کی تلخیوں سے بھی اکتا چکی تھی۔ جانے زمانے بھر کی بد نصیبی اُسی کا مقدر کیوں بن گئی تھی۔ اُسے اپنے شوہر سے ذرا بھر بھی تو ہمدردی نہ تھی اور ہوتی بھی کیوں؟ بھلا وہ

یسی کے عالم میں درہنچے کی ٹھنڈی سلاخوں سے اپنا چہرہ رگڑتے ہوئے وہ احساسات کی اس بغاوت کو روکنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی جو اُسے راہ فرار پر اُکسار ہے تھے۔

”کہہ تو دیا ہے رباب کہ مجھے تم سے کوئی انیت نہیں لگاؤ نہیں..... دلچسپی نہیں“۔ تو پھر مسٹر گلغام آپ نے شادی کیوں کی تھی؟ اس کا دل چاہا کہ جواب میں وہ یہ سب کچھ کہتے ہوئے اُس کا منہ توج لے، اُس کا گریبان پھاڑ ڈالے اور اُسے دھکے دے کر گھر سے نکال دے..... لیکن..... لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکی۔ سوائے آنسو بہانے کے۔ شاید اس لیے کہ وہ جانتی تھی کہ دنیا کی ظاہری آنکھیں اُسے ہی مورد الزام ٹھہرائیں گی۔ باوجود اس کے کہ احساس کی عدالت میں ازدواجی تخیلوں کا ذمہ دار صرف اور صرف اُس کا اپنا شوہر ہے جو اپنا ہو کر بھی اپنا نہیں۔

حالات نے رباب کے احساسات کو اس قدر مجروح کر دیا تھا کہ اسے اپنے ہونے والے بچے سے محبت تو بڑی بات ہلکی سی انیت بھی نہ تھی۔ اس بر گلغام کے رویے کی تبدیلی نے تو اُسے اور بھی مشتعل کر دیا تھا۔ ہوں! تو گلغام کو بچے سے ابھی سے والہانہ پیار ہے۔ جیسی تو ہر اگلے قدم پر پیچھے مڑ کر وہ اسے سہارا دینے کی کوشش کرتا جیسے وہ ازل سے اُس کا تمنا کی تھا۔ خود غرض، کمینہ فطرت انسان، میں نے تجھے اچھی طرح پرکھ لیا ہے۔ تُو مجھے اب فریب نہیں دے سکتا میں تجھے کبھی وہ خوشی نہیں دوں گی جس کا تو خواہش مند ہے۔ تو یہ سمجھ رہا ہے کہ بچہ تیری ملکیت ہے لیکن..... لیکن اگر میں چاہوں تو دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اُسے جیتے جی موت کے گھاٹ اتار دوں..... اس لیے کہ وہ تیرا ہی نہیں میرا بھی بچہ ہے۔ اُس پر پہلا حق میرا اور بعد کو تیرا ہے۔ دنیا بھی یہ نہیں کہے گی کہ میں اپنے بچے کی قاتل

## مشہور لوگوں، مختصر زندگی

شہرت اور دنیا میں نام بنانا ہر شخص کا مقصد ہوتا ہے تاہم ایک نئی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ مشہور لوگوں کی زندگی طویل نہیں ہوتی۔ آسٹریلیا میں نیو ساؤتھ ویلز اور کوئٹز لینڈ یونیورسٹی کی مشترکہ تحقیق میں کہا گیا ہے کہ معروف فنکاروں اور کھلاڑیوں کی اوسط عمر 77 سال جبکہ اس کے مقابلے میں معلم، ڈاکٹرز اور دیگر ایسے افراد جو زیادہ مشہور نہیں ہوتے ان کی اوسط عمر 82 سال ہوتی ہے۔

(خالد رؤف۔ کراچی)

## لائین میلہ

تائیوان میں سالانہ لائین میلہ منایا گیا، اس موقع پر عوام نے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ یہ میلہ نئے قمری سال کے پہلے مہینے کے 15 ویں روز منایا جاتا ہے جس میں ہزاروں لوگ شرکت کرتے ہیں۔ میلے کے دوران لائینیں روشن کی جاتی ہیں اور آتش بازی کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ رواں برس میلے کی خاص بات دیو قامت کھڑوں کی لائین تھی جو نئے چینی سال کی علامت ہے۔

(مرسلہ: سونیاطارق۔ فیصل آباد)

## انعام

نئی نویلی دہن پہلی بار اپنے ہاتھ کا لپکا ہوا کھانا شوہر کو کھلانے کے بعد بڑے ناز سے کہنے لگی۔ ”ڈرائنگ! اگر تمہاری نا چیز کینز اسی طرح تمہارے لئے کھانا پکاتی رہے تو اسے انعام میں کیا ملے گا؟“ شوہر نے جواب دیا۔ ”میرے پیارے کی رقم اور وہ بھی بہت جلد.....“

(مرسلہ: ڈاکٹر ندیم چودھری۔ حیدر آباد)

تاریکیوں میں ڈوب گیا ہے۔ اُسے نہ تو آپ روشنیوں سے ہمکنار کر سکتی ہیں اور نہ میں..... بے

اللہ کے رسول دین کے پیغمبر جو حیات و کائنات کی بنیاد ہیں

# سیارہ ڈائجسٹ کا عَظِيمُ الشَّانِ اور رُوحِ پَرَوَر



قیمت: 175 روپے ایڈیشن شائع ہو گیا ہے

اپنی سابقہ روایات کے شایانِ شان یہ نمبر پیغمبرانِ خدا کی  
حیاتِ جاوداں اُن کے معجزات اور ایمان افروز واقعات پر مشتمل  
ایک متاعِ بے بہا اور جاربِ دستاویز ہو گا۔

ایجنٹ حضرات غرضی طور پر ایف آر ڈر سے مطلع فرمائیے

سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ ریواڑ کازڈن لاہور۔ فون: 37245412



سے پکرا کر گر پڑی اور..... اور جب اُسے ہوش آیا تو شدت تکلیف کے باوجود اُس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ ہسپتال کی اجنبی فضا میں نرس کو اپنے اوپر جھکا ہوا دیکھ کر بے اختیار اُس کے لبوں سے نکلا۔ ”سسٹر میرا بچہ کہاں ہے؟“ ”بچے کو نہلایا جا رہا ہے بی بی۔ آپ یہ گولی کھالیں“ گولی کھاتے ہی اُس پر غنودگی کی سی کیفیت طاری ہو گئی وہ حقیقت کی دنیا سے دُور خوابوں کی حسین دنیا میں کھو گئی۔

نیند سے بیدار ہوتے ہی اُس نے اپنے پلنگ کو ٹٹولا لیکن وہ تو خالی تھا..... بالکل خالی..... اور جھولا..... جھولا بھی تو خاموش پڑا تھا..... نہ کسی کے رونے کی آواز..... نہ چلانے کی..... نہ کسی کا کلبلا تا وجود..... پھر اس کا بچہ کہاں ہے؟ کہاں ہے اُس کا بچہ؟ اس کی متلاشی نگاہیں دروازے پر مرکوز تھیں۔ شاید کہ نہ س بچے کو بنا سنوار کر لا رہی ہو۔ اُس نے دل تو ملی دی۔ ”رباب کیسی طبیعت ہے“ اب گلفام کی گیمیری آواز نے اسے بے چین کر دیا۔ کروٹ بدل کر اُس نے گلفام کو دیکھا۔ گلفام کی سرخ اور متورم آنکھیں اُس کے دلی کرب کی غماز تھیں ”گلفام میرا بچہ کہاں ہے گلفام؟“ اُس نے سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔ اپنے آنسو روکتے ہوئے وہ صرف اتنا کہہ پایا ”وہ دُور چلا گیا ہے رباب“ دُور..... بہت دُور! رباب میں تو اُس کا نام ”شاداب“ رکھنے والا تھا، لیکن..... لیکن زندگی کی شادابی اُس کا مقدر نہیں تھی! اور..... اور اس لمحے رباب کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ بچے ہی کی نہیں اپنے شوہر کی بھی قاتل ہے۔ وہ قاتل ہے..... وہ قاتل ہے..... خوشیوں کی قاتل..... آرزوؤں کی قاتل..... اور وفاؤں کی قاتل..... بیشار انجانی سرکوشیوں کی بوچھاڑ نے اُسے تڑپا تڑپا دیا، تو اتنے میں منہ چھپا کر وہ رو پڑی۔

ہوں۔ بھلا کوئی ماں اپنے بچے کی قاتل ہو سکتی ہے؟ لیکن..... لیکن مجھے ایسا کرنا ہوگا۔ میں ایسا کروں گی اور ضرور کروں گی..... تجھے تڑپانے کے لیے..... اذیت دینے کے لیے..... زندہ درگور کرنے کے لیے.....!

”رباب بچے کے کپڑے وغیرہ سب تیار کر لیے تم نے؟“ گلفام نے گھر لوٹتے ہی دھیر سے کھلونے اور بے بی سیٹ اُس کے آگے ڈال دیے ”جی ہاں بالکل“ بظاہر مسکراتے ہوئے اور حقیقتاً نفرت سے منہ سکوڑتے ہوئے وہ تلخی سے بولی۔ ”کتنی کمزور ہو گئی ہو رباب، ڈاکٹر سے انجکشن اور ٹائیک کیوں نہیں لکھواتیں؟ گھر میں پڑی پڑی بور ہو جاتی ہو، میں تمہیں بار بار کہہ چکا ہوں کہ جہاں دل چاہے چلی جایا کرو۔ چلو باجی کے گھر چلیں بہت دن ہو گئے ان سے ملے ہوئے“ اخبار اپنے سامنے پھیلائے وہ وہ گنگٹانے لگا۔ ”گلفام! یہ تم کہہ رہے ہو گلفام..... زندگی میں پہلی بار اتنی ہمدردی اور خلوص سے.....“ اُسے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا..... نہیں..... نہیں..... تمہیں مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں..... لگاؤ نہیں..... دلچسپی نہیں..... تمہیں تو صرف اپنے ہونے والے بچے سے پیار ہے اس بچے کی خاطر تم مجھے دھوکا دے رہے ہو سلی دے رہے ہو۔ زندگی سے پیار کرنا سکھا رہے ہو..... تو کیا میری اپنی حیثیت محض ضمنی ہے اور بچے کی حیثیت کلی ہے؟ نہیں..... نہیں..... ایسا بھی نہیں ہو سکتا..... کبھی نہیں..... کبھی نہیں! میرے جیتے جی تم مجھے نظر انداز کر دو اور بچے کو سینے سے لگا لو..... میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دُوس گی۔ غصے سے اُس کی مٹھیاں میچ گئیں تو اُس کا بدن شدت جذبات اور احساس شکست سے کاپٹنے لگا..... لیکن اپنی کیفیت کی پروانہ کرتے ہوئے وہ تیزی سے غسل خانے کی طرف بھاگی اس سے قبل کہ آنسوؤں کی آگ کو ٹھنڈے پانی سے بجھا سکے دھڑام

سب کہ دو سیفٹی

پھر کہ دو

کوٹلہ سیفٹی شوز



SAFETY BOOTS & SAFETY SHOES WITH STEEL TOP-CAPS,  
SHOE COVERS & GUM BOOTS (MADE OF PAK, CHINA, ITALY, U.K.)



**KOTLAA**

**SAFETY HALMET  
& SAFETY SHOES**

FIRST FLOOR, ASLAM ARCADE, 16-McLEOD ROAD, LAHORE. Ph: 7314287-88

جیسے ہزاروں کی تعداد میں ان گنت چاندی کے ورق رضا کے گول منول چہرے سے چٹ گئے ہوں۔ رضا کھجور کھا رہا تھا اور گھٹلیاں میری جیب میں ڈال رہا تھا۔ وہ ایسا ہی ہے ہسانے والا۔ گلفٹہ، گلفٹہ۔ ”سبحر عبداللہ! ایک بات پوچھوں.....؟؟“ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا، میں جانے کس موڈ میں تھا میں نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

”بھائی! آپ اپنے ماں، باپ سے ناراض کیوں ہیں۔ وہ آپ کی جدائی میں تڑپ رہے ہوں گے۔ آپ انہیں کس بات کی سزا دے رہے ہیں؟؟“ وہ مجھ پر الزام ڈال رہا تھا۔ وہ مجھ سے گزری ہوئی کہانیوں کی روداد دریافت کر رہا تھا ”رضا صاحب! تمہیں اُن کی تڑپ نظر آگئی اور جو انہوں نے میرے ساتھ کیا وہ کیوں نظر نہیں آیا۔ وہ اوّل روز سے جانتے تھے کہ میری دلچسپی میڈیکل میں ہے پھر بھی..... کیا وطن کے لیے جو خدمت یہاں ہو رہی ہے کیا وہ میں ڈاکٹر بن کر نہیں کر سکتا تھا؟“ میں اسے لا جواب کرنا چاہتا تھا مگر شاید وہ مجھ سے زیادہ اس فن میں طاق تھا۔

”میرے بھائی! ڈاکٹری میں سب سے اوّل چیز مفاد ہے اور یہ خدمت گزاری کا وقت آخر میں آتا ہے۔ والدین کبھی غلط نہیں ہو سکتے۔“ میں چپ بیٹھا رہا۔ وہ مجھے دیکھ رہا تھا میں نے نظریں چرا لیں۔ میں نے اپنے کندھے پر اس کا ہاتھ محسوس کیا۔ میں جانتا تھا اگر میں نے مڑ کے دیکھا تو وہ میرا راز جان جائے گا۔ اور راز تو ہوتے ہی چھپانے کے لیے ہیں۔ رضا شاید مسکرا رہا تھا میں رات کی چادر پر سجے چاند کو دیکھنے لگا۔ رضا نے پیچھے سے کہا ”عبداللہ! میں جانتا ہوں کہ تم دور رہے ہو۔ وہ تمہیں یاد آتے ہیں مگر تمہاری اتنا تمہیں روک رہی ہے تم انہیں یاد کرتے ہو، اب روتا بند کرو۔ رات کے آخری پہر نہیں

جذبہ محسوس کیا ہو۔ کہتے ہیں ناں زبردستی مسلط کیے جانے والے فیصلے دیر پا ثابت نہیں ہوتے۔ تب سے میں اس فیصلے کے ختم ہونے کا انتظار کر رہا ہوں۔ مجھے والدین یا دُنئیں آتے شاید اسی وجہ سے اتنے سال گزرنے کے بعد بھی میں نے پلٹ کر اُن کی خبر نہ لی۔ میں سمندر میں پڑ جانے والے بھنور کے خونی حصار میں ہوں۔ مگر کسی کو بھولنا نہیں..... کیا واقعی؟؟

مگر میں شاید گھر کے ساتھ ساتھ کینوں کو بھی بھولتا جا رہا ہوں۔ اپنی پوری فوجی کیموفی میں، میں، رضا اور عمر کے ساتھ خونی محسوس کرتا ہوں جبکہ کیف علی سے مجھے نفرت ہے شاید اس لیے کہ اُس میں وطن کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

کیف علی کہتا ہے ”وطن کے لیے جی کر دیکھا تو زندگی کا مقصد سمجھ میں آیا اور نہ لگی بندھی روشنی میں سوتا جاگنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس دھرتی کی زمین پر قدم رکھتے ہی انگ! انگ! سرشاری محسوس کرتا ہے۔ آسمان سر پر ہونے کی اہمیت اتنی نہیں بیتی کہ وطن کی مٹی کا قدموں کے نیچے ہونا ہے۔ زندگی کے دوڑتے بھاگتے قدموں کے ساتھ چلنے کو فوجی زندگی ہمیں تربیت دیتی ہے۔ اگر آپ محبت وطن نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ کبھی بھی دل کو حب الوطنی کے جذبہ سے خالی مت رکھیں۔“ یہ کیف بھی ناں، اس کو ایسی افسانوی باتیں کرنے کی عادت ہے۔ بہر حال ایسی باتیں کر کے میرا دل کبھی نہیں جیت سکتا۔ کیا باتوں سے دل جیتے جاسکتے ہیں؟؟ مگر میں اب کیف سے خوف محسوس کر رہا ہوں اگر اُس نے میرے دل میں حب الوطنی کا جذبہ جگا دیا تو مجھے جان کی قربانی دینی پڑے گی۔ مگر نہیں میں مرنے سے بہت ڈرتا ہوں۔ میں اور رضا اونچی پہاڑی پر بیٹھے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا سے رات کا یہ خاموش پہر کافی سکون بخش تھا اور سفید روشنی میں ایسا لگ رہا تھا



روتے۔“

السلام علیکم!

ہم خیریت سے ہیں۔ آپ کی خیریت نیک مطلوب ہے۔ عبداللہ چچا آپ اس بار میرے لیے گزیا ضرور بھیجنا۔ اور گول مثل چچا (رضا) آپ بھی کنبوی کی روایت چھوڑتے ہوئے کچھ بھیج دینا۔ اور کیف چچا آپ نے جو ڈائری ارسال کی وہ مجھے بہت پسند آئی۔ شکریہ۔

میرا چوڑہ مر گیا ہے ابو آپ آئیے گا تو ضرور لے کر آنا۔ امی بھی سلام کہہ رہی ہے۔ ابو اس عید پر ضرور آئیے گا ہم انتظار کریں گے۔ ہم اداس ہیں آپ کے بغیر۔ اب آئندہ ماہ لکھوں گی۔ رب راکھا۔ ہمارے دل سرشار ہو چکے تھے۔ عمر نے چٹھی میرے ہاتھ سے لے کر چوم لی۔ ہم خاموش بیٹھے تھے۔ مجھے لگا جیسے کوئی شدت سے مجھے یاد آیا ہو۔ نہیں، نہیں یہ میرا وہم تھا۔

مگر میں ناواقف تھا کہ وہم یقین کی پہلی سیڑھی ہیں۔ ابھی ہم ڈیوٹی سے فارغ ہو کر آرام کی غرض سے بیٹھے ہی تھے کہ کرل آفریدی چلے آئے۔ ہم سب کو مشترکہ سلام کر کے وہ ہمارے درمیان بیٹھ گئے۔ اُن کے چہرے پر چٹانوں کی سی سختی چھائی ہوئی تھی۔ وہ ہم سے مخاطب ہوئے۔ ”نوجوانو! ایک غیر مصدقہ اطلاع ملی ہے کہ شاید کل دشمن ہم پر حملہ کرے۔ ہمیں ہر حال میں چاق و چوبند رہنا ہوگا۔ ذرا سی لغزش ہمارے لیے زہر قاتل ثابت ہو سکتی ہے۔ ملک کے دفاع کے لیے حوصلہ اُبھارو۔ ورنہ میرے جعفروں کی اس ملک میں کوئی کمی نہیں“ وہ بات کر کے رُکے اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے ”اور تم عبداللہ اپنی فکروں کو اپنے تک محدود رکھو۔ یہ تمہارے ساتھ ساتھ اس دھرتی کے لیے بھی باعث نقصان ہیں۔“

میں خاموش بیٹھا رہ گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا

مجھے راز چھپانا نہیں آتا تھا اور اسے راز جاننا آتا تھا۔ وہ جارہا تھا میں نے دو دھیا روشنی میں اس کی پیٹھ دیکھی اور چلایا ”احمد رضا! تم بہت بُرے ہو۔“ اُس نے پلٹے بغیر جواب دیا ”ہاں..... ہاں مگر میں میجر عبداللہ سے بہت کم بُرا ہوں۔“

وہ ہنسا ہوا جارہا تھا۔ میں نے دیکھا چاند بھی ہنس رہا تھا، صبح ہو چکی تھی۔ ابھی بھی اندھیرا پوری طرح گیا نہیں تھا۔ بلکہ اندھیرے میں ہر چیز کا نیلا نیلا تاثر ابھر رہا تھا۔ میں قائلین پر بیٹھا چائے پی رہا تھا جبکہ رضا قائلین کے آخری سرے پر آدھا قائلین اور آدھا زمین پر لیٹا بانسری بجا رہا تھا۔ میرے اور عمر کے خیال کے مطابق وہ ہر فن مولا شخص تھا۔ مگر اُسی قدر بے ڈھنگا اور بے ترتیب۔ ابھی چائے کا گھونٹ میرے منہ میں ہی تھا جب میں نے عمر کو آتے دیکھا۔ وہ بھاگتا ہوا آ رہا تھا اسی وجہ سے اس کا سانس بھی پھولا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خاکی لفافہ دبا ہوا تھا۔ ہم سب جانتے تھے کہ اس میں کیا تھا۔ ہمیں اس کا شدت سے انتظار رہتا تھا۔ ”عبداللہ یار! جلدی سے پڑھ دے تاکہ دل کو ٹھنڈک ملے“ وہ میرے سامنے قائلین پر ہی آلتی پالتی مارے بیٹھ گیا۔ جوش سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ اس کی بیٹی ”لاڈو“ اور ہم سب کی بھیج کی چٹھی تھی۔ ہر نئے مہینے وہ ہمیں چٹھیاں ارسال کرتی تھی۔ وہ دس سال کی تھی۔ بلا کی ذہین اور تیز طرار وہ ہمیں اکثر چیزیں پکا کر بھی بھیجتی تھی۔ اُس کے ننھے ہاتھوں سے بنے ”چھوٹے چھوٹے لڈو“ ہمیں دنوں تک سرشار رکھتے۔ سارے سامعین اکٹھے ہو چکے تھے۔ میں نے چٹھی کھول کر گفتگو سے پڑھنی شروع کی۔ ہر طرف خاموشی تھی، سناٹا۔ میرے لفظ بول رہے تھے۔

”محترم ابا جان اور چاچا صاحبان!

آرہے تھے۔ اس کے جسم سے خون لپٹا ہوا تھا۔ سرخ، گاڑھا خون۔

میں دوانے وار اس کے وجود کے گرد لپٹا..... زندگی رخصت ہو چکی تھی۔ پھر میں نے اپنے ہر ساتھی کو مرتے دیکھا۔ ہر انسان کے وجود میں ”ضمیر“ نامی حس ہوتی ہے شاید مجھ میں بھی تھی۔ مجھے موت سے خوف آتا تھا مگر اب مجھے زندگی سے خوف کیوں آرہا ہے؟

مجھے لگا میرے ماں باپ کی دی ہوئی دعائیں سفید کبوتر بن کر میرے گرد پھڑپھڑا رہی ہیں۔ میں راکفل اٹھا کر اپنے عمار پر جم چکا تھا۔ وطن کی سوئی ہوئی محبت بیدار ہو چکی تھی۔ آہ..... ایک انگارہ میرے وجود میں بھر گیا ہے۔ میں رفتہ رفتہ حواس کھو رہا ہوں۔ میری سانس آکھڑ رہی ہے۔

میری آنکھوں سے آنسوؤں کی بجائے خون پانی بن کر بہہ رہا ہے۔ مجھے اپنے ماں باپ یاد آرہے ہیں۔ ساری خاک خون آلود ہو چکی ہے۔ مجھے ماں کے الفاظ یاد آرہے ہیں ”شہید کبھی مرتے نہیں میں وعدہ کرتی ہوں میں تمہاری شہادت پر ماتم نہیں کروں گی کیونکہ مجھے پتا ہے میرا بیٹا میرے پروردگار کے پاس امن و سکون سے ہوگا۔“ میں نے ذوقی رات کے کنارے پر زندگی کی جنگ لڑتے ہوئے اپنے ماں باپ سے معافی مانگی ہے۔ چاند، ستارے اور یہ رات میری گواہی دیں گے۔ میری آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔ آنکھوں کی بصارت کی اوٹ میں نور کے قہقہے جل بھڑ رہے ہیں۔

سنہری تتلیاں میرے گرد رقصاں ہیں۔ ہاں یہ زندگی اُس زندگی سے بہتر ہے۔ اک فرض تھا جوادا ہو گیا۔

اور اک قصا کی تکمیل ہو گئی اور خاک کی چادر اوڑھ کے بسر کرنے والی زندگی کتنی آسان ہے.....

ہے ناں؟؟

اسے زمین میں زندہ دفن ہونا کہتے ہیں؟؟

اس رات میں لرزتا رہا۔ بہت دیر بعد مجھے نیند آئی۔ مجھے رات کے اندھیرے میں اک عجب سانس محسوس ہوا۔ پھر میں نے خواب دیکھا۔ روح کھینچ دینے والا۔ مجھے خوف محسوس ہوا۔ موت کا خوف..... کیا زندگی ماتم میں ڈھلنے والی تھی؟؟ ہاں..... یا شاید نہیں۔ وہ کپڑے کے تین تھان سے تھے جو آسمان سے پرواز کر کے زمین کی طرف آرہے تھے۔ سفید کپڑا، یعنی امن، سکون اور آخر میں کفن یعنی موت۔ پھر میں نے ان کفنوں کو رضا اور عمر کے ساتھ ساتھ کیف کے وجود کے گرد لپٹے دیکھا۔ حیرت تھی کہ کفن میں مقید چہروں کی آنکھیں کھلی تھیں۔ ہونٹوں کے ساتھ ساتھ آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں وہ زندہ تھے۔ پھر میں نے تیسرہ چہرہ دیکھا، وہ کیف تھا۔ پھر چوتھا چہرہ جس میں کوئی اور وجود تھا میں نے قریب جا کر دیکھا وہ دھند میں لپٹا ہوا تھا اور دھند میں لپٹی چیزیں آسانی سے کہاں نظر آتی ہیں؟؟

میں بھی نہ دیکھ سکا۔ صبح میں نے سب سے پہلے رضا اور عمر کو دیکھا وہ آرام سے سو رہے تھے۔ مجھے اطمینان ہوا۔

وہ کہتے ہیں ناں کہ اطمینان بہت جلد رخصت ہو جاتے ہیں اور آنے والے دنوں میں مشاہدات، تجربات کی شکل اختیار کرنے والے تھے۔ اسی رات ایک دھماکے نے ہمیں ساکت کر دیا۔ تو کیا کرنل آفریدی کی بات سچ ثابت ہونے والی تھی؟؟

اُسی وقت دو دھیاروشنی میں میں نے عمر اور رضا کو بندوقیں لے کر بھاگتے دیکھا۔ مگر میرے قدموں نے جیش نہ کی مجھے خوف آرہا تھا کہ کہیں موت کی چادر میرا وجود نہ ڈھانپ لے۔ راکفلیم بم چلتے رہے، میں بیٹھا رہا مگر کرب تک۔

رضا اور کیف خون میں لتھڑے عمر کو لے کر

# کسی کی ڈفلی میرا راگ

نو شاہ اختر

خاتون خانہ جن کی شوہر کی وفات ہوئی تھی میرے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک جواں سالہ بچی اچھی خوبصورت سی اُن سے ملنے کے لیے آگے بڑھی۔ یقیناً جانیں میرے بدن کے تو روٹنے کھڑے ہو گئے۔ سیلوولیس شرٹ اور ٹائٹس کچھ سکن کرا اور پھر آدمی پنڈلیوں تک باقی آپ خود سوچ لیں۔



معاشرے کی جھلک دکھاتے حقیقی واقعات جن میں عقل والوں کیلئے عبرت کا سامان ہے

کچھ اس طرح تھے۔ کائنات کا سب سے بڑا سچ کیا ہے؟ کائنات کا سب سے بڑا جھوٹ کیا ہے؟ اور وہ کون سا وقت ہے جب ہم اللہ تعالیٰ کو اپنے سے دور کر کے فیصلہ کر لیتے ہیں؟

کہتے ہیں کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا اُس نے اپنے عقل مند وزیر باتدبیر کو بلایا اور اُس کے سامنے تین سوال رکھ کر فرمایا کہ ان تینوں کے صحیح جواب بتاؤ ورنہ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ سوال



نہیں۔“ کہنے لگے ”جا گئے کا دودھ نکال کر ڈول میں ڈال کے ادھر ہی لے آ۔“ وہ بھاگتا گیا اور تھوڑی دیر میں دودھ کا بھرا ڈول لیے آ گیا۔ اب باباجی نے کتے کی طرف اشارہ کیا ”جا اُس کو بھی لے آ“ وہ کتے کو کھول کے لے آیا تو باباجی نے کتے کو مخاطب کر کے فرمایا ”بھوکا ہے پی لے“ اور کتا دودھ پر ہل پڑا۔ جب اس کا پیٹ بھر گیا تو وہ واپس اپنی جگہ پر جا کے بیٹھ گیا۔

وزیر کو جواب لینے کی جلدی تھی۔ اس ساری خرافات کو اس کی عقل سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس نے تیسرے سوال کا جواب طلب کیا تو باباجی نے ایک کٹورا دودھ کا بھر کر (کتے والے دودھ کا) وزیر کی طرف بڑھایا اور بولے یہ پی لو۔ پھر تیسرے سوال کا جواب دیتا ہوں۔ وزیر حیران کہ کتے کا جھوٹا انسان ہنی لے۔ بولا ”باباجی یہ تو کتے کا جھوٹا ہے۔ میں کیسے بیوں؟“ وہ بولے، ”اسی میں تیسرے سوال کا جواب پوشیدہ ہے۔“ وزیر صاحب کو موت کا پھندہ نظر آتا تو سب کچھ بھول کر پیالہ پکڑا اور منہ سے لگانے ہی لگے تھے کہ باباجی نے کہا۔ ”بس بس پیالہ رکھ دے۔ یہ ہی تیرے سوال کا جواب ہے۔ جب تُو نے اللہ کو اپنی زندگی سے نکال کر فانی حیات کی ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی اور سوچ لیا کہ یہ گندے دودھ کا پیالہ ہی مجھے مرنے سے بچا سکتا ہے تو تُو نے اللہ سے تعلق تو ڈلیا۔“

کہیں کسی محفل میں سنی ہوئی یہ حکایت ہر وقت میرے ارد گرد گھومتی رہتی ہے۔ شاید اس حکایت کی کوئی بھی بات ہمارے لیے حقیقت نہیں رہی۔ ہم ہر وقت کہتے ہیں ”موت تو برحق ہے“ لیکن اس کے لیے کوئی تیاری نہیں کرتے۔ موت جو ہمارے چاروں طرف ناچ رہی ہے۔ ٹی وی پر بریکنگ نیوز آتی ہے ”ایک اور خودکش دھماکا تیس افراد قتلہ

الفاظ کے اُلٹ پھیر کے ساتھ سوالات بھی تھے۔ بہر حال وزیر بابتدیر سخت پریشان ہوئے کیونکہ میری طرح انہیں بھی ان میں سے کسی کا جواب معلوم نہیں تھا۔ بادشاہ سلامت نے فرمایا جاؤ اور سات روز میں صحیح جوابات کے ساتھ واپس آؤ۔ ورنہ کوٹھو پچھ کر وادوں گا۔

وزیر صاحب حیران و پریشان جنگل میں چلے گئے۔ روتے جاتے اور کہتے بے موت مرنے کی تیاری کرلو، وہیں کسی اللہ والے کی کنی تھی۔ جس میں سے ایک بزرگ باہر آئے، اور وزیر کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے کیا بات ہے؟ تم پر شاید کوئی بہت بڑی آفت آن پڑی ہے۔ کچھ بتاؤ شاید میں اللہ کے کرم سے تمہارے کچھ کام آسکوں۔ وزیر صاحب نے روتے روتے ساری داستان اُن کے گوش گزار کی اور بولے ”باباجی! میں تو ناامید ہو کر بے موت مرنے کے لیے تیار ہوں، مگر میرے بیوی بچے؟ باباجی کچھ دیر کچھ سوچتے رہے اور بولے کہ بیٹا دنیا کا سب سے بڑا بچ موت ہے۔ جو ہر حالت میں وقت مقرر پر آجائے گی۔ اور دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ ”میں اور میرا ہے“ میرا مال، میرے بیٹے، میری جائیداد میری وراثت، یہ سب جھوٹ ہے کیونکہ موت کے آتے ہی سب کچھ پرایا ہو جائے گا۔

وزیر کی آنکھوں میں اُمید کی جھلک نمودار ہوئی اور بولے باباجی آپ نے مجھے مرنے سے بچا لیا۔ اب تیسرے سوال کا جواب بھی دے دیں۔ انہوں نے کہا ”ہاں چلو میری کنیا میں بیٹھتے ہیں اور تیسرے سوال کا جواب بھی تلاش کرتے ہیں۔“

وہ دونوں کنیا میں داخل ہوئے سامنے ایک بہت بڑا کتا زبان باہر نکالے سانس لے رہا تھا۔ باباجی نے کوئی آواز دی تو آ۔ لڑکا آ گیا۔ باباجی نے پوچھا ”اس کو کچھ کھلا ہے“ وہ بولا ”ابھی

### بازیابی

امیر گھرانوں میں عجیب عجیب نسل کے نئے پالنے کا رواج ہے۔ ایک امیر خاتون کا لمبے بالوں والا چھوٹا سا کول مثل عثمان گم ہو گیا ہے۔ جو انہیں جان سے زیادہ عزیز تھا۔ انہوں نے اسے بہت تلاش کیا، انعام بھی رکھا مگر نہ ملا۔ آخر انہوں نے ہماری معاونت پر ایک سراغ رساں کی خدمات حاصل کیں۔

سراغ رساں نے نئے کو تلاش کر لیا مگر اس کی حالت اچھی نہیں تھی وہ گلیلا تھا اور مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ یہ تمہیں کہاں سے ملا؟ خاتون نے نئے کو گود میں لیتے ہوئے پوچھا۔

”قریبی مارکیٹ سے“ سراغ رساں نے جواب دیا۔

”ایک بلڈنگ کے چوکیدار نے اسے لمبے سے ڈنڈے کے سرے سے باندھا ہوا تھا اور وہ اس سے کھڑکیاں اور روشن دان صاف کر رہا تھا۔“

(مرسلہ: حیدر ناظم۔ لاہور)

پھر آن گرا گاؤں کا ایک جوان شہید ہو گیا تھا۔ اونچا لمبا، جلال الدین تین سکھوں کو جہنم میں دھکیل کر خود جنت کی راہوں پر چل پڑا اور اُس کا جنازہ گاؤں میں لایا جا رہا تھا۔ یہ سب تحریر کرتے ہوئے میرے بدن کے دو ٹکٹے بار بار کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس چھوٹی سی عمر میں دیکھا جانے والا پہلا شہید کا جنازہ کس شان سے آ رہا تھا۔ ایک حم غیر تھا۔ ہر کوئی کندھا دینے کے لیے بے تاب، بھائی نے مجھے گھر چلے جانے کے لیے کہا تو میں چپ کے کھڑی ہو گئی۔ جنازہ ایک والان میں رکھا گیا۔ بڑے بڑے اور اونچے لوگوں کے درمیان سے گزرتی میں نہ جانے کیسے شہید کے پاؤں کے قریب جا پہنچی۔ ایک پاؤں جس پر پاک خون کی مہندی لگی تھی۔ وہ جٹانی پاؤں آج بھی مجھے اپنے

اجل بن گئے۔ دس زخمیوں کی حالت تشویشناک ہے، اور اس کے ساتھ ہی کوئی زبردست قسم کا اشتہار گانے اور ڈانس کے ساتھ لگایا جاتا ہے کیونکہ مرنے والے کوئی اور تھے میں تو نہیں تھا۔ مجھے یاد ہے 1963ء میں مری جاتے ہوئے ایک بس حادثے کا شکار ہو گئی۔ جس میں تیس لوگ تھے جو سب فوت ہو گئے یقین کریں مری کی ساری مال روڈ دو روز تک سسکیاں لیتی رہی۔ ہر شخص سر جھکائے کھڑا تھا ہر ایک کی چشم گیر تھی۔ یوں جیسے مرنے والا اُسی کا عزیز تھا۔ آج ہم بے جی کی اس حد تک پہنچ چکے ہیں جب بندہ اپنی ذات کے دائرے سے باہر ہی نہیں نکلتا۔ میں، میری اولاد میرا مال و دولت سب محفوظ ہے، تو بس سب اچھا ہے، ہم ہر فیصلہ کرتے وقت اللہ کی ذات کو بھلا کر اپنی مرضی کا فیصلہ کرتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ اصل فیصلے کرنے والی ذات تو وہی رب کا ذات ہے۔

ہاں تو بات چل رہی تھی یوم آزادی کی، وہ دن جو رب کا ذات نے اپنے فضل و کرم سے قائم و دائم کی محنت کے ذریعہ مسلمانوں کو ایک نعرے ”پاکستان کا مطلب کیا؟ لا اللہ الا اللہ کی خوشی میں عطا فرمایا۔ لیکن یہ خوشی، یہ آزادی کی نعمت حاصل کرنے کے لیے کتنی قربانیاں دی گئیں۔ آج بار بار یاد دلانے کے باوجود کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ آج کا پاکستان وہ تو نہیں ہے جس کا خواب اقبالؒ نے دیکھا تھا۔

مجھے یاد ہے حالانکہ اس وقت میری عمر چھ سال ہی ہوئی۔ گاؤں سے بھائی لوگ شہر جاتے تو نانی دادی اماں سبھی فکر مند بھی ہوتی تھیں اور اللہ سے ناطہ جوڑتے ہوئے آزادی کی دعائیں بھی کرتی تھیں۔ فسادات جہلم میں بھی ہو رہے تھے لیکن گاؤں کی فضا میں کچھ سکون تھا۔

لیکن اُس روز اس سکون کے سمندر میں ایک

اس کلمے پر کاربند رہنے کی جسے بلند کر کے ہم نے اللہ سے یہ ملک لیا تھا۔ اس کے بعد پشاور کی پریڈ گراؤنڈ میں سارے لوگ پریڈ دیکھنے کے لیے چل پڑتے تھے۔ ہم چونکہ فوجی کے بیٹے تھے اس لیے ہم صبح جاکر اپنی سیٹوں پر بیٹھ جاتے۔ ایک ولولہ ایک جوش ہم سب بہن بھائیوں کے دلوں میں ٹھانٹھیں مار رہا تھا۔ رات بھر جانے کے باوجود ٹھکن نہیں ہوتی تھی اور یہ جاننا گڈی کاغذ کی جھنڈیاں بنا بنا کر سوتر پر آنے کی لٹی سے لگانے اور گھر سجانے کے لیے ہوتا تھا۔ پریڈ گراؤنڈ پھر تھوڑی دیر بعد اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھتی تھی اور یقین جانیں یہ جذبہ آج بھی میرے دل میں موجود ہے۔

اب آج کا یوم آزادی ملاحظہ فرمائیں، سائیکس ٹرنکی موٹرسائیکلوں کی قطاریں، ہر موٹرسائیکل پر تین تین سوار اونچی آواز میں گانوں کی گونج اور تیز رفتاری کا یہ عالم کہ الامان الحفیظ۔ چند سال قبل ہمیں ڈاکٹر زہیپتال لاہور جانا تھا۔ سو صبح نماز کے فوراً بعد نکل چلیں، پھر مشکل ہو جائے گا یقین جانیں ساری نہر پر وہ طوفان بدتمیزی تھا کہ گاڑی چلانا مشکل ہو گیا۔

اس سے پہلے مال روڈ پر بھی یہی طوفان بدتمیزی پھا رہا۔ موٹرسائیکل سوار نہر سے ریگل چوک تک جاتے اور اسی شور کے ساتھ واپس لوٹتے۔ اگلے روز کے اخبار میں ایک کالم تھا۔ ”کہتے ہیں گدھا جب اپنے جوش میں ہوتا ہے تو وہ بھاگتا ہوا تھوڑی دُور جاتا ہے اور بھاگتا ہوا واپس آتا ہے اور گھٹنوں اس کا یہ عمل جاری رہتا ہے اور ان لڑکوں پر یہ مثال پوری اُتر رہی تھی۔ میں نے لکھنے والے کی سوچ کی شاباش دی تھی۔

جب ہم چھوٹے تھے تو پاکستان کا جھنڈا بڑی عمارتوں پر صبح لہرایا جاتا اور مغرب کے وقت اُتار لیا

چاروں طرف نظر آتا ہے۔ تو میں سوچتی ہوں کیا یہ لوگ اُن شہیدوں کے خون کی لاج بھی نہیں رکھ سکتے۔ یہاں ویلنٹائن ڈے منایا جاتا ہے۔ اتنی بے ہودگی اتنی بے حیائی کے ساتھ، یہ کیسا اظہار محبت ہے جو کلبوں میں آوارہ پھر رہا ہے۔ کتنی مقدس محبتیں تھیں جن کا جنازہ نکل چکا ہے۔ مادر پدر آزادی کی کا یہ حال ہے کہ ایک لڑکے نے عباہیہ میں چھپی ایک لڑکی کو گلاب کا پھول پیش کیا اور ذرا سا جھک کر مسکرایا، تو ایک زوردار تھپڑ نے اس کی تواضع کر دی۔ کیونکہ عباہیہ کے اندر اس کی اپنی بہن تھی اور یہ المیہ گلی گلی میں دہرایا جاتا ہے۔

سکولوں میں ہیلوون ڈے منایا جاتا ہے اور بچوں کو اُس روز ڈرائے لباس اور ماسک پہننے کو کہا جاتا ہے۔ یہ دن امریکہ میں اس سوچ کے ساتھ منایا جاتا ہے کہ بدروص ایک بار نکل کر چلی جاتی ہیں اور پھر سال بعد لوٹتی ہیں۔ کیا ہمارے ملک میں بدروص بھی سال بھر چھپی رہتی ہیں۔ ایک بار میں ایک سکول کی پرنسپل کے پاس خاص طور پر یہ پوچھنے گئی تھی کہ اس دن کے منانے کا مقصد کیا ہے تو انہوں نے ازراہ کرم فرمایا ہمارے بچوں کو دنیا میں منائی جانے والی ہر تقریب کا علم ہونا چاہیے۔ کیا کوئی بھی قاری مجھے اس سوال کا مطمئن کرنے والا جواب دے سکتا ہے؟ ہمارے ملک کے بہت سے لوگ امریکہ میں مقیم ہیں کیا عید الفطر یا عید الاضحیٰ پر وہاں سارے ملک میں چھٹی ہوتی ہے۔ کیا وہ لوگ ہمارا یوم عاشور، یوم عید میلاد النبی مناتے ہیں۔ ہمیں ہی کیوں ہر بے ہودہ رسم کو اپنے بچوں کے مصوم ذہنوں میں منتقل کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔

ہاں تو بات بہت دُور جا نکلے۔ ہمارے بچپن میں یوم آزادی، عید کی طرح منایا جاتا تھا۔ صبح کی نماز میں ملک کی سلامتی کی باقاعدہ دعاں لیں ہوتی تھیں۔



جو پیغام ہم السلام علیکم کے ساتھ دوسرے کو پہنچاتے ہیں۔ اس کا اجر و ثواب تو رب نے عطا فرمانا ہے لیکن و علیکم السلام کہنے والا بھی ہمیں نیکیاں اور سلامتی لوٹاتا ہے۔

دراصل ہم نے لباس کی خوبصورتی، حیا داری اور عظمت کو چند ”چیتھروں“ میں بند کر کے اپنے آپ کو اس ٹولے کا روپ دے دیا ہے جو ہنس کی چال چلتے چلتے اپنی چال بھی بھول گیا۔ آج ہم آدھا تیز آدھا بئیر بنے اپنے آپ کو بہت اعلیٰ سمجھ رہے ہیں۔ بچوں کے ایک سکول میں، میں نے تین فیشن اسٹیل خواتین کو دیکھا۔ ایک نے لمبی سی قمیص کے نیچے بڑا شانسل پلازو پہن رکھا تھا اور وہ اس فیشن میں بھی خاصی معتبر لگ رہی تھی۔ دوسری نے لمبی فراک نما قمیص شلوار کے اوپر پہن رکھی تھی اور دوسری بھی چہرے کو خوبصورت بنا رہا تھا۔ یہ ذرا منفرد سی لگی۔

آئیے اب آپ کو تیسری خاتون سے ملائی ہوں۔ اچھے خاصی گوری جٹی موٹی تازی ایک خاتون منقہ جلی آرہی تھی۔ کالے رنگ کی شیفون کی عجیب تراش کی قمیص سیلیویس ہی تھی اور جب ہم نے نیچے نظر کی تو یقین جانیں میں بھی نہیں وہاں انتظار میں بیٹھی سبھی خواتین کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں کیونکہ سکن کلر کی مختصر سی ٹائٹس جو گھٹنوں سے ذرا برابر نیچے تھی اور ان کی پنڈلیاں بالکل تنگی تھیں۔ خدا کی قسم میرا جی چاہا اور کچھ نہیں تو کم از کم منہ سے ہی کچھ کہہ دوں۔ لیکن دستور زبان بندی بہت جگہوں پر کچھ بولنے نہیں دیتا۔ کیا ہمارے علمائے دین کوئی فتویٰ صادر نہیں کر سکتے۔ کیا اس بڑھتی ہوئی عریانی اور بے حیائی پر کوئی بندش نہیں لگائی جاسکتی، یقین جانیں اتنی بے حیائی میں نے کہیں اور نہیں دیکھی اور باہر کے ملکوں میں رہنے

جاتا۔ گھر گھر جھنڈے نہیں ہوتے تھے۔ آج کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں پاکستان کا صرف چاند ستارے والا خوبصورت پرچم ملتا ہی نہیں۔ جہان کی خرافات ہیں کہ کہیں جھنڈے پر کوئی کارٹون بنا ہے اور کہیں کوئی اور..... اپنے عظیم پرچم کو اس بے حرمتی سے بچالیں اور پھر ستم برائے ستم یہ ہے کہ پرچم لہرا تو دیا جاتا ہے۔ اسے اتارنا کسی کو یاد نہیں ہوتا۔ گھروں پر لہرانے والا یہ عظیم پرچم ہوا کے تھیرنوں اور سرد گرم دھوپ کی تپش سے بے رنگ ہو کر اور بعض اوقات پھٹ کر مجھے خون کے آنسو زلاتا ہے۔ کوئی تو انہیں آداب پرچم آزادی سکھا دے۔

حضرت معاویہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔ امت مسلمہ شریعت پر اُس وقت تک ثابت قدم رہے گی جب تک تین چیزیں غالب نہ آجائیں۔ 1۔ علم اٹھالیا جائے۔ 2۔ ناجائز بچوں کی پیدائش کثرت سے ہونے لگے۔ 3۔ صقاروں کا غلبہ جائے۔ لوگوں نے پوچھا ”یا رسول اللہ ﷺ یہ صقاروں کیا ہے اس سے کیا مراد ہے؟“ نبی کریم نے فرمایا ”وہ لوگ جو آخری زمانے میں ہوں گے اور اُن کی باہمی ملاقات سلام کی بجائے ایک دوسرے کو لعنت ملامت کر کے ہوگی۔“

اس حدیث کی روشنی میں آج ہم اپنا جائزہ لیں کہ کہیں ہم ہی تو اس زمرہ میں نہیں آجاتے۔ فون کی گھنٹی بجتی ہے تو ہم اٹھا کر کہتے ہیں کہ ”ہیل او“ اس کا مطلب خود ہی اپنے ذہن میں تلاش کر لیجئے۔ السلام علیکم کا مطلب بھی ذہن میں لے آئیں۔ ہم ایک دوسرے سے ملتے ہیں دُور سے ہاتھ ہلاتے ہیں اور ہائے کر دیتے ہیں۔ کیا ہائے درد اور افسوس کی گہرائیوں سے سجا ہوا لفظ نہیں ہے۔ ہم سنتے ہیں دھماکا ہو گیا اور منہ سے نکلتا ہے ”ہائے میرے اللہ یہ کیا ہوا جبکہ یہاں انا اللہ وانا الیہ راجعون کہنا چاہئے۔“

باعزت ہوتا ہے۔

ایک اور واقعہ یاد آیا۔ ہم کسی قرآن خوانی میں بیٹھے تھے۔ خاتون خانہ جن کی شوہر کی وفات ہوئی تھی میرے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک جواں سالہ بچی اچھی خوبصورت سی اُن سے ملنے کے لیے آگے بڑھی۔ یقین جانیں میرے بدن کے تو روکنے کھڑے ہو گئے۔ سیلوئس شرٹ اور ٹائٹس کچھ سکن کمر اور پھر آدمی پنڈلیوں تک باقی آپ خود سوچ لیں۔ کچھ موقعہ مل بھی ہوتا ہے یا نہیں وہاں بھی ہم چند مجبور عورتوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر سر جھکائے حالانکہ میں جانتی ہوں کہ سمجھ بوجھ کا یہ سب سے کم تر طریقہ ہے کہ بُرائی کو دیکھو اور آنکھیں بند کرلو۔ اللہ کا شکر ادا کرتی رہی ہوں کہ اب بھی ہماری بہت سی بچیاں اپنے ملک اور اپنے مذہب کی روایات سے ہم آہنگ ہیں۔

یہ دیکھیں یہ بچے کچھ لکھتے رہتے ہیں ادھر قلم کاغذ سنبھالو ادھر اُن کی کوئی فرمائش آ جاتی ہے۔ ”نانو نانو“ پلیز میری بات سنیں۔ تنہا مہد چراغ ہاتھ میں پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سات سالہ یہ بچہ اکثر کوئی نہ کوئی سوال داغ کر میرا امتحان لیتا رہتا ہے۔ ”ذرا جلدی سے مجھے یہ بتادیں کیا پاکستان بیڑی سے چلتا ہے؟“ میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا تو اس نے انگلی ٹی وی کی طرف اٹھا دی ”اگلے ویس روز کہتے ہیں“ اب چلے گا پاکستان اور ساتھ وولٹا بیڑی دکھاتے ہیں کیا پاکستان کوئی پو پی ایس ہے نانو“ اور میں اس وقت سے سر پکڑ کر بیٹھی ہوں کہ ہم اپنی ایجادات کو متعارف کروانے کے لیے کتنے بے شکے نعرے بتا لیتے ہیں۔ اگر ایک معصوم ذہن کے اندر یہ سوال ابھرا ہے تو ہم بڑے کیوں نہیں سوچتے کہ پاکستان کے نام کے ساتھ اپنی بے شکے اشیاء کے لیے کیل چسپاں نہ کریں۔

### انوکھی شرط

بین کے شہری نے بیٹی کی شادی کیلئے اپنے ہونے والے داماد سے ایک منفرد شرط رکھتے ہوئے فیس بک پوسٹ پر 10 لاکھ لائیکس کروانے کا مطالبہ کیا ہے۔ بین کے شہر تھر میں سلیم لیاش نامی شخص نے اپنی بیٹی کے لیے انوکھا حق مہر مقرر کیا ہے۔ اس نے اسامہ نامی اپنے ہونے والے داماد سے فیس بک پر کی گئی پوسٹ پر 10 لاکھ افراد سے لائیکس کرانے کی شرط رکھی ہے۔ سلیم کا کہنا ہے کہ اگر اسامہ ایک ماہ میں 10 لاکھ لائیکس کرانے میں کامیاب ہو گیا تو میں اپنی بیٹی کی شادی اس سے کروں گا اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو پھر میں اس کے لائیکس کو دیکھ کر مزید وقت دینے یا اس رشتے کو ختم کرنے کا فیصلہ کروں گا۔ یعنی شہری سلیم لیاش خود بھی سوشل میڈیا پر متحرک ہے لہذا اس کا کہنا ہے کہ وہ اس طرح اپنے ہونے والے دلدلی کا کرکڑی دیکھ سکے گا۔ (مرسلہ: عابد رحیم۔ کراچی)

### جانے کا زیادہ استعمال

#### ہڈیوں کے لیے نقصان دہ

حالیہ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ چائے کا زیادہ استعمال انسانی جسم کی ہڈیوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ امریکی محققین نے ایک تحقیق میں کہا ہے کہ چائے میں موجود فلورین کی زیادہ مقدار ہڈیوں اور دانتوں کو کمزور کرتی ہے اور زیادہ چائے پینے والے افراد ہڈیوں کی کمزوری کا شکار ہو سکتے ہیں۔ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ چائے میں پانی کی نسبت ستر فیصد زیادہ فلورین موجود ہوتا ہے جو انسانی صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔

(مرسلہ: خالد عمران۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ)

والی ہماری بچیاں تو بہت ہی محتاط ہیں۔ اُن کا لباس چاہے ٹراڈز راور ٹی شرٹ ہی ہو۔ ڈھیلا ڈھالا اور



## سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور ایمان افروز فخریہ پیشکش

# صحابہ کرام

قیمت 175 روپے  
۴۰ درخشندہ ستاروں کے  
روح پرور اور بصیرت افروز  
تذکروں پر مشتمل —

- جنہوں نے اپنی آنکھوں سے جلوۂ یار کا بے نقاب مشاہدہ کر کے شرف صحابیت پایا
- جنہوں نے منع رشد و ہدایت ﷺ سے براہ راست کسب فیض کیا۔
- جنہوں نے صاحب قرآن ﷺ سے قرآن کے رموز و اسرار سمجھے۔
- جنہوں نے اپنے خون جگر سے چینستان اسلام کی آبیاری کی۔
- جنہوں نے اپنے ارفع سیرت و کردار سے چہرۂ انسانیت کی سیاحیاں دسموڈائیں۔
- جنہوں نے انتھاک مخلصانہ جدوجہد سے جنت نظیر معاشرہ کی صورت گرمی کی۔
- جنہوں نے فیصلہ کن اور غیر مصالحانہ نکرے کر باطل کو تہہ و بالا کر دیا۔

۵۰۰ صفحات پر مشتمل سفید کاغذ، عمدہ کتابت اور دیدہ زیب سرورق

## شائع ہو گیا ہے



پھر ذرا اس وقت کا تصور کریں جب ستائیسویں رمضان کی شب جو لیلۃ القدر ہے۔ ہمارا ملک آزاد ہوتا ہے، لوگ کن کن مراحل سے گزرتے ہوئے یہاں آتے ہیں۔ ہم آج بھی حلیت جنگ میں ہیں۔ ہمیں سب کچھ کرنا ہے لیکن حدود میں رہ کر، اسراف سے منع کرنے والے سردارِ دو عالم کا حکم مان کر اور یہ سوچ کر کہ ہمیں ابھی بہت دور جانا ہے۔ اس ملک کی ترقی کے لیے۔ اس کو دنیا میں اونچے مقام دلانے کے لیے۔

میں تو پاگل ہوں، مصلحتی چلی جاؤں گی۔ اس دعا کے ساتھ اجازت چاہتی ہوں کہ مادرِ وطن سدا سلامت رہے۔ ہماری آنے والی نسلوں کے لیے اتنی شان و شوکت کے ساتھ کہ ہم ہر جگہ ہر گھڑی سر اٹھا کے چلیں، ہمیں اپنے پاکستانی ہونے پر فخر ہو، امریکہ کے کسی ایئر پورٹ پر ہم جیسے بڑی عمر کے لوگوں کو جس بے جا میں دودھ کھنے اس لیے نہ رکھا جائے کہ یہ پاکستان سے آئے ہیں اور بے جواز تلاشی لے لے کر ہراساں نہ کیا جائے۔ میں رہوں نہ رہوں۔ میرا وطن میری ارض پاک سلامت رہے۔ اللہ کے کرم سے پوری آن بان اور شان کے ساتھ اللہ سب کا نگہبان ہو۔ اپنی آنے والی نسلوں کو ایک ایسا پاکستان منتقل کریں جس میں کوئی گند نہ ہو۔ کوئی برائی نہ ہو۔ رشوت اور سفارش نہ ہو۔ ملاوٹ اور چور بازاری نہ ہو۔ جھوٹ اور غیبت نہ ہو۔ وہی پاکستان جس کا خواب علامہ اقبالؒ نے دیکھا اور ایک کمزور بیمار مگر مضبوط اعصاب والے قائدِ عظم محمد علی جناحؒ نے روز و شب محنت کر کے جس کو ہمارے لیے حاصل کیا اور خود چلے گئے۔ وہ ایسا ملک دیکھنے کے خواہاں نہیں تھے اللہ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں رکھے اور ان کے مراتب بلند ہوتے رہیں۔ (آمین)

ایک نعرہ ہے صاف ہوگا پاکستان پاک ہوگا پاکستان۔ خدا کے بندو پاکستان تو ہے پاک و صاف۔ اپنے من اُجٹے کرو، اپنی نیوٹوں کو پاک و صاف کرو۔ جن میں بے ایمانی، رشوت، سفارش، حرام خوری، ہر برائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، اُجلا پن ہمارے من کو چاہئے۔ پاکستان تو کلمہ لا الہ الا اللہ کے نعروں کے درمیان وجود میں آیا تھا۔ اس کی بنیادوں میں تو معصوم اور پاکیزہ لوگوں کا خون، جذبہ اور ہڈیاں ڈالی گئی تھیں۔ اس کی ہجرت تو مکہ سے مدینہ جانے والی عظیم ہجرت کی دوسری مثال تھی۔ جو اسلام کے نام پر وجود میں آئی۔ اسے کسی صابن سے گورا ہونے کی ضرورت نہیں ہے اگر گورا ہوتا ہے تو ہمارے گندے وجود کو اُجلا اور گورا ہوتا ہے۔ ہمارے اُن احساسات کو اُجٹنے پن کی ضرورت ہے جو گندی چیلوں کی طرح نہر کنارے پھینچنے جانے والے چھپھڑوں پر امنڈ امنڈ کر آجاتی ہیں۔ ملک کو نہیں ہمیں وولٹا بیٹری کی ضرورت ہے تاکہ اپنے نفس کو بہتری اور انسانیت کے جھٹکے لگا سکیں۔ اس ملک کو رب العزت نے ہر طرح سے مالا مال کر رکھا ہے۔ آئیں ہم اپنے اذہان کو نیک نیتی کی طرف لانے کا وعدہ کر کے اس ملک کی فلاح و بہبود کے لیے تن من و دھن سے کوشش شروع کر دیں تاکہ کوئی بچہ وہ سوال نہ کرے جس نے میرے روٹھے کھڑے کر دیئے ہیں۔ اور میں سوچے جارہی ہوں کہ ہم اپنی نئی نسل کو کیا دیتے جا رہے ہیں۔

دعا کیا ہے؟ ایک عبادت، ہم نئی ادھوری دعائیں کرتے ہیں، آج کل ٹی وی پر ایک دعا کی جاتی رہی۔ ”دعا ہے اس رمضان سلامت رہے پاکستان“۔ یہی دعا گریوں ہوتی تو مکمل ہو سکتی تھی۔

دعا ہے اس رمضان ہمیشہ سلامت رہے پاکستان

## نیم شب.....!!

ایس۔ امتیاز احمد کراچی

(سمندر پار سے)

ٹائمز اخبار، جس نے پہلی واردات کی خبر آخری صفحے پر دی تھی اس نے دوسرے قتل کی خبر سرخی کے ساتھ پہلے صفحے پر شائع کی۔ ”گلا کاٹنے والے قاتل کی واپسی“ یہ سرخی ٹریکر کے لیے بہت اہم ثابت ہوئی کیونکہ ٹی وی کے لیے بہر حال یہ ایک سرکاری حوالہ تھا۔ قاتل کی خراب وقت کی اہم ترین خبر بن گئی تھی۔

**ایک فوٹو گرافر کی کہانی جو رات کے اندھیرے میں قتل کے مناظر قلمباز تھا.....!**

اُسے شہر میں ہر طرح کی مصروفیت برقرار رکھنے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ ایک ماہر کیمرہ مین تھا۔ اُسے توقع تھی کہ ایک دن اس کی کہانی نہ صرف اُسے شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دے گی بلکہ اس کے

ٹریکر خون آشام چکا دوڑ کی مانند ہو گیا تھا۔ اُس نے واقعتاً خون نہیں پیا تھا بلکہ اُس بھیا تک منظر کی فلم بندی کی تھی۔ سورج غروب ہوتے ہی وہ مُردہ جسموں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ پولیس نے



قلم کا زیاں ہوتا تھا لیکن وہ اس حادثے کے مقام سے ایک میل دور تھا۔ اس لیے وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔ ”کیا مصیبت ہے!“۔

وہ پہلی پٹرول کار سے پہلے اس مقام پر پہنچ گیا تھا۔ اب وہ خوش دلی سے سیٹی بجاتا ہوا ہالی وڈ کی طرف جارہا تھا۔ جب اس نے چینل کے سامنے گاڑی روکی تو مارے جوش کے اس کی بُری حالت تھی۔ اس نے اپنی پک اپ کی کھڑکی سے منہ باہر نکالا اور گاڑی کی طرف دیکھ کر زندہ دلی سے چیخ پڑا لیکن گاڑی کو شاید اس کے انداز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ اس کی طرف سخت نگاہ سے گھورتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی ہلکی سی جھلک بھی نمودار نہیں ہوئی تھی حالانکہ وہ اس سے پہلے بارہا مل چکے تھے اور اس طریق کار سے بھی وہ کئی بار گزر چکے تھے۔

”تمہیں کیا کام ہے؟“ گاڑی نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

”نیوز روم کے لیے فلم لایا ہوں“ ٹریکر ہمیشہ یہی جواب دیتا تھا۔

”کس سے ملنا چاہتے ہو؟ مجھے اپنے رجسٹر میں نام درج کرنا پڑتا ہے۔“

”وائٹ گوسٹ۔ انچارج نیوز ایڈیٹر۔“

”وہ چھ بجے سے پہلے کسی سے نہیں ملتا۔“

”بہر حال میں اس سے ابھی اور اسی وقت ملنا چاہتا ہوں۔“ ٹریکر نے کہا۔

زیادہ باز پرس کیے بغیر گاڑی نے بڑی سردمہری کے ساتھ اُسے اگٹوٹھے سے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اس نے گاڑی بڑھائی اور سیدھا نیوز بلڈنگ کے اس حصے میں پہنچ گیا جہاں پارکنگ ممنوع تھی۔ اس نے بڑی کابلی سے اسٹیئرنگ کے نیچے دبا ہوا سیٹ نکالا اور گوسٹ سے ملاقات کے لیے دروازے کی طرف بڑھا۔

ذریعے وہ خوش حال اور دولت مند آدمی بھی بن جائے گا۔

اس کی کہانی کا آغاز نصف شب کے بعد سے صبح چھ بجے تک ہوتا ضروری تھا۔ اس وقت تمام ٹی وی سٹیشنوں کے نیوز روم بند ہو جاتے تھے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو ٹی وی والوں کو اس کی کیا ضرورت تھی۔ ظاہر ہے وہ ایسے ہی مناظر خود بھی فلم بند کر سکتے تھے۔ وہ ہر رات اُلگھیاں اُلگھا کر دُعا کرتا کہ ٹی وی سٹیشن سے متعلق ہر آدمی خوابِ خرگوش میں کھو جائے تاکہ وہ جو کچھ منظر عام پر لانا چاہتا ہے اس کی بھٹک بھی کسی کے کان میں نہ پڑ سکے۔ وہ اس کام میں مسلسل جدوجہد کر رہا تھا اور اب اُسے اپنے کام کے تمام نشیب و فراز کا علم ہو گیا تھا۔

ٹریکر اپنی یادداشت پر ہنستا اور خوفناک مناظر اس کے دماغ میں قفس کرتے رہتے تھے۔ ابھی یہ کل ہی کی بات تھی کہ وہ اپنی چادر کے نیچے دبکا چیخ رہا تھا۔ رول کرو..... رول کرو، کیمبرہ سے متعلق افراد اس منظر پر ہر وقت نہیں پہنچتے تھے ایک حادثے کا منظر تھا اور اسے دوبارہ حقیقی انداز میں سامنے لانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

اس قسم کے حادثات کی اس کے ذہن میں کمی نہیں تھی۔ وہ بچپن میں بہت سے مناظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک مکمل کہانی تھی۔ یہ کہانی ہر لحاظ سے اس کی اپنی تھی اور اس سے وہ منافع کمانے کی فکر میں تھا۔ وہ پوری قوت سے قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ اس کام میں مہارت کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔

وہ بے غم رات گزرنے کے بعد گھر جا رہا تھا کہ پولیس ریڈیو سے اُسے ایک لاش کے متعلق معلوم ہوا۔ لاشوں کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں تھی کیونکہ ان کی فلم بندی میں صرف چند فٹ





لنہیں لکھیں دھڑکی اور دھڑکی سے رکھیں

مرحبا عرق گلاب کا شمار ان

مصنوعات میں ہوتا ہے جس نے

مرحبا لیبارٹریز کا نام ہر

گھر میں پہنچا دیا ہے۔

# عرقِ گلاب

مرحبا کا عرق گلاب اپنی کواٹھی خوشبو اور اثر انگیزی کی وجہ سے دیگر تمام کمپنیوں کے عرق گلاب پر سبقت لے گیا ہے۔ ہر طرح کے مصنوعی اسنس سے پاک ہے جس کی وجہ سے اس کی خوشبو آخریک برقرار رہتی ہے۔ مفرح اور مقوی دماغ آشوب چشم اور کان کے درد کو فائدہ بخشا ہے۔ خفقان، غشی اور ضعف قلب کو دور کرتا ہے۔ معدہ جگر اور امعاء کو قوت دیتا ہے۔ قیض رفع کرتا ہے۔ پسینہ کی کثرت کو روکتا ہے اور اس کی بدبو کو زائل کرتا ہے۔ جلد کی حفاظت کرتا اور بے مثال موچر انزور اور میک اپ ریموور ہے۔ جلد کی بیماریاں جیسے Erythroderma, Atopic Psoriasis اور Eczema میں بے حد مفید ہے۔ مرحبا عرق گلاب کھانے پینے کی اشیاء کو خوشبو دار اور خوشگوار بنانے کے لئے بکثرت استعمال ہوتا ہے۔

## مرحبا عرق گلاب کی دستان میں جو گلاب استعمال کرتے ہیں ان کے اثر پڑا ہوا اور ادویاتی استعمالات حسب ذیل ہیں

ادویاتی استعمالات: (Pharmacological Actions)	اثر پڑا ہوا اجزاء: (Active Constituents)	اجزاء (Ingredients)
مقوی اعشائے رگیدہ اور مقوی بدن ہے۔ معدے اور امعاء کو قوت دیتا ہے۔ دست لاتا ہے اور قیض کشا ہے۔ صفراء کی حدت کو ساکن کرتا ہے۔ بدن کے سینے کو خوشبو دار بناتا ہے اور اس کی کثرت کو روکتا ہے۔ دردوں کو تسکین دیتا اور زخموں کو خشک کرتا ہے۔	جیرینیول، سٹرونیول، رہوڈینیول، نیرول، لیناؤل، ایونینیول، سیرا آئین، کورنیسٹران، کورنیسٹاک، ایسڈ، مبلک ایسڈ، کیروٹین	سرخ گلاب Rosa damacena

### خوراک و طریقہ استعمال

شراب اور نوذائیدہ بچوں کے لیے: آدھا سے ایک (2.5 سے 5 ملی لیٹر) چائے کا چمچان میں استعمل  
بچوں کے لیے: دو چائے کے کف (10 ملی لیٹر) دن میں دو سے تین بار  
بڑوں کے لیے: دو سے تین چائے کے کف (10 سے 15 ملی لیٹر) دن میں دو سے تین بار  
برائے تھم: تین سے چار قطرے دن میں دو سے تین بار  
کھانوں میں: حسب ذائقہ  
ممنوعہ علامات: (Contra indications) مرحبا عرق گلاب کوئی ممنوعہ علامت نہیں رکھتا  
احتیاطیں: (Precautions)  
علامات برقرار رہنے کی صورت میں: مارجت سے رجوع کریں۔  
تھکات: شاذ و نادر Loose motions کا باعث بنتا ہے۔  
دہیات: (Instructions) بخندنی اور خشک تھک پر چھس۔ دھیتے پھاس اور بچوں کی کھانے سے دور رکھیں۔  
نوٹ: مرحبا عرقات میں بعض اوقات لطیف اجزاء ملنے کی خاطر میں تھک ہو جاتی ہیں لیکن ان میں ایذا نہیں پہنچا سکتا بلکہ استعمال کریں  
پیکنگ: مرحبا عرق گلاب مندرجہ ذیل کنٹینر میں پیکنگ میں دستیاب ہے۔  
(i) 25 ملی لیٹر زرارہ (ii) 50 ملی لیٹر زرارہ (iii) 120 ملی لیٹر زرارہ (iv) 120 ملی لیٹر زرارہ (v) 240 ملی لیٹر زرارہ (vi) 750 ملی لیٹر زرارہ



پر کھل کر ہنستے تھے جیسے صرف اسی طرح اس کی خوشنودی حاصل ہو سکتی تھی۔ نہ معلوم کب ان کا مستقبل ٹریڈر کی فلم سے وابستہ ہو جائے۔

ٹریڈر ز پر لب بڑبڑایا..... اور اُس یونین کو کوٹنے لگا جس کی وجہ سے ٹی۔ وی کے محکمے میں اس قدر انقلاب آ گیا تھا۔ آج کل تو وہ بہ مشکل پیٹ بھرنے کی حد تک کما رہا تھا۔ بیوی کی ضرورتوں کو پورا کرنا تو محض خیال ہو کر رہ گیا تھا۔ اسی لیے وہ بالکل تنہا تھا کوئی اسے ایک عام آدمی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا جس کا نام ٹریڈر تھا۔ نیوز روم میں اُسے برداشت کرنے کی صرف ایک وجہ تھی اور یہ کہ ٹریڈر رات کے ان لمحات میں حادثات کی فلم بندی کرتا تھا جب ساری کائنات بیٹھی نیند کھوتی ہوتی ہے۔

وہ اس زندگی سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح ماضی واپس آجائے۔ وہ اپنی کھوئی ہوئی زندگی کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی زندگی روشنی کے ہنگاموں سے ہمکنار ہو جائے۔

گوسٹ نے فون بند کیا اور ٹریڈر کی طرف متوجہ ہوا۔ مجھے آج دن بھر کے لیے جن فلموں کی ضرورت تھی انہیں پہلے سے خرید چکا ہوں۔

ٹریڈر نے ایک نگاہ گلاس کی طرف ڈالی جہاں نصف درجن خبروں کے نشانات موجود تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس تعداد سے دو گنا زیادہ خبریں بھی آجائیں تو صرف ایک گھنٹے کا پروگرام مکمل ہو سکتا ہے۔ اس وقت میں جو کچھ لے کر آیا ہوں تمہیں اس کی ضرورت محسوس ہوگی۔ اُس نے کہا۔

”تمام لوگ یہی کہتے ہیں، پھر بھی بتاؤ کیا خاص بات ہے؟“

”یہ ایک قتل کی واردات ہے۔“ ٹریڈر نے کہا۔ گوسٹ کی آنکھیں سنبھل گئیں لیکن اُس نے

انچارج نیوز ایڈیٹر اُسے ایک نو عمر لڑکا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی عمر پچیس سے کسی طرح زیادہ نہیں تھی۔ جیسے ہی اُس نے ٹریڈر کو دیکھا وہ اپنے سامنے رکھے ہوئے ایک ٹیلی فون پر کسی سے گفتگو میں مصروف ہو گیا۔ وہ ٹریڈر جیسے آدمی کو انتظار کی زحمت دیکر بہت خوش ہوتا تھا۔ اس لیے یہ بات اس کی عادت میں شامل ہو گئی تھی۔

ٹریڈر نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لگایا اور دھوئیں کا بادل سا اُڑا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ نیوز ایڈیٹر تقریباً سبھی ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں۔ جب سے ٹریڈر نے فلم بندی کا کام شروع کیا تھا۔ اس نے ان طویل برسوں میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں دیکھی تھی۔ وہ ہر فلم خریدنے کو ایک ایسا مسئلہ بنادیتے تھے کہ ٹریڈر کو کسی خطرناک جنگ کا گمان ہوتا تھا۔

”جلدی کرو.....“ ٹریڈر غرایا ”میرے پاس ایک اہم فلم ہے۔“

گوسٹ نے اشارہ کیا اور پھر ٹریڈر کی طرف پشت کر کے فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ٹریڈر تھلا کر رہ گیا۔ پرانے وقتوں میں ایسا نہیں ہوتا تھا اس جیسے آزاد رہ کر کام کرنے والوں کی بہت مانگ تھی۔ ان دنوں رات کے وقت حادثات کی فلم بندی کرنے والوں کی کمی تھی اس لیے ٹریڈر کو کبھی نظر انداز نہیں کیا گیا تھا۔ اب اس کے پاس ذاتی عملہ تھا جن میں ساؤنڈ مین سے لیکر باقی ضروری آدمیوں تک سب ہی موجود تھے۔

پہلے تو لوگوں نے کبھی ٹی وی نیوز کے متعلق سنا بھی نہیں تھا۔ سولہ ٹی میٹر کیمیرے کی کارکردگی کے بارے میں بہت کم لوگوں کو معلوم تھا۔ ان دنوں ٹریڈر کی مانگ تھی۔ رپورٹر اسے نام کے پہلے حصے سے پکارتے تھے۔ اس کے لیے دوپہر کا کھانا خرید کر لانا اُن کے معمول میں شامل تھا۔ وہ اس کی ہر بات

ہے تو عموماً وہ فلم خرید لی جاتی ہے ورنہ اس قدر درد  
سرمول لینے سے کیا فائدہ؟  
”ادا نیگی کیا ہوگی.....؟“ ٹریکر نے سوال کیا۔  
”اگر ہم نے اسے قابل استعمال سمجھا تو حسب  
معمول پچھتر ڈالر کی ادا نیگی ممکن ہے۔“  
”یہ ایک اہم فلم ہے۔ اس کی قیمت بھی زیادہ  
ہونی چاہئے۔“

”رات بھر کے کام کا معاوضہ اس سے زیادہ کیا  
ہو سکتا ہے میرا خیال ہے میں نے پہلے ہی زیادہ پیش  
کش کر دی ہے.....“ ایڈیٹر نے رکھائی سے کہا۔  
”گویا اگر میں ایک ہفتے میں ایسی فلم حاصل  
کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو میری ضرورتوں کے  
لیے کافی ہوگی۔“ ٹریکر نے تلخ لہجے میں کہا۔

گوسٹ نے لاپرواہی سے کندھے جھٹک  
دیئے۔ قتل کی وارداتوں کا صاف مطلب ہے ڈھیر  
سارا خون۔ رات کے کھانے پر دکھائے جانے  
والے پروگرام میں ہمیں بہت محتاط رہنا پڑتا ہے، ہم  
نہیں چاہتے کہ کوئی ایسا منظر دیکھ کر ہمارا پروگرام  
دیکھنے والے اپنی بھوک ہی کھو بیٹھیں۔“

”میں اپنے کام میں محتاط ہوں“ ٹریکر نے کہا۔  
”میں نے ان زاویوں سے فلم بندی کی ہے کہ ایسا  
نہیں ہوگا۔“

”ٹھیک ہے ہم ابھی دیکھ لیتے ہیں۔ گوسٹ  
نے ڈرامائی انداز میں اپنے ڈیک سٹیکر پر ہاتھ  
مارا تاکہ ٹریکر بھی صورتحال سے آگاہ رہے۔ ایڈیٹر کا  
یہ دوسرا حربہ تھا۔ جس سے وہ ٹریکر جیسے کیرہ مینوں  
پر قابو پالیتا تھا۔ بعض اوقات پولیس والے اس  
واردات کی کہانی کو انتہائی بیزار کن بنا دیتے تھے اس  
لیے فلم کا تاثر بھی کم ہو جاتا تھا۔

لیکن اس بار جاسوس غیر متوقع طور پر باتونی  
ثابت ہوا۔ ”یہ ٹریکر تو خون آشام ہے۔ اس نے

قبولیت کی چمک ظاہر نہیں ہونے دی!  
”گلا ایک کان سے دوسرے کان تک کاٹ دیا  
گیا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری خوفناک باتیں بھی  
موجود ہیں۔“ ٹریکر نے کہا۔  
گوسٹ نے ایک دراز جھٹکے سے کھولی اور فلم  
خریدنے کا فارم نکالا، ٹریکر کا نام پُر کرنے کے بعد  
اُس نے دریافت کیا۔

”اس کے علاوہ تم نے کیا کچھ معلوم کیا ہے؟“  
”شکار ایک ساٹھ سال کا بوڑھا آدمی تھا۔ مین  
اسٹریٹ پر واقع ایک کیفے کی عقبی گلی میں اس کی  
لاش دریافت کی گئی ہے۔“  
”مین سٹریٹ“ گوسٹ نے مداخلت کی۔  
”آخر وہ کون تھا؟ کیا کوئی بد معاش؟“  
”شرابی.....!“ ٹریکر نے کہا۔

ایڈیٹر زریب بڑبڑایا ”اس دور میں ایک یا دو  
پگ شراب پینا عام بات ہے۔ اس میں انسانی  
زندگی کی دلچسپی کی کیا بات ہے؟“  
”میں وہ واحد آدمی ہوں جس کے پاس لاش کی  
فلم موجود ہے۔“

گوسٹ نے غیر دلچسپی کا اظہار کرنے کے لیے  
انکار میں گردن ہلائی۔ ”کیا تمہیں یقین ہے کہ ایسا  
ہی ہوا ہے۔“

”حادثے کے بعد میں واحد کیرہ مین تھا جو اس  
جگہ موجود تھا۔ میرا کام ختم ہوا تو پولیس نے لاش اٹھوا  
دی تھی۔ اس وقت کارو منز لاش پر کام کر رہا  
ہے۔ میرا خیال ہے اس طرح کسی اور فلم کا ہر امکان  
از خود ختم ہو جاتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ ہم تمہاری فلم کو دیکھیں گے۔“  
ٹریکر نے اثبات میں سر ہلادیا وہ جانتا تھا کہ  
آدمی جگ ختم ہو گئی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ جب فلم کو  
تکنیکی مراحل سے گزارنے کے لیے منظور کر لیا جاتا



اچانک اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ چند لمحے سمندر کی جھاگ میں چہل قدمی کر کے لطف اندوز ہوں۔ اس وقت صرف ایک کیرہ مین وہاں اتفاق سے موجود تھا۔ اس نے فلم بندی کی اور بعد میں اس فلم کا اُسے ایک ہزار ڈالر معاوضہ ملا تھا۔

”وہ ایک اتفاق تھا“ گوٹ نے کہا۔ ”اب ایسا اتفاق دوبارہ کبھی پیش نہیں آسکتا۔ اب شیٹن بہت بڑے ہو گئے ہیں اور فلم کا عملہ بھی بہت بڑھ چکا ہے۔“

”نہیں۔“ ٹریکر نے احتجاج کیا۔ ”اب بھی میرے پیشے کے لوگ کوئی اہم کہانی منظر عام پر لاسکتے ہیں۔“ گوٹ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

ایک ہفتے بعد ایک اور لاش پائی گئی۔ اس لاش کا گلا بھی بری طرح کاٹ دیا گیا تھا اور اس منظر کی فلم بندی میں بھی ٹریکر سب پر سبقت لے گیا تھا۔ چینل نے اسے اس فلم کی ایک سو ڈالر ادائیگی کی تھی۔

ٹائمز اخبار، جس نے پہلی واردات کی خبر آخری صفحے پر دی تھی اس نے دوسرے قتل کی خبر سرخی کے ساتھ پہلے صفحے پر شائع کی۔ ”گلا کاٹنے والے قاتل کی واپسی“ یہ سرخی ٹریکر کے لیے بہت اہم ثابت ہوئی کیونکہ ٹی وی کے لیے بہر حال یہ ایک سرکاری حوالہ تھا۔ قاتل کی خبر اب وقت کی اہم ترین خبر بن گئی تھی۔

جب تیسری لاش دریافت ہوئی تو ٹریکر نے ایک ہم پیشہ کیرہ مین کو ساتھ ملایا۔ اس بار اگرچہ فلم زیادہ اہم نہیں تھی لیکن ایڈیٹر ڈیڑھ سو ڈالر دینے پر آمادہ ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ دوسرے چینل سودے بازی پر آمادہ ہیں۔

ٹریکر اب ایک اہم کیرہ مین بن چکا تھا۔ اس نے مقابلے کی کبھی پرواہ نہیں کی تھی۔ وہ اس پیشے

لاش کے معاملے میں ہم سے بھی اولیت حاصل کر لی۔ کیا ہم اس وقت پسپا ہو رہے ہیں؟“

”ہاں.....“ ایڈیٹر نے کہا۔

”غالباً ٹریکر بھی تمہارے پاس ہی موجود ہے؟“ ایڈیٹر کے حلق سے بے حد عجیب آواز نکلی جو غراہٹ سے مشابہ تھی۔

”اس سے کہو کہ فلم کا بغور مشاہدہ کرے۔ اس بار ایک عجیب قاتل سے پالا پڑا ہے۔ اس نے لاش پر کچھ اس قدر کام دکھایا ہے کہ ہم تفصیلات کو زیادہ پھیلاتا نہیں چاہتے ورنہ تم جانتے ہی ہو کہ ہم لوگوں پر ان باتوں کا کیا اثر ہوتا ہے۔“ جاسوس کی آواز سنائی دی۔

”ہم اسے احتیاط سے پیش کریں گے“ گوٹ نے وعدہ کیا، کیا تم اس واردات کے بارے میں کوئی سرکاری بات بتا سکتے ہو؟“

”ابھی وقت نہیں آیا۔ فی الحال شناخت بھی عمل میں نہیں آئی۔ ہمارا خیال ہے کہ آگے قتل ایک ریزر تھا لیکن تمہیں کارو منز کی رپورٹ کا انتظار کرنا پڑے گا اس سے پہلے کوئی بات نشر نہ کرنا۔“

گوٹ نے سلسلہ منقطع کر دیا اور ٹریکر کی طرف متوجہ ہوا۔

”چونکہ ہم اس واردات کے بارے میں کوئی خیالی بات نہیں کہہ سکتے اس لیے فلم کی قیمت چمکھتر سے زیادہ ہونی چاہئے۔“ ٹریکر نے شکایت کی۔

”اب پرانے وقتوں جیسی بات نہیں ہے۔ کیا تمہیں کنیڈی کی وہ کہانی یاد ہے جس نے میڈی بیو میں جنم لیا تھا؟“

”وہ بات دوبارہ منظر عام پر نہیں آسکتی۔“ ٹریکر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ”یہ 2006ء کا واقعہ ہے، ممکن ہے 2007ء میں پیش آیا ہو۔ ان دنوں کنیڈی ساحل کے ساتھ ساتھ گاڑی چلا رہا تھا کہ

نا کام ہو سکتے۔“

کشادہ آنکھوں سے ایڈیٹر نے اُسے گھورا ”تم.....؟ نہیں ٹریکٹر..... اگر میرا ایک عملہ نا کام رہتا ہے تو میرے پاس ان کی مدد کے لیے دوسرے آدمیوں کی کمی نہیں ہے اور پھر تم یونین کے ساتھ وابستہ بھی نہیں ہو.....“

جب وہ نیوز روم سے باہر نکلا تو اس کا دماغ غصے سے ٹھول رہا تھا اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ٹی وی کے عملے کو ہر حال میں بچا دکھائے گا۔

وہ تھکا تھکا سا اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر سوچ کی گہری سلٹیں تھیں۔ اور وہ غور کر رہا تھا کہ رات شروع ہونے میں ابھی کتنی دیر باقی ہے۔ کئی بیزار کن گھنٹے گزارنے کے بعد کہیں کام کا وقت شروع ہوگا۔ ایسے میں گھر جانے سے کیا فائدہ؟ صورت حال اس حد تک بگڑ گئی تھی کہ پیشہ ور رپورٹروں کا کام تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ ٹریکر کوپوں محسوس ہوا جیسے اُس کے اندر کوئی چیز ریزہ ریزہ ہو گئی ہو۔

”میں بھی ان شرایوں کی طرح آوارہ گرد ہو گیا ہوں“ وہ زیر لب بڑبڑایا۔

”بہر حال اب مجھے کسی نئے انداز سے کام شروع کرنا پڑے گا“ اس نے شہر کی طرف اپنی گاڑی پوری رفتار سے اڑانی شروع کر دی۔

اگلے روز صبح چار بج کر تیس منٹ پر اس نے گوسٹ کے گھر فون کیا۔

”تمہیں میرے گھر کا نمبر کہاں سے ملا ہے؟“ ایڈیٹر غرایا۔

”اس بات کو چھوڑو“ ٹریکر نے کہا ”میں ایک فیصلہ چاہتا ہوں ابھی اور اسی وقت“۔

”کیا کوئی نئی واردات ہو گئی ہے؟“

”تم ایک دہرے قتل کی فلم کا کیا معاوضہ

کے ساتھ ایک طویل عرصے سے وابستہ تھا۔ اب اُسے یقین ہو رہا تھا کہ قتل کی اگلی واردات اس کے لیے جادوئی نمبر کی حامل ہوگی۔ ایک ایسا جادوئی عدد جو اس کے لیے خوش قسمتی کا مظہر ہوگا۔ ایک ایسی واردات جس کے ذریعے وہ بہت زیادہ کمائے گا۔ ممکن ہے اس واردات کی فلم کنیڈی کی کہانی سے بھی سبقت لے جائے۔ اس نے یہ بات دل کی گہرائیوں سے محسوس کی تھی۔

خلاف توقع صورت حال بگڑ گئی۔ ٹی وی شیٹیں نے پولیس سے ساز باز کر لی۔ ان کے درمیان ایک معاہدے نے جنم لیا۔ پولیس اس معاہدے کے مطابق براہ راست ٹی وی کے عملے کو ترجیح دے گی۔ ”بہر حال.....“ گوسٹ نے ٹریکر سے کہا ”دیوانے قاتل روزانہ ہی وارداتیں نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ تم آزادہ کیمبرہ مین ہمیں لوگوں کے تاثرات فراہم نہیں کر سکتے۔ اس حادثے کے دوران بعد میں تباہیوں کی آوازیں بھی فلم کے ساتھ موجود ہوں تو فلمی مناظر میں حقیقت کا عنصر بڑھ جاتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ ٹریکر تم نے سودے بازی کا جو بازار گرم کر رکھا تھا وہ اب ٹھنڈا ہو گیا ہے۔“

”تمہیں اپنے یہ الفاظ واپس لینے پڑیں گے“ ٹریکر نے دل میں سوچا اور پیشانی پر سلٹوں ڈال کر ایڈیٹر کو گھورنے لگا۔ اس بات سے بھی اُسے سکون حاصل نہ ہو سکا۔ وہ بچپن برس کا ایک پیشہ ور رپورٹر تھا اس عمر میں عموماً دوسرے لوگ ریٹائرڈ ہونے کا منصوبہ بناتے ہیں جبکہ وہ ایک دیوانے قاتل اور اس کے شکار کا متلاشی رہتا تھا۔

”مجھے مددگار رپورٹر بنانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ ٹریکر نے مودبانہ لہجے میں کہا۔ ”تم جانتے ہو کہ کبھی نہ کبھی تمہارا عملہ بھی

تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ اُس نے دروازہ کھولا تاکہ کار کی روشنی میں وقت دیکھ سکے۔ اس دوران وہ سگریٹ کے گہرے کش لگا رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر اسرار مسکراہٹ تھی۔

نیند کی کمی کے باعث اس کا سر چکر رہا تھا۔ اس نے سستی کی شراب بھی پی رکھی تھی جس کے اثرات اس کی کھوپڑی میں طوفان اٹھا رہے تھے۔

اُس نے گاڑی کا دروازہ مشغل کیا اور ففٹھ سٹریٹ برج کی طرف لڑکھڑاتا ہوا چل دیا۔ دونوں آوارہ گرد شرابی اس جگہ موجود تھے جہاں وہ انہیں چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ اس وقت بے ہوشی کے عالم میں تھے۔

ٹرکیر کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا اور ان دونوں پر کیمرو فوکس کرنے میں دشواری ہو رہی تھی۔

میں چاہتا ہوں کہ مجھے ہمیشہ یاد رکھا جائے۔ وہ زیر لب بڑبڑایا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے چہرے پر شہرت کی روشنی صاف محسوس کی۔ اس نے آنکھوں سے پسینہ صاف کیا تاکہ وہ کیمرو ٹھیک سے سیٹ کر سکے۔ اس لمحے ٹرکیر نے محسوس کیا کہ چینل کی تین نیوز ویکن آ رہی ہیں۔

اب اس کے پاس قطعاً وقت نہیں تھا۔ اس کا قبچہہ پل کے نیچے محدود جگہ میں گونج اٹھا۔ پولیس کو اصل قاتل کا سراغ لگاتے لگاتے ایک عرصہ گزر جائے گا وہ تمام چال بازیوں سے آگاہ تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اس کے ارادے کیا ہیں؟

چند لمحے وہ کھڑا موزوں ترین زاویے کا انتخاب کرتا رہا پھر اُس نے جیب سے ایک تیز دھار ریزر نکالا۔ وہ آگے بڑھا دونوں آوارہ گرد بے ہوشی کی وجہ سے مداخلت کے قابل نہیں تھے۔ اس کے سامنے چند ہی لمحوں کے بعد دو لاشیں تھیں جن کے گلے کٹے ہوئے تھے اور وہ فلم بندی میں مصروف تھا۔

دو مقتول جن کے گلے کٹے ہوئے ہیں؟“  
”تم جانتے ہو کہ میرا عملہ کام کر رہا ہے۔“  
”دہراٹل اور قاتل سے مخصوص انٹرویو؟“  
”ہیں۔۔۔ کیا کہا انٹرویو۔۔۔ کیا تمہیں یقین ہے؟“

”میں دو ہزار معاوضہ چاہتا ہوں“ ٹرکیر نے کہا  
”کنیڈی کی فلم کا دو گنا معاوضہ۔۔۔۔۔“  
گوسٹ کی طرف سے جواباً ایک غراہٹ سنائی دی۔

”میں اتنا بڑا فیصلہ ذاتی طور پر نہیں کر سکتا“  
گوسٹ نے کہا۔ ”مجھے انتظامیہ سے رابطہ قائم کرنا پڑے گا۔“

”میں صرف پانچ منٹ انتظار کر سکتا ہوں۔“  
”تمہارا نمبر کیا ہے؟“  
ٹرکیر نے پے فون کا نمبر دیکھا اور گوسٹ کو بتادیا۔

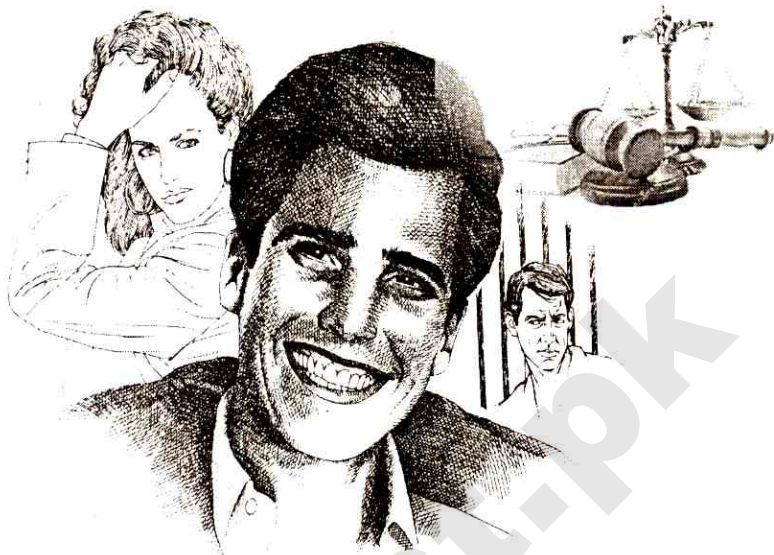
ٹھیک چار منٹ بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور گوسٹ کی آواز سنائی دی۔ ایک ہزار بہت بڑی قیمت ہے ہم اس سے زیادہ نہیں دے سکتے۔۔۔۔۔“  
”میں اس سے زیادہ کما سکتا ہوں۔“

ان کے درمیان سودے بازی شروع ہو گئی۔ بالآخر ایڈیٹر نے کہا ”بارہ سو سے زیادہ نہیں یہ انتہائی معاوضہ ہے۔“

ٹرکیر مسکرایا۔ بارہ سو کا معاوضہ اُسے وقت کا سب سے مہنگا رپورٹر بنا دے گا۔ وہ جانتا تھا کہ ٹی وی نے اس سے پہلے کبھی اتنی رقم ادا نہیں کی۔ اس نے گوسٹ کو ایڈریس دیا اور کہا تمہارا عملہ وہاں کتنی دیر میں پہنچ جائے گا؟“

”چند منٹ۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“  
”ٹھیک ہے۔“ مجھے منظور ہے۔“ ٹرکیر نے کہا  
اور سلسلہ منقطع کر دیا ٹیلی فون بوتھ سے باہر نکلا اور





یوسف جمال

## قانونی جرم

اُس کی سنجیدگی اور اطمینان دیکھ مسٹر چرڈن اور بھی خوف زدہ ہو گئے۔ ایسے لوگ عام مجرموں سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ مسٹر چرڈن نئے جبری کا تصور کرتے ہی بُری طرح گھبرا گئے۔ انہوں نے نہایت سعادت مندی سے چالیس ہزار پونڈ کی گڈیاں جانسن کے سامنے میز پر رکھ دیں۔

**ایک وکیل کی زندگی کا انقلابی واقعہ، اُس نے کامیابی کا راز جان لیا تھا**

کرتے۔ ان لوازم کی موجودگی میں اُس نے زبردست جدوجہد اور تنگ و دو سے وکالت کا امتحان پاس کیا تھا۔ اس لیے اسے ہونٹوں دکاؤں اور پرائیویٹ فرموں میں دن رات کام کرنا پڑا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ وکالت کی سند ملے ہی اُس کے تمام دلدہ رُڈور ہو جائیں گے اور اس کے دروازے

وہ ضرور ایک کامیاب وکیل ہوتا مگر کامیابی کے لیے کئی باتیں لازمی تھیں مثلاً اُس کا دفتر فیشن ایبل علاقوں کی کسی جدید ترین بلڈنگ میں ہوتا اور نیلی نیلی آنکھوں اور گلابی رخساروں والی کوئی نوجوان ساحرہ اُس کی سیکرٹری ہوتی۔ نیز پکچری کے احاطے میں اُس کے کم از کم دو اسٹنٹ ہوتے جو اس کے لیے کام

اور بزدل شخص کے متعلق معلومات جمع کرتا رہا۔ وہ شخص اونی کپڑے کے ایک کارخانے کا مالک تھا۔ اُس کے پاس بے حساب دولت تھی۔ اس کے علاوہ وہ ایک انتہائی حسین و جمیل بیوی کا شوہر تھا اور اُس سے بے حد خائف رہتا تھا۔ اُس کا ایک بیٹے بھی تھا جس کا نام جیری تھا۔ جیری سے اُسے بے حد محبت تھی کیونکہ وہی اس کی جائیداد کا واحد وارث تھا اور اُسی سے اُس کی نسل پروان چڑھتی تھی۔ اُس نے سوچا کہ رچرڈسن نے غریبوں کا خون چوس چوس کے جو دولت جمع کی ہے اُس سے صرف اُس کی اولاد ہی کیوں فائدہ اٹھائے؟ ویسے بھی جیری ابھی بچہ ہے، وہ نہ معلوم کب اس قابل ہو کہ اپنے باپ کی دولت کا مالک بنے۔ اس دوران میں اگر میں اپنا کچھ حق وصول کرلوں تو کیا حرج ہے؟

اُس نے دوبارہ اپنے منصوبے پر غور کیا اور چڑیا گھر کا ٹکٹ جیب میں ڈال کر کھڑکی سے ہٹا اور سیدھا جیری کے سکول جا پہنچا۔ اُسے سکول کے باہر وقفے کے وقت تک جیری کا انتظار کرنا پڑا اور جب تفریحی وقفے کی گھنٹی بجی تو اُس نے اپنی جیب تھپ تھپ کر مافیوں کے پیکٹ اور چڑیا گھر کے ٹکٹ کی موجودگی کا یقین کیا، پھر سکول کے احاطے میں داخل ہو گیا۔ جیری جلد ہی اُسے چند بچوں کے ساتھ کھیلتا ہوا نظر آ گیا۔ وہ ایک مسکراہٹ کے ساتھ اُس کی طرف بڑھا۔ جیری بھی شاید وقفے کے لمحات پوری خوش طبعی سے گزارتا تھا چنانچہ وہ بھی اُس کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔ اُس نے جیری کے پاس پہنچنے کے گھنٹوں کے بال بیٹھتے ہوئے کہا ”بیٹے تمہارا نام.....“

جیری نے ہنستے ہوئے جلدی سے کہا ”جیری ہے جناب۔“

”بڑا پیارا نام ہے تمہارا اور میرا نام جاسن ہے، بتاؤ کیسا ہے میرا نام؟“ یہ کہتے ہوئے اُس نے مافیوں کا

پر مقدمات کی لمبی قطار لگ جائے گی اور اُس کے قدموں میں دولت کے ڈھیر پڑے ہوں گے لیکن اُس کا دفتر شہر کے ایک پس ماندہ علاقے میں تھا اور اُس کے وسائل اُسے اس سے زیادہ اہتمام کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اس لیے اس کا سہانا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوا۔

ابتدائی تین مہینے تک وہ تجربہ حاصل کرنے کے لیے روزانہ عدالت جاتا رہا۔ اس مدت میں اُسے تجربے کی دولت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ یہ نکتہ اُسے بہت مدت بعد معلوم ہوا کہ کامیاب وکیل بننے کے لیے صرف علم اور تجربہ کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے کچھ اور طریقے بھی اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ ایک خوبصورت دفتر ایک حسین و جمیل سیکرٹری جس کا بدن سڈول ہو اور جس کے ہونٹوں پر ہر وقت ایک دل آویز مسکراہٹ تیرتی رہتی ہو، دو تیز و طرار اسٹنٹ ہوں جن کی چرب زبانی وکیل کی لیاقت سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔ اُس نے دیکھا تھا کہ ان خوبیوں نے محض نااہل وکلاء کی نااہلی پر پردہ ڈال دیا ہے اور احمقوں کی ایک کثیر تعداد اُن کی موکل بنی ہوئی ہے۔

اب اُس کے سامنے ایک ہی مسئلہ تھا اور اُس کے سر پر ایک ہی دھن سوار تھی۔ اُسے پیسہ چاہیے تھا تاکہ وہ اپنی وکالت چکانے کے لیے ضروری انتظامات کر سکے۔ وہ سوچتا کہ کیا اس کے لیے اُسے مزدوری کرنی ہوگی؟ یا دوبارہ کسی نجی تجارتی ادارے میں ملازم ہونا پڑے گا؟ ملازمت اور مزدوری کا خیال اُس کے ضمیر نے گوارا نہیں کیا۔ سوچتے سوچتے آخر اُس نے ایک فیصلہ کیا اور مسلسل غور و فکر کے بعد پیسے کے حصول کا ایک جامع منصوبہ بنایا۔ اُس نے اپنا منصوبہ ایک غیر جانب دار وکیل کی نظر سے ہر پہلو سے دیکھا۔ اُسے اس میں کوئی خامی نظر نہیں آئی۔ وہ چند روز تک شہر کے ایک امیر ترین فریہ اندام

خطرے میں ہے۔ اگر آپ اس کی زندگی بچانا چاہتے ہیں تو آپ کو چالیس ہزار پونڈ ادا کرنے ہوں گے۔ دوسری صورت میں اُس کی حفاظت اور سلامتی کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ رقم ادا کرنے کے لیے آپ کے پاس صرف دس منٹ کا وقت ہے۔ میں فوراً آرہا ہوں اگر آپ چاہیں تو اس سلسلے میں پولیس وغیرہ کی مدد شوق سے حاصل کر سکتے ہیں مگر میں آپ کو دس منٹ سے زیادہ وقت نہیں دوں گا اگر آپ نے رقم کا مطالبہ پورا کر دیا تو آپ کا ہونا رفرزند صحیح و سالم حالت میں حفاظت سے تین بجے تک آپ کو واپس کر دیا جائے گا بیٹے کی خاطر یہ رقم آپ جیسے دولت مند کے لیے کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ میں رقم لینے آرہا ہوں۔“

رچرڈ سن گھبرایا۔ سخت سردی کے باوجود اُس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ بیٹے کی زندگی یا چالیس ہزار پونڈ؟ اُس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ تین بجنے میں صرف آٹھ منٹ باقی تھے۔ تصور میں اُسے اپنے بیٹے کی لاش دکھائی دی۔ وہ چیخ اٹھا ”جبری جبری!“ مجھے ہر قیمت پر اپنا بیٹا واپس چاہئے ہے اور زندہ واپس چاہئے ہے“ اُس نے اُسی وقت اپنی خوبصورت سیکرٹری کو بلایا اور حکم دیا ”خزانچی سے کہو وہ چالیس ہزار پونڈ کے نوٹ ابھی اور اسی وقت مجھے پہنچا دے۔“

رچرڈ سن کی دہشت اور سراسیمگی دیکھ کر نوعر ہمت نہیں ہوئی۔ وہ خاموشی سے چلی گئی۔ تین بجنے میں صرف پانچ منٹ باقی رہ گئے تھے۔ مسٹر رچرڈ سن کا ہر ہر منٹ ایک ایک صدی کی طرح گزر رہا تھا۔ وہ شدید کرب سے دوچار تھے۔ انہوں نے سکول اور گھر ٹیلیفون کر کے جبری کے متعلق پوچھا۔ پتہ چلا کہ جبری کو معمول کے مطابق سکول سے ایک بجے تک آجانا چاہیے تھا لیکن وہ ابھی تک گھر نہیں پہنچا تھا۔ مسٹر رچرڈ سن نے ریسپورر لکھا ہی تھا کہ سیکرٹری نے ایک

پکٹ جبری کی طرف بڑھا دیا۔ جبری نے چند لمحوں کی ہچکچاہٹ کے بعد پکٹ لے لیا۔ جانسن نے تیز نشانے پر بیٹھتے دیکھ کر کہا ”میرا بیٹا بھی بالکل تمہاری عمر کا تھا بیٹے! وہ! موٹر کے حادثے میں ہلاک ہو گیا آہ۔ آج تمہیں دیکھ کر وہ اچانک یاد آگیا۔“

جانسن کی خود ساختہ کہانی سن کر جبری کا دل بھر آیا اور جانسن نے اُس کے چہرے سے یہ تاثرات فوراً بھانپ لیے۔ اس نے کہا ”بیٹے میرے پاس چڑیا گھر کا ایک فالتو ٹکٹ موجود ہے، چڑیا گھر تین بجے تک کھلا رہتا ہے۔ تم چاہو تو ٹکٹ لے لو اور چڑیا گھر چلے جاؤ۔“ چڑیا گھر کا نام سن کر جبری کا معصوم چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ اُس نے کہا ”لیکن سکول سے چھٹی کیسے ملے گی؟“

جانسن نے کہا ”یہ تم خود سوچو چھٹی حاصل کرنا تمہارا کام ہے ویسے تم چاہو تو چھٹی کے بغیر بھی جاسکتے ہو۔“ یہ تجویز جبری کو بہت پسند آئی۔ جانسن نے اُسے ٹکٹ دے دیا۔ جبری نے جلدی سے ٹکٹ لے کر اپنی جیب میں چھپا لیا۔ پھر جانسن نے اُس کی طرف ایک نوٹ بڑھاتے ہوئے کہا ”لو یہ رکھ لو“ خوب تفریح کرنا اور خوب اچھی اچھی چیزیں کھانا؟“ جبری کی ساری ضروریات خود بخود پوری ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ بے حد خوش تھا۔ جانسن نے پیٹھ تھپک کر اُسے شاباشی دی اور وہاں سے اٹھ کر باہر آگیا۔ تھوڑی دیر بعد جبری بھی کتائیں چھپائے باہر نکلا اور جانسن کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

جبری کا باپ رچرڈ سن اپنے دفتر میں بیٹھا تھا اور مختلف کاروباری کاغذات میں منہمک تھا۔ اچانک ٹیلیفون کی کھنٹی بجی اُس نے ریسپورر اٹھایا۔ دوسری طرف ایک زعجب دار اور سنجیدہ آواز نے اُسے مخاطب کیا ”مسٹر رچرڈ سن! مجھے یہ اطلاع دیجئے ہوئے افسوس ہے کہ اس وقت آپ کے اکلوتے بیٹے کی زندگی سخت



جھک آئے ”آپ.....“ انہوں نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکے۔ جانسن نے اطمینان سے اُن کے سامنے بیٹھے ہوئے کہا ”مجھے جانسن کہتے ہیں آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے آپ کو ٹیلی فون کیا تھا۔“

رچرڈسن کو جانسن کے لہجے میں کوئی سفاکی محسوس نہیں ہوئی، شکل سے بھی وہ کوئی مجرم دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اُس کی سنجیدگی اور اطمینان دیکھ کر مسٹر رچرڈسن اور بھی خوف زدہ ہو گئے۔ ایسے لوگ عام مجرموں سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ مسٹر رچرڈسن ننھے جبری کا تصور کرتے ہی بُری طرح گھبرا گئے۔ انہوں نے نہایت سعادت مندی سے چالیس ہزار پونڈ کی گڈیاں جانسن کے سامنے میز پر رکھ دیں۔ جانسن نے حواس پر قابو پاتے ہوئے بدحمتانہ سے کہا ”ائیں کسی لفافے میں رکھ کر دیجئے مسٹر رچرڈسن۔“

مسٹر رچرڈسن نے اضطراب کے عالم میں گھڑی پر نظر ڈالی، تین بجنے میں صرف دو منٹ رہ گئے تھے۔ انہوں نے جلدی جلدی نوٹوں کی گڈیاں ایک بڑے لفافے میں بھریں اور لفافہ جانسن کی طرف بڑھادیا ”شکریہ مسٹر رچرڈسن۔“

جانسن لفافہ اپنے بیگ میں رکھتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا ”میرے کارڈ میں دفتر کا پتہ موجود ہے۔ میں نے آج ہی جدید طرز کی ایک شان دار عمارت میں یہ دفتر قائم کیا ہے آپ جب چاہیں مجھ سے مل سکتے ہیں آپ کی آمد میرے لیے مسرت اور عزت افزائی کا باعث ہوگی۔“

مسٹر رچرڈسن نے تقریباً چپختے ہوئے کہا ”میرا بیٹا جبری؟“

”رچرڈسن! میں دھوکے باز آدمی نہیں ہوں۔ دیانت دار اور ایمان دار ہوں، یہی میرا پہلا اصول ہے۔ آپ کا بیٹا ساڑھے تین بجے تک ضرور گھر پہنچ جائے گا ورنہ میرا پتہ تو آپ کے پاس ہے ہی۔“

مسٹر رچرڈسن اپنی گاڑی میں ہوا میں اڑتے

### سلطان الپ ارسلان سلجوقی

سلطان کھانا کھا رہا تھا کہ باورچی کے ہاتھ سے ڈونگا چھلک گیا اور گرم گرم شور بے نے سلطان کو جلا دیا۔ اس نے غضب ناک ہو کر باورچی کو دیکھا تو اُسے اپنی موت کا یقین ہو گیا۔ باورچی نے حالت مایوسی میں بقیہ شور با بھی سلطان پر اُلٹ دیا۔ خادم شاہی نے اُسے گرفتار کر لیا۔

دوسرے دن صبح اُسے سلطان کے سامنے دربار میں پیش کیا گیا۔ الپ ارسلان نے سختی سے کہا ”باورچی! تمہارا پہلا جرم تو قابل معافی تھا کیونکہ وہ اتفاقی تھا لیکن تمہاری دوسری حرکت کا کوئی جواز نہیں ہے۔“

باورچی نے سر جھکا کر جواب دیا ”علی اللہ مجھے اپنی پہلی لغزش پر ہی موت کا یقین ہو گیا تھا میں نے یہ سوچا کہ اگر معمولی اتفاقی غلطی پر حضور نے مجھے موت کی سزا دی تو سننے والے سلطان کو ظالم قرار دیں گے۔ یہ سوچ کر میں نے دوسری سنگین بلا ارادہ غلطی کا ارتکاب کیا تاکہ حضور کے صادر کردہ سزائے موت کے فیصلے کا کوئی معقول جواز موجود رہے اور آپ کے عدل و انصاف پر حرف نہ آنے پائے۔“

الپ ارسلان نے شرمندہ ہو کر سر جھکا دیا اور آہستہ سے حکم دیا ”اس شریف اور معقول انسان کو رہا کر دیا جائے اور اسے اُس کے عہدے پر بحال کر دیا جائے۔“

(انتخاب: ماہ نور/ لاہور)

کارڈ لا کر اُن کے سامنے رکھ دیا۔ مسٹر رچرڈسن نے کارڈ کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ انہوں نے بڑی عجلت سے کہا ”اُسے فوراً اندر بھیج دو۔“

جانسن نے تِلے قدموں سے اندر داخل ہوا۔ مسٹر رچرڈسن اُسے دیکھتے ہی کرسی پر آگے کی طرف

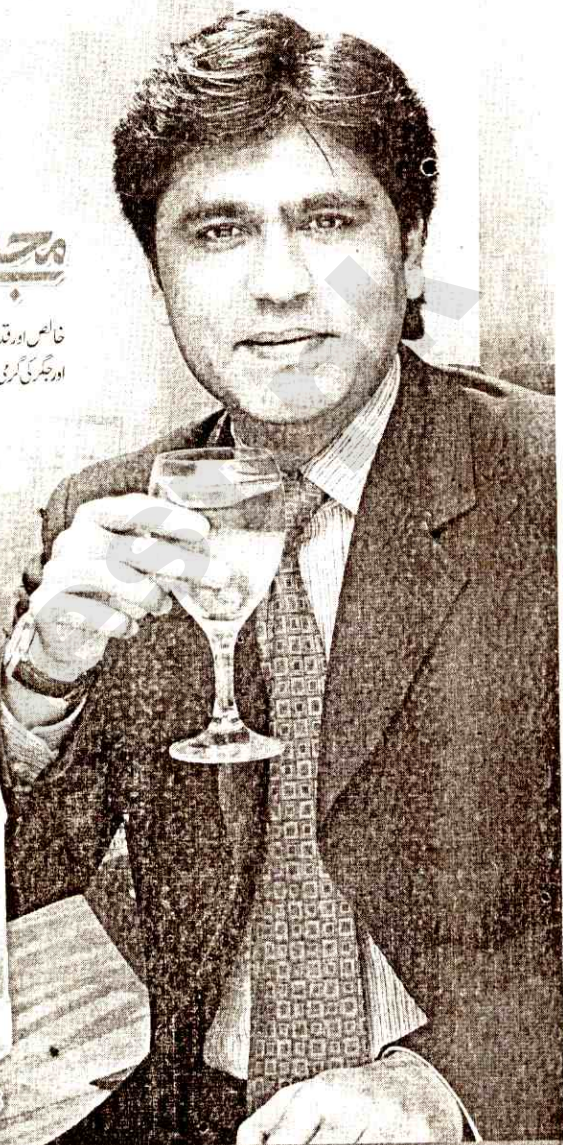


## محبے صندل کر دو

خالص اور قدرتی اجزاء سے تیار کردہ وسیع پیمائش بھجوائے، سرور و  
اور جگر کی گرمی دور کرے، طبع مزاجی کا فوری احساس۔



دیکھ کر ہی دہشتی بند کر





انسپکٹر نے کہا ”ہاں ممکن تو ہے لیکن یہ ایک فضول کوشش ہوگی۔ ذرا مجھے اس کا کارڈ تو دکھائیے مسٹر چرڈن!“ اُس نے کارڈ پر نظر ڈالی، لکھا تھا ”جائن بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ بیرسٹریٹ لاء“ انسپکٹر نے مسکرا کر مسٹر چرڈن کی طرف دیکھا۔ بد قسمتی سے وہ بیرسٹر بھی ہے..... اس لیے مجھے کامیابی کی بالکل اُمید نظر نہیں آتی۔“

مسٹر چرڈن نے پورے چالیس ہزار پونڈ گنوائے تھے۔ وہ بھلا کیسے مطمئن اور بے نیاز ہو جاتے؟ آخر کچھ تذبذب کے بعد دوسرے دن وہ کارڈ کے تپے پر پہنچ گئے۔ وہاں متناسب بدن کی ایک نو عمر اور دلکش سیکرٹری نے اُن کا استقبال کیا۔ مسٹر چرڈن اُس کے نظارے میں ایسا کھوئے کہ انہیں اپنی آمد کا مقصد بھی یاد نہیں رہا۔ وہ محویت سے سیکرٹری کے جاذب نظر خدو خال اور دل فریب قد و قامت کا جائزہ لینے لگے۔ اچانک بیرسٹر جائن اندر داخل ہوئے۔ جائن مسکرا کر اُن کی طرف بڑھا اور اُن سے مصافحے کے بعد مصروفیت کی معذرت چاہتا ہوا اندر چلا گیا۔ جائن کے چرب زبان اسٹنٹ نے مسٹر چرڈن کو ششے میں اتارنا شروع کیا اور تھوڑی دیر بعد انہیں اپنے ساتھ جائن کے پر شکوہ کمرے میں لے گیا۔ مسٹر چرڈن سیکرٹری کے حسن سے غالباً اتنا مرعوب ہو چکے تھے کہ انہوں نے کل کے واقعے کا کوئی ذکر نہیں کیا اور اپنے ادارے کے لیے قانونی مشیر کی حیثیت سے جائن کی خدمات حاصل کرنے کی درخواست کی جسے جائن نے خندہ پیشانی سے قبول کر لیا۔ مسٹر چرڈن سیکرٹری کو گھورتے ہوئے واپس جانے لگے تو سیکرٹری نے انہیں ایک دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ رخصت کیا۔ جائن اُن کے جاتے ہی قبچہہ لگا کے کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر بلا کا اطمینان تھا۔

ہوئے گھر پہنچے۔ وہ سخت بے چین تھے۔ انہوں نے ٹیلیفون کر کے پولیس انسپکٹر کو بھی بلوایا تھا۔ ٹھیک ساڑھے تین بجے گھر کے سامنے ایک ٹیکسی رُکی اور رضا جیری ٹیکسی سے اتر کر گھر کے احاطے میں داخل ہوا۔ مسٹر چرڈن نے دوڑ کر اسے سینے سے لپٹا لیا۔ رچرڈ کی بیوی اپنے بیٹے کے غم میں بُری طرح رو رہی تھی اور بار بار شوہر کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔ جیری کو دوبارہ سامنے دیکھ کر وہ نیم دیوانی سی ہو گئی اور اُسے گود میں لے کر اٹھا کر جلدی سے اندر لے آئی۔ حالات ذرا بُرے سکون ہوئے تو مسٹر چرڈن نے ننھے جیری سے پوچھا ”بیٹے اُن لوگوں نے تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں پہنچائی؟“ جیری نے حیرانی سے کہا ”آپ کن لوگوں کی بات کر رہے ہیں ڈیڈی؟ میں تو چڑیا گھر گیا تھا“ پھر وہ مزے لے لے کر چڑیا گھر کے مشاہدات سنانے لگا۔ جائن کا اُس نے کوئی ذکر نہیں کیا کیوں کہ ڈیڈی اور می اُسے تقریباً ہر روز سمجھاتے تھے کہ کسی اجنبی شخص سے کبھی ثانی یا مٹھائی یا کوئی اور چیز نہ لیتا۔ اجنبی لوگ بچوں کو مٹھائی کھلا کر بے ہوش کرتے ہیں اور ساتھ لے جاتے ہیں۔ اُس نے سوچا کہ میں نے جائن کا ذکر کیا تو می اور ڈیڈی دونوں غفا ہو جائیں گے۔

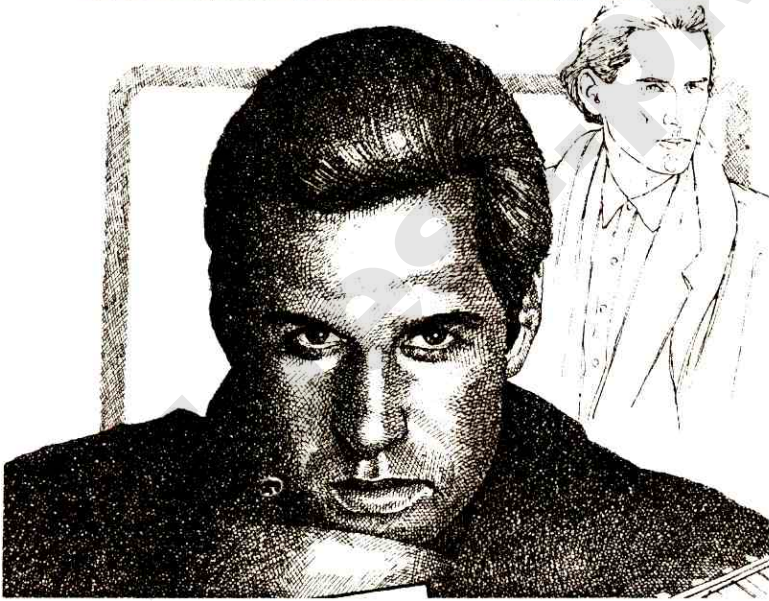
مسٹر چرڈن اور پولیس انسپکٹر اس واقعے پر حیران تھے۔ مسٹر چرڈن نے کہا ”انسپکٹر تمہاری کیا رائے ہے؟ اب کیا قدم اٹھانا چاہیے؟“ انسپکٹر نے جواب دیا ”اوّل تو ایسے لوگ عموماً واردات کے فوراً بعد غائب ہو جاتے ہیں پھر بھی اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ جرم کارڈ میں لکھے ہوئے تپے پر موجود ہے تو بھی قانوناً ہم اُس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے کیونکہ اُس کے خلاف اغوا کا مقدمہ نہیں بنایا جاسکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جیری خود اپنی مرضی سے چڑیا گھر گیا تھا۔“ مسٹر چرڈن نے کہا ”فریب دہی اور جعل بازی کا مقدمہ تو قائم کیا جاسکتا ہے؟“



جاوید بسام

## قصہ ایک شام کا

میں نے اپنے عظیم دوست کو حیرت سے دیکھا جس نے بڑی آسانی سے ایک اجنبی شخص کے بارے میں منطقی رائے دی تھی۔ بظاہر اس سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میں ہومز کی دوستی پر جتنا فخر کرتا، اتنا کم تھا۔ پھر میں نے کہا ”ہومز کیوں نہ ہم اس کے پاس جائیں اور اسے یہ باتیں بتا کر حیرت زدہ کر دیں.....“۔



شرک ہومز کا دلچسپ واقعہ، اُسے اپنی قیادہ شامی کو جانچنے کا موقع ہاتھ آ گیا تھا

سے بولا ”آؤ والٹن! مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔“  
 ”کیا ہم کسی سے ملنے جا رہے ہیں؟“ میں نے  
 پوچھا۔  
 ”نہیں بس ذرا باہر چل رہے ہیں۔ چیرنگ

اس دن موسم بہت خوشگوار تھا۔ میں اپنے دوست  
 شرک ہومز کے گھر پہنچا تو اسے تیار ہوتے ہوئے  
 دیکھا۔ اس نے اپنا بہترین سوٹ پہن رکھا تھا۔ ایسا  
 لگتا تھا کہیں جانے کا ارادہ ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ مسرت

## اب ثانی ٹینک کبھی نہیں ڈوبے گا

چین میں کبھی نہ ڈوبنے والے ٹائی ٹینک کی تیاری کا آغاز ہو گیا ہے۔ سو سال قبل ڈوبنے والے عظیم الشان بحری جہاز ٹائی ٹینک کی نقل ساڑھے 16 کروڑ ڈالر کی لاگت سے تیار کی جائے گی۔ اصل ٹائی ٹینک کے برعکس یہ ٹائی ٹینک بھی نہیں ڈوبے گا کیونکہ اسے سمندر میں نہیں اترنا بلکہ وسطی چین کے ایک تاریخی تقسیم پارک کی زینت بننا ہے۔ اس ٹائی ٹینک کی خاص بات یہ ہے کہ سیاح اس میں بیٹھ کر ٹائی ٹینک کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کا عملی مشاہدہ کریں گے۔

(مرسلہ: شفقت طاہرہ ورک۔ کراچی)  
جلدی ہی کسی نتیجے پر پہنچ جائیں گے لیکن تمہارا اس کے لباس کے بارے میں کیا خیال ہے؟

ہومز بولا ”لباس لندن کے بہترین درزی نے تیار کیا ہے۔ اگرچہ یہ پرانا ہے اور شانوں سے کچھ ڈھیلا ہے لیکن یہ اس کے لیے ہی بنایا گیا تھا۔ میرا خیال ہے پچھلے دنوں یہ کچھ پیارا رہا ہے۔“

”اسے کیا پیاری ہو سکتی ہے؟“ میں نے تشویش سے پوچھا۔  
”کوئی خاص نہیں میرا اندازہ ہے میعاد بخار رہا ہوگا، گزشتہ دنوں اس کی دبا پچھلی تھی۔“

میں نے مرحومیت سے سر ہلایا اور پوچھا ”لیکن اس کے بھاری ہاتھ اور مضبوط جبرے تو اسے بینکار یا وکیل ظاہر نہیں کر رہے؟“

ہومز خوش دلی سے مسکرایا ”میرے دوست والٹن! بے شک اس کے ہاتھ بہت مضبوط ہیں لیکن میں نے ایک ایسا ڈاکٹر بھی دیکھا ہے جس کے ہاتھ اس سے بھی زیادہ بھاری تھے حالانکہ اس نے زندگی میں کبھی ایک کیل بھی نہیں ٹھونکی تھی۔“ میں نے کہا

کر اس تک، تھوڑا چہل قدمی ہو جائے گی۔“ وہ بولا۔  
میں نے حیرت سے اسے دیکھا کیونکہ وہ بہت کم باہر نکلتا تھا زیادہ تر گھر میں بند مطالعے اور سوچ و بچار میں مصروف رہتا جلد ہی ہم روانہ ہو گئے۔ اُن دنوں اتفاق سے ہمارے پاس کوئی کیس نہیں تھا۔ سارے راستے ہومز چپکے رہا۔ آج وہ ایک بدلا ہوا انسان نظر آ رہا تھا، ہم نے ایک اچھے سے ہوٹل میں کھانا کھایا اور ہائیڈ پارک کی طرف نکل گئے۔

پارک میں کئی لوگ مجمع لگائے گلہ پھاڑ پھاڑ کر اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ ہم ان سے ہٹ کر ایک بچہ پر بیٹھ گئے۔ ہومز مجھے افریقہ کے ایک قبیلے ”ڈھک ڈو“ کے بارے میں بتانے لگا۔ اس نے کچھ دن پہلے ہی اس کے متعلق کوئی کتاب پڑھی تھی۔ مجھے اس موضوع سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی باتیں سنتے ہوئے میری نگاہیں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ اچانک مجھے سامنے کی بچہ پر ایک آدمی بیٹھا نظر آیا۔ اس کی شخصیت میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں اس میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا۔ میں نے ہومز کی توجہ اس کی طرف مبذول کرائی اور پوچھا کہ اس آدمی کے بارے میں اس کی کیا رائے ہے۔ ہومز کی ذہین آنکھیں اس پر مرکوز ہو گئیں، کچھ دیر وہ اسے غور سے دیکھتا رہا پھر بولا ”میرے دوست والٹن! سامنے بیٹھے اس شخص کی جوڑی پیشانی مجھے بتا رہی ہے کہ یہ ایک مستقل مزاج ذہین اور مالدار شخص ہے۔“

ہومز کے تجزیے سے میں بہت مرعوب ہوا کیونکہ اس کی قیافہ شناسی کا دل سے قائل تھا۔ اس کے اندازے ہمیشہ درست ثابت ہوتے تھے۔ وہ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے سوچ میں ڈوبے لہجے میں بولا ”یہ شخص یا تو بینکار ہے یا ایک کامیاب وکیل..... اس پر میں بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ میں نے گردن ہلائی اور کہا ”اس کی کوئی جلدی بھی نہیں ہم

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور عظیم پیش کش

# عباداتِ رمضان المبارک

شائع ہو گیا ہے

قیمت 175 روپے



رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جس نے رمضان المبارک کے آنے کی خوشی منائی اللہ تعالیٰ اسے ایک سال تک خوشیاں عطا فرماتا ہے اور جس نے رمضان المبارک کے جانے کا غم منایا اس سے ایک سال غم دور ہٹا دیتا ہے۔

- رمضان کیا ہے۔
- رمضان اور روزہ
- رمضان اور قرآن
- رمضان اور شبِ قدر
- رمضان اور اعتکاف
- رمضان اور تراویح
- رمضان کی عبادات
- وظائف اور دعائیں
- رمضان اور نوافل
- رمضان کی عبادات کا اثر تمام سال کیسے رہتا ہے۔
- رمضان میں عورتوں کے مسائل اور ذمہ داریاں
- ایک مکمل اور جامع گائیڈ۔ گھر کے ہر فرد کیلئے۔ آپ کے دوست احباب کیلئے رمضان کا بہترین تحفہ!
- اپنے آرڈر سے جلد مطلع فرمائیں۔
- خود پڑھیں اور دوسروں کو پڑھائیں

سیارہ ڈائجسٹ۔ 240 مین مارکیٹ، ریلوے گارڈن لاہور۔ فون: 37245412



اثبات میں سر ہلانے لگا۔

میں نے کہا کہ ”میرے دوست نے آپ کی دلچسپ شخصیت پر ابھی ایک رائے دی ہے میرا خیال ہے آپ بھی اسے سننا پسند کریں گے۔“ پھر میں نے اسے ہومز کی تمام باتیں بتائیں۔ وہ جھینپ کر اپنے دونوں ہاتھوں کو رگڑ رہا تھا۔ میں نے کہا ”مجھے یقین ہے یہ سب باتیں درست ہوں گی اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟“

اس آدمی نے بولنے کی کوشش کی لیکن اونہہ ..... آں جیسے مبہم الفاظ منہ سے نکلے اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور ہکلا کر بولا: ”جناب آپ معزز لوگ ہیں آپ کے دوست یقیناً درست اندازہ لگاتے ہوں گے۔ دراصل غلطی میری ہے، میں نے آج ہی یہ سوٹ پرانے کپڑوں کے بازار سے خریدا ہے۔ میں ایک دھقان ہوں اور کل ہی لندن کام کی تلاش میں آیا ہوں۔ غلطی سو فیصد میری ہے مجھے کوئی عام سا سوٹ خریدا نا چاہیے تھا، لیکن میرے ٹاپ کا بس یہی ایک سوٹ تھا۔“

وہ تاسف سے گردن ہلاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا پارک کے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

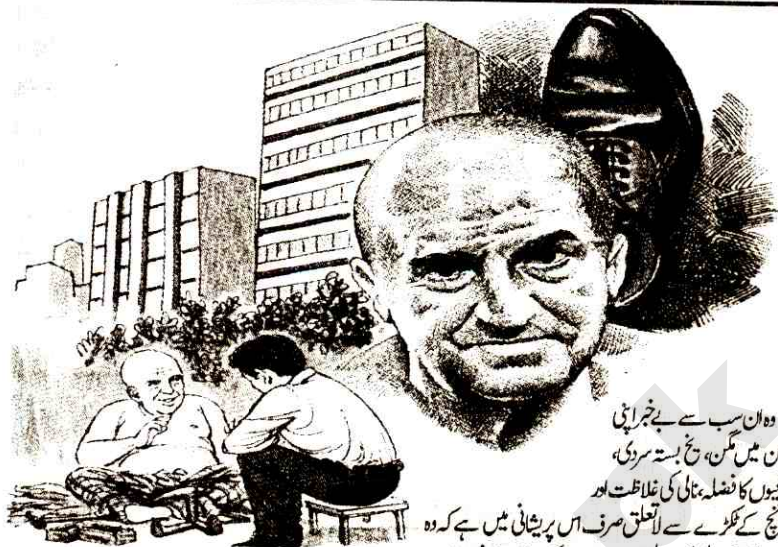
میں نے کن اکھیوں سے ہومز کی طرف دیکھا، اس کی فراخ پیشانی پر پسینے کے قطرے نظر آرہے تھے۔ اس نے اپنی ٹائی کی گره ڈھیل کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بڑبڑا رہا تھا ”کیا واپس دن ہے ایسے موسم میں گھر سے باہر نکلنا بے وقوفی تھی۔“ وہ اٹھ کر چل دیا۔ گھبراہٹ میں وہ باہر چارنے کی بجائے پارک کے اندرونی حصے کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے غیر محسوس انداز میں اس کا رخ گیٹ کی طرف کیا۔ جب ہم کبھی میں بیٹھے واپس آرہے تھے تو میں نے سڑک کنارے اس آدمی کو جاتے دیکھا اس نے اپنا کوٹ اتار کر بغل میں دبایا تھا۔

”ضرور ایسا ہی رہا ہوگا، ہومز لیکن اس کے جوتے اس کی شخصیت سے میل نہیں کھاتے؟“

یہ سن کر شرک ہومز سوچ میں پڑ گیا کیونکہ اس کے جوتے کافی پرانے لگے رہے تھے۔ دفعتاً اس نے چٹکی بجائی اور بولا ”تم ٹھیک کہتے ہو ڈاکٹر والٹن اس کے جوتے بہت پرانے ہیں لیکن یہ تو دیکھو پچھلے دنوں کافی لیدر (گائے کا چمڑا) کی قیمتیں آسمان پر جا پہنچی ہیں، جوتوں کے دام دو گئے ہو گئے ہیں اور ہاں (اس نے میرے شانے پر ہاتھ مارا) اب میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ایک بینکار ہے۔ جس کا واسطہ سارا دن ہندسوں سے پڑتا ہو، اسے عملی طور پر کفایت شعار بھی ہونا چاہیے“ وہ راحت افزا طمانیت سے مسکرا کر بولا۔

میں نے اپنے عظیم دوست کو حیرت سے دیکھا جس نے بڑی آسانی سے ایک اجنبی شخص کے بارے میں منطقی رائے دی تھی۔ بظاہر اس سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میں ہومز کی دوستی پر جتنا فخر کرتا، اتنا کم تھا۔ پھر میں نے کہا ”ہومز کیوں نہ ہم اس کے پاس جائیں اور اسے یہ باتیں بتا کر حیرت زدہ کر دیں، تھوڑا شغل رہے گا۔“

ہومز کی آنکھیں چمکنے لگیں وہ بولا ”ہاں ضرور“ کوئی حرج نہیں ہے، ہم اٹھے اور اس کی طرف بڑھ گئے۔ قریب جا کر ہم نے سلام کیا اور ہاتھ ملا کر اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ اس نے چونک کر حیرت سے ہمیں دیکھا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نظر آرہے تھے۔ میں نے کہا ”محترم! ہم آپ کا کچھ وقت لیں گے، میں ڈاکٹر والٹن ہوں اور یہ میرے عظیم دوست مشہور سرائی رساں شرک ہومز ہیں۔ (ہومز نے اپنی ٹوپی کو چھوا)۔ آپ نے ان کے بارے میں ضرور سنا ہوگا۔ انہوں نے بہت سے پیچیدہ کیس اپنی ذہانت سے حل کیے ہیں“ وہ شخص



وہ ان سب سے بے خبر اپنی  
 دھن میں گم، بے ہوش سر دی  
 مرغیوں کا فضلہ، تالی کی غلاظت اور  
 کالج کے کلوے سے لعلق صرف اس پریشانی میں ہے کہ وہ  
 رات کے آٹے کے لئے پیسے، چھ ماہ کے پیسے جسے غمونا ہے  
 کے لئے دوہلی اور لنڈے سے کپڑے لے کر جانے ہیں۔

کیپٹن (ر) لیاقت علی ملک



malik.psp33@gmail.com  
 http://www.facebook.com  
 /liaqatmalick?fref=tbs

کیپٹن (ر) لیاقت علی ملک نے گورنمنٹ کالج لاہور سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد نومبر 1995ء میں افواج پاکستان میں کمیشن حاصل کیا۔ پاکستان آرمی کے دس سالہ دور میں مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے علاوہ اپنی پیشہ ورانہ تربیت میں بھی نمایاں مقام حاصل کیا۔ نومبر 2005ء میں پولیس سروس کا حصہ بنے اور پریذیڈنٹ پولیس میڈل (PPM) اور وزیر اعلیٰ پنجاب سے ”بہترین پولیس آفیسر“ کا ایوارڈ ان کے کارہائے نمایاں ہیں۔ اپنی عسکری اور پولیس سروس کے دوران بھی انہوں نے علم و ادب سے اپنا تعلق اور واسطہ بالکل اسی طرح استوار رکھا جس طرح سپاہی اپنی بندوق سے رکھتا ہے۔ دو کتابوں کی تصنیف کے علاوہ ان کے مضامین مختلف اخبارات، رسائل اور جرائد کی زینت بنتے رہتے ہیں اور روزمرہ کے معاشرتی مسائل، معاشی ناہمواریوں، منت بدلتی ہوئی اخلاقی اقدار اور مافی رڈیوں پر طنز کے نشتر چلانا ان کے انداز تحریر کی انفرادیت اور خاصا ہے۔

(مدیر)

### انسان کی بے مائیگی آشکار کرتی ایک مدامو تحریر

پناہ لے رہے ہیں اور ایک دوسرے کے جسم کی گرمی حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کے جسم کا حصہ بننے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ بزرگ ہمیشہ کی

نگے پاؤں دوسروں کو جوتے بیچنے والا یہ شخص میرے دماغ میں سول کی طرح اٹک گیا۔ شدید سردی میں جہاں پرندے منتقار زیر پر لئے کونوں کھدروں میں

محسوس کرتا ہے۔ جہاں ان کو کوئی مٹھائی کھانے سے یہ کہہ کر نہیں روکتا، کہ آپ کو شوگر ہے۔ اور ان پر جگہ جگہ تھوکنے پر پابندی نہیں لگاتا۔ نہ چائے کی دوسری پیالی پہ یہ کہتا ہے کہ ابھی آپ نے لی ہے۔ آپ کی صحت کے لئے ٹھیک نہ ہے۔ اور وہ بھیچرے بھر کر جب سانس باہر پھینکتا ہے تو اس میں ایک آزادی اور اظہار تشکر اور سکون کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔

یہ شخص ننگے پاؤں لوگوں کو سردی سے محفوظ رکھنے کے لئے بچے بچے رہا ہے۔ معاشرتی انصاف، تقسیم زر، معاشی ناہمواریوں اور عدم مساوات کا منہ پوتا ثبوت ہے۔ مگر وہ ان سب سے بے خبر اپنی دُھن میں مگن، رخ بستہ سردی، مرغیوں کا فضلہ، تالی کی غلاطی اور کاچ کے ٹکڑے سے لائق صرف اس پریشانی میں ہے کہ وہ رات کے آٹے کے لئے پیسے، چھ اہ کے بچے جسے نمونیا ہے کے لئے دوائی اور لنڈے سے کپڑے لے کر جانے ہیں۔ راہ میں بڑی اینٹ کے روڑے سے جو اس کو ٹھوکر لگی ہے اس سے شاید اس کی سردی کی شدت سے سُن پاؤں کو کچھ نہ ہوا ہو، مگر میرے دماغ میں شدید چوٹ ضرور لگی ہے۔۔۔!

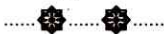
انسان ہمیشہ اپنے حال پر ناخوش اور ماضی میں کھویا رہتا ہے۔ صرف وہ لوگ جو ماضی کی خامیوں کو مد نظر رکھ کر مستقبل کی ترجیحات طے کرتے ہیں، کامیابی ان کا مقدر بنتی ہے۔ انسان کے ضمیر میں یہ چیز شاید روز ازل سے رکھ دی گئی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے حال پر ناخوش رہے گا۔ اور ہمیشہ اپنی تقدیر کو کوستا رہے گا۔ اپنے خالق سے شکوہ کرتا رہے گا۔ اس بابے کی طرح جس کے پاس گھر میں ہر نعمت موجود ہے مگر پھر بھی وہ ناخوش ہے اور کوئی نئی منزل، کوئی نئی

طرح گرم بستر سے بیزاری کا ثبوت اور گھر کے باسیوں سے اکتاہٹ کا اظہار کرنے کے لئے گلی کے کونے والی دوکان میں، لکڑی کے کونلے کو ہوا دینے اور ارد گرد سے جھاڑ جھکاڑ، خشک جھاڑیاں، پوتڑے اور لیروں کو بچھتی ہوئی آگ کو تیز کرنے کے لئے استعمال کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ چادر کی بکلی میں آگ کے قریب ہونے کی کوشش کرتے ہوئے اس خوف میں مبتلا بھی کہ کہیں کوئی چنگاری (پھونک) مارنے سے اڑ کے چٹی چادر جو صدیوں سے اس جسم کا حصہ تھی یا پرانا تہبند (لاچا) نہ جلادے۔ کیونکہ بابا جی کو پتہ ہے اس کے نتائج کتنے خوفناک ہونگے۔ جوانی میں رُعب دار شخصیت اور گھروالی کو حقیر، کمتر اور ناقص عقل سمجھنے والا بابا اب بڑھاپے میں اتنا ہی بے بس، کمزور، لاچار اور مسکین صورت بن جاتا ہے۔ کیونکہ جوان اولاد کے سہارے بی بی جان اب اپنی سلطنت کی ”شہنشاہ“ ہو چکی ہوتی ہے۔ عمر کا نصف سے زائد حصہ حکومت کرنے والا بابا، جب کمزور پڑ جاتا ہے تو اولاد کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی محسوس کر کے اور اپنی بیکاری سے منسلک کر کے، اپنے آپ کو ان کے رحم و کرم کے تابع سمجھ کر، بے بسی کے عالم میں، جب بہو کی انگریزی اور پوتے پوتیوں کی اپنی اپنی ذات کے اندر بسنے والی انجمن کا حصہ نہیں بن پاتا۔ تو اس کو سکون گلی کے کونے میں چلنے والی لکڑی، کاٹھ کباڑ، لیروں اور ٹاکیوں سے چلنے والی آگ، جو اس کو شاید ہیٹر اور بستر کی گرمی اور نرمی تو نہیں دے سکتی۔ مگر اس ماحول سے وقتی فرار ضرور دے دیتی ہے۔ اور بابا بھی اپنے آپ کو ظلم کی فضاء سے نکل کر جبر کے آہنی پنجوں کی دسترس سے باہر، آزاد پنچھی



تک کر دیتے ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں ہمارا ایسے بیسیوں لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ جو شریعت سے زیادہ شر کے پیروکار ہوتے ہیں۔ مگر ان کی خوبصورت دستار، قیمتی عبا، اور دل آویز ادا، کی بدولت جو مال و زر اور اطلس و کچوب اور محمل و مخمورگی کے بوجھ تلے اپنی پاک ظنی اور پاکیزگی کا یقین دلانے میں ضعیف العقیدہ مسلمانوں کو اس حد تک کامیاب ہو چکے ہوتے ہیں کہ لوگ اللہ سے زیادہ اپنی حاجت روائی ان سے وابستہ کر لیتے ہیں۔

چھوٹے تھے تو صبح مسجد جانے پر ناخوش، کہ کیوں صبح صبح نیند خراب کردی۔ مسجد کا دور ختم ہوا تو صرف سکول جانا ہوتا تھا۔ پھر بھی ناخوش کہ کون سات بجے اٹھے اور تیار ہو۔ اس دور کو بھی ماں باپ اور سکول کو بُرا بھلا کہتے گزارا۔ پھر کارسکار کی باری آئی، تو دفتر جانے کے لئے آٹھ بجے نکلنے پر موت پڑنے لگی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اس نیند اور آرام کے لئے جس کے لئے ہمیشہ مسجد کے حافظ، سکول کے استاد، دفتر کے پاس اور ماں باپ سب کو صلواتیں سناتے تھے وہ زندگی کے حساب کتاب اور کارستانیوں کی وجہ سے، آنکھوں سے کوسوں دُور چلی گئی۔ اب وقت ہے تو نیند نہیں اور فرصت کے لمحات کو کوستے رہتے ہیں۔ واہ رے انسان، کیا بات ہے تیری، کاش تُو نے اللہ کے نظام میں اللہ کے فرمان کے مطابق شب و روز بسر کرنے کا انتظام کیا ہوتا تو شاید تیرے اندر کا خلاء، تیرے ذہن کی ہوا اور جسم کی ردا تیرے لئے اضطراب، مایوسی، بے مائگی، بے وقعتی کی بجائے سکون اور ابدی آرام پر منتج ہوئی۔



سوچ، کوئی نئی راہ، کوئی نئی قوت اس کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور وہ سب کچھ چھوڑ کر نردوان پانے کے لئے خود کو دیس نکالا دیتا ہے۔ اور جنگلوں کا پاس بن جاتا ہے۔ اضطراب، بے چینی اور بے مائگی کا یہ احساس ہمیشہ سے ہمیشہ تک انسان کی سرشت کا حصہ ہے اور رہے گا۔

میں گاڑی میں گرم کپڑوں میں ملبوس اس سوچ میں گم تھا کہ کیا میں بھی ہمیشہ اس اضطراب میں مبتلا رہوں گا۔ انسان کبھی بھی اپنے حال پر خوش نہیں ہوا۔ اور ماضی کی وحشتیں ہمیشہ اس کا پیچھا کرتی رہیں گی۔ تخلیق انسانیت کا بنیادی اصول قدرت نے تفاوت، امتیاز اور درجات کو بنایا۔ اس سسٹم میں برابری، یکسانیت اور مساوات کی کوئی جگہ نہیں۔ کیونکہ کارخانہ قدرت میں اگر تمام لوگ برابر پیدا ہوتے تو نظام کائنات درہم برہم ہو جاتا۔ اور اس کارخانہ حیات کو قائم رکھنے اور چلانے کے لئے کوئی اور نیا نظام بھی قدرت کو وضع کرنا پڑتا۔ کیونکہ اس طرح تو یا سب بادشاہ ہوتے یا سب گدا، یا سب محمود ہوتے، یا سب ایاز۔ بندے ہوتے تو نوازنے والا کوئی نہ ہوتا۔ آجر ہوتا تو اجیر نہ ہوتا۔ یا صرف تو مگر مگر تو صرف یا س۔ مگر قدرت نے اشرف المخلوقات کی درجہ بندی نظام کائنات چلانے کے لئے خود بخود کردی۔ کچھ لوگ پیدا ہوتے ہیں تو شادیاں بچتے ہیں اور جب راضی عدم ہوتے ہیں تو بھی تھارے اور شکرانے کے نفل پڑھے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کی آمد کا بلکل بہت سارے غریبوں میں رونق کی تقسیم کا باعث بنتا ہے۔ اور مرنے کا لوگ اس لئے انتظار کرتے ہیں کہ زندگی میں وہ دوسروں پر زندگی

# سیارہ پکن کارنر

جویریہ کامران

خواتین قارئین کی دلچسپی اور پسند کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم نے کھانوں کی تراکیب پر مبنی خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس میں آسان مگر معیاری اور نئی تراکیب پیش کی جائیں گی۔ ان تراکیب پر عمل کر کے نہ صرف آپ اپنے گھر والوں کو نئے ذائقہ دار کھانے فراہم کر سکتی ہیں بلکہ روایتی ڈشز پکانے کی یوریت سے بھی نجات حاصل کر سکتی ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ آپ کو بہترین تراکیب فراہم کر سکیں۔ اس سلسلے میں آپ ہمیں اپنی تجاویز اور آراء سے آگاہ کرتے رہیے۔ نیز آپ ہمیں خود بھی نئی اور معیاری تراکیب لکھ کر بھیج سکتی ہیں جنہیں آپ کے نام کے ساتھ شائع کیا جائے گا اور بہترین ترکیب پر اعزازی شمارہ بھی آپ کو ارسال کیا جائے گا!

email: sayyaradigest@gmail.com

www.facebook.com/sayyaradigest

## چاکلیٹ آئس کریم

اجزاء:

ساڑھے تین چھٹانک

شکر

انڈوں کی زردی

پانچ عدد

دنیلا اینسنس

ایک چمچ

پھینکی چاکلیٹ

دو چھٹانک

پچاس گرام

کریم

## ترکیب:

کریم، شکر اور چاکلیٹ ملا کر جوش دے کر انڈوں کی زردی چھینٹ کر مرکب میں ملا لیں اور ہلکی آنچ پر نہایت خفیف جوش دے کر اُتار لیں۔ پھر چائے کی چھلنی میں چھان کر ٹھنڈا کریں۔ پھر دنیلا اینسنس ملا کر مشین سے بھالیں۔

## آم کا اسکواش

اجزاء:

آم (چونے والے)

سات کلو

چینی

ایک کلو

ٹماٹر اینڈ

ایک اونس

میٹھارنگ پیلا

ایک تولہ

پوٹاشیم میٹا بائی سلفائیٹ

دس گرام

پانی

ایک کلو



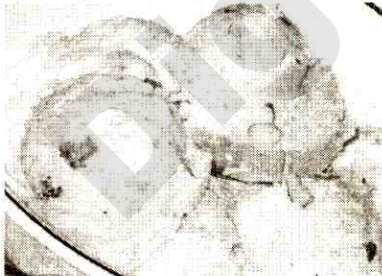
## پستہ آنس کریم

## اجزاء:

ایک کلو	بالائی
آدھا کلو	شکر
ذرا سا	نارنگی کا چھلکا
کھانے کا ایک چمچہ	وینلا ایسنس
ڈیڑھ چھٹانک	پستہ کی گری
ایک چھٹانک	مغز بادام شیریں
آٹھ عدد	انڈوں کی زردی

## ترکیب:

بادام کی گری کو گرم پانی سے بھگو کر چھیل لیں۔ بالائی کو جوش دے کر اور زردی کو مصری کے ساتھ پھینٹ کر بالائی میں ملا کر چھان لیں۔ پھر ہلکی آنچ پر مرکب کو بغیر جوش اس قدر پکائیں کہ سخت ہو جائے۔ پھر آٹار کر بادام کی قاشیں تھوڑی سی ٹھنڈی بالائی و بوس دے کر اور زردی و سرن کے ساتھ پھینٹ کر بالائی میں ملا کر چھان لیں۔ پھر ہلکی آنچ پر مرکب کو بغیر جوش اس قدر پکائیں کہ سخت ہو جائے۔ پھر آٹار کر بادام کی قاشیں تھوڑی سی ٹھنڈی بالائی میں ملا کر اس مرکب کو چند منٹ پکائیں، پھر

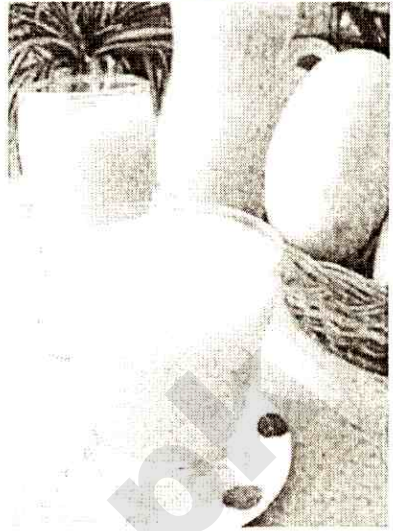


آنچ دیں۔ پھر چھان کر اتنا پھینٹیں کہ بالکل ٹھنڈا ہو جائے۔ بعد ازاں مشین کے ذریعے جمائیں۔

## قلفی

## اجزاء:

دودھ خالص	تین کلو
کھویا	ایک پاؤ
الائیچی	دس بارہ
بادام کی زردی	ایک چھٹانک



## ترکیب:

پہلے آموں کو اچھی طرح دھولیں اور ہاتھوں کو

## ترکیب:

پہلے آموں کو اچھی طرح دھولیں اور ہاتھوں کو بھی اچھی طرح صابن سے دھو کر صاف ستھرا کر لیں۔ اب آموں کا رس نکالیں اور اس کو باریک کپڑے سے چھان کر ایک چینی کے تسلے میں ڈھانپ کر رکھ لیں۔ یہ رس وزن میں کلو پانچ سو کلو ہونا چاہیے۔ اب ایک تسلا لے کر اس میں پانی ڈالیں اور اس میں چینی ڈال کر بڑے چمچے سے حل کریں۔ خوب حل کریں پھر اس میں ٹائمر کا ایسڈ ڈال دیں اور اس کو بھی خوب ملائیں۔ اگر ٹھیک طرح سے حل نہ ہو تو اس کو ہلکی آنچ پر ٹھنڈا ہونے دیں۔ جب یہ ٹھنڈا ہو جائے تو اس میں رس ملا دیں۔ ساتھ ہی یونائشیم مینابانی سلفاٹ ملا دیں اور رنگ کو پانی میں گھول کر ساتھ ہی شامل کر دیں۔ ان سب چیزوں کو بڑے پیچے سے اتنا ملائیں کہ یہ سب کچھ یکجا ہو جائے اب اس کو بوتلوں میں بھر لیں اور مالنے کے اسکواش کی طرح بوتلیں تیار کر لیں۔ آم کا اسکواش تیار ہے۔



## بریڈ رول

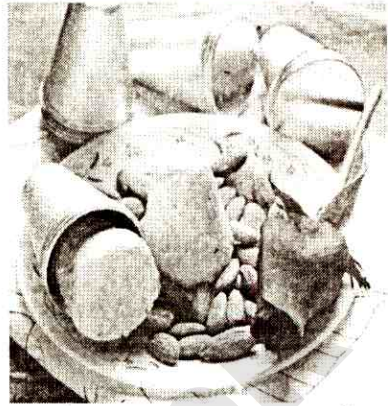
### اجزاء:

ایک عدد بڑی ڈبل روٹی سلاٹس لمبائی میں کٹے ہوئے۔

دو عدد	کنور کیوز
چار کھانے کے چمچ	میونیز
ایک چمچ	کالی مرچ
دو چمچ	کارن فلور
چار عدد	انڈے اُبلے ہوئے

### ترکیب:

ایک کپ پانی میں کیوز گھول لیں دو چمچ کارن فلور تھوڑے سے پانی میں گھول کر بخنی میں ڈال دیں جب بخنی گاڑھی ہو جائے تو اُسے ٹھنڈا کر لیں اس میں چار عدد انڈے باریک کاٹ کر ڈالیں چار کھانے کے

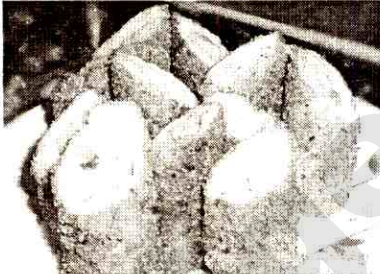


چار بڑے چمچ  
ایک پاؤ

کیوڑہ  
چینی

### ترکیب:

دودھ کو پکائیں اور اتنا خشک کریں کہ آدھا رہ جائے۔ اب اس میں چینی ڈال کر ملائیں اور نیچے اُتار لیں۔ ٹھنڈا ہونے پر اس میں کھویا ملا دیں اور الائچی پیس کر ڈالیں۔ اب اگر قلفی میں جمانے کا خیال ہے تو اس میں بادام چھیل کر کاٹ کر ڈال دیں پھر یہ مرکب قلفی کے سانچے میں ڈالیں اور اس کے بعد اس پر پستہ باریک کاٹ کر چٹکی بھر ڈال دیں۔ قلفی کے اوپر ڈھکنا لگا کر سخت آٹے سے بند کر دیں۔ اب ایک منکے میں برف کوٹ کر ڈالیں اور اس میں نمک اور قلفی ڈال دیں۔ بچ میں قلفیاں رکھ دیں اور منکے کو ہلاتے رہیں۔ تقریباً گھنٹہ ڈیڑھ اسی طرح ہلانے سے قلفیاں جم کر تیار ہو جائیں گی۔ اگر مشین میں جمانا ہو تو دودھ میں کھویا ملا کر اس میں پستہ بادام کاٹ کر ڈال دیں اور الائچی پیس کر ڈالیں اور ساتھ ہی کیوڑہ ڈال کر مشین میں ڈال دیں۔ ایک گھنٹہ مشین چلانے کے بعد آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ قلفہ تیار ہے۔ ایک گھنٹے میں بہت ہی مزید اُنس کریم تیار ہوگی۔



چمچ میونیز ایک چمچ کالی مرچ دو چینی کے بچ ڈال کر کس کر لیں۔ ساتھ تھوڑا سا بریس کریں اس پر چمچ سے آمیزہ پھیلا دیں اور رول کر لیں کپڑے میں پلیٹ کر فریج میں رکھ دیں آدھے گھنٹے کے بعد نکال کر تیز چھری سے گول سلاٹس کاٹ لیں۔

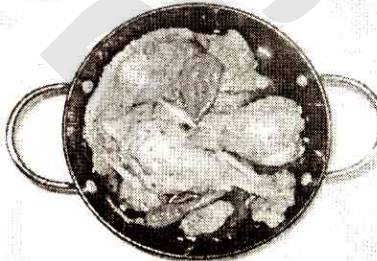
### چکن کرارے

چکن	آدھا کلو (بون لیس)
ادرک کا پیسٹ	ایک کھانے کا چمچ
لیموں کا رس	ایک عدد
انڈے	دو عدد
لال مرچ	ایک کھانے کا چمچ
کالی مرچ	ایک چوتھائی پیسی ہوئی

ادرک لہسن کا پیسٹ کھوپرا آدھا کپ  
دہی ایک کپ  
بادام ایک کپ (چھلے ہوئے)  
ثابت کالی مرچ آٹھ یا دس عدد  
ثابت لال مرچ چھ یا سات عدد  
پسی سفید مرچ دو کھانے کے چمچ  
دارچینی دو ٹکڑے  
پلاٹنا آئل ایک کپ  
سفید زیرہ ایک چائے کا چمچ  
نمک حسب ذائقہ  
لوگن پانچ یا چھ عدد  
(کھوپرا اور بادام پیس کر دہی میں ملا کر رکھ دیں)  
(پیاز، ہری مرچیں، ادرک اور لہسن پیس کر پانی  
کے ساتھ پیسٹ بنالیں)

### ترکیب:

دبچہ میں آئل گرم کر کے ثابت مصالے ڈال کر  
براؤن کر لیں۔ پیاز کا کچھ ڈال کر ہلکی آنچ پر تھوڑی دیر  
بھون لیں۔ خیال رہے کہ پیاز براؤن نہ ہونے  
پائے۔ پھر دہی کچھ ڈال کر کچھ دیر بھون لیں۔ چکن،  
نمک اور سفید مرچ ڈال کر اتنی دیر بھون لیں کہ آئل



الگ نظر آنے لگے۔ جب خوشبو آنے لگے تو ایک کپ  
پانی ڈال دیں اور ثابت لال مرچ ڈال کر پندرہ منٹ  
دم رکھ دیں۔ مزید ارواٹ فورمہ تیار ہے۔



چاول کا آٹا  
سوئی  
میدہ  
کارن فلور  
تیل  
تیل  
تین کھانے کے چمچ  
دو کھانے کے چمچ  
دو کھانے کے چمچ  
دو کھانے کے چمچ  
دو کھانے کے چمچ  
تازے کے لیے

### ترکیب:

پہلے چکن بریسٹ کو لیٹر میں دو کر لیں۔ پھر اس  
کے اسٹریپس کاٹ لیں۔ اب ایک پیالے میں ادرک کا  
پیسٹ، کیوں کارس، انڈے، کٹی لال مرچ، پسی کالی  
مرچ اور نمک شامل کر کے مکس کر لیں۔ پھر اس میں  
چاول کا آٹا، سوئی، کارن فلور اور میدہ شامل کر کے  
اچھی طرح مکس کریں۔ آخر میں تیل اور چکن شامل  
کر کے اچھی طرح مکس کریں۔ پھر تیل میں ڈیپ  
فرائی کر لیں۔ سنہرا رنگ آنے پر نکال کر سرو کریں۔

### چکن وانٹ فورمہ

### اجزاء:

چکن ایک عدد  
ہری مرچ چھ عدد  
پانی ایک کپ  
پیاز ایک پاؤ (چھیل لیں)



## غزل

وہ ادھر پڑھتا رہا اور میں ادھر لکھتا رہا  
کچھ جواب خط نہ آیا میں مگر لکھتا رہا  
اک اک حرف قلم کو تول کر لکھتا رہا  
مختصر تھا خط مگر میں رات بھر لکھتا رہا  
ہر نئی تحریر کا انداز رکھنا تھا جدا  
سوچ کر انجام کو آغاز پر لکھتا رہا  
تاکہ غمگین کر سکے مجھ کو نہ دریا کا سکوت  
پھینک کر دریا میں کنکر آب پر لکھتا رہا  
اک اسیر جاں کو یاد آشیان آتی رہی  
اور وہ اپنے آپ کو بے یال و پر لکھتا رہا  
اشک میرے گر پڑے امتیاز سر قرطاس پر  
حال سے اپنے میں ہو کر بے خبر لکھتا رہا  
(الیس۔ امتیاز احمد / کراچی)

## غزل

جب من میں دکھ کی آگ جلے گی تو  
اشکوں کی برسات اُسے بجھا دے گی  
بچھڑ کر تم سے مر تو نا جاؤں گا  
مگر مری زندگی کانٹوں پہ کٹے گی  
ٹھکرائے گی ساری دنیا جسے حقارت سے  
خدا کی ذات اُسے اپنائے گی  
اللہ کی تافرمانی سے پہلے تا سوچا انسان نے  
کہ بالآخر جنت اُس سے چھن جائے گی  
جیون بھر اخبار دولت کے لگا رہا قارون  
نہیں جانتا تھا کہ یہ اُس کے منہ آئے گی  
عشق یوسف نے دیوانہ کر دیا زلیخا کو

## نعت

جسے مل جائے پینے کو فقط پانی کا پیمانہ  
بڑا رہتا ہے چوکت پر محمد ﷺ کی وہ دیوانہ  
فلسفی، جوتی، دانشوروں سے پوچھتے کیا ہو  
دو عالم کی محمد ﷺ کا خبر رکھتا ہے مستانہ  
شمع کی لو پہ پروانوں کو جلتے مرتے دیکھا ہے  
مگر نورِ مبین سے روشنی پاتا ہے پروانہ  
کھینچ آتے ہیں لاکھوں رند بے یال چاروں جانب سے  
کھلا رہتا ہے آسموں ہی پہر مدنی ﷺ کا میخانہ  
صحابِ صفہ دیدار نبی ﷺ کے بھوکے پیاسے تھے  
یہی تھی جستجو ہر دم کہاں کا پینا اور کھانا  
میسر شوق آجائے درِ مُرسل ﷺ کا گر گوشہ  
وہی ہے دراصل جنت اسی گوشے میں سو جانا  
(شوق خانوہنی / خانواہن سے)

## غزل

وہ جو حسن و جمال رکھتا ہے  
غم سے رشتہ بجال رکھتا ہے  
مجھ کو اُس نے اُداسیاں بخشیں  
کتنا میرا خیال رکھتا ہے  
رونے دیتا نہیں جو زوؤں تو  
وہ ہنر باکمال رکھتا ہے  
گرنا چاہوں تو مگر نہیں دیتا  
کون مجھ کو سنبھال رکھتا ہے  
مجھ کو اُس کی تلاش ہے رانا  
چہرہ جو بے مثال رکھتا ہے  
(قدیر رانا۔ راولپنڈی)



نہیں جانتی تھی کہ بدنام ہو جائے گی  
جب کبھی غموں کی گھٹا چھائے گی تو  
خوشیوں کی تیز ہوا اُسے اُڑا دے گی  
ہر لمحہ پریشان سی رہتی ہے نینا  
پتہ نہیں کب مصائب سے نجات پائے گی  
(نسرین اختر نینا/ لاہور)

### غزل

میرا خنجر بھی میرے دشمن کو دیا ہو  
یا جو وہ چاہے ویسے مجھ کو سزا ہو  
ٹھوکر لگے رستے میں تو ہنس کے اٹھوں  
سر میں اترے تو معاف خون بہا ہو  
خدایا اتنا بلند ظرف مجھ کو عطا ہو  
مصرف پیکار ہو کوئی تو میرے لب پہ دعا ہو  
بھولے ہوئے مسافر کو یوں منزل دکھاؤں  
انجان سی راہوں پہ جیسے جتا دیا ہو  
محبت حد معراج تک پہنچ جائے عبدل  
ممکن اگر حریفوں سے بھی انسان کا بھا ہو  
(عبدالباسط عبدل)

### غزل

لمحہ لمحہ مجھے سزا دے گا  
دل یہ میرا مجھے مٹا دے گا  
لوٹ آیا تو خود صدا دے گا  
ساری باتیں مجھے بتا دے گا  
آئے گا اب بھی جھوم کر ساون  
ٹو نہ آیا تو کیا مزہ دے گا  
میں کبھی بھی جسے بھلا نہ سکوں  
لوگ کہتے ہیں وہ بھلا دے گا  
اس سے ملنے سے اس لیے ہے گریز

کوئی جذبہ نیا جگا دے گا  
روک لو بڑھ کر ایسے طوفان کو  
جو در و بام کو ہلا دے گا  
آ رہا ہے وہ وقت تیزی سے  
جو مجھے خواب سے جگا دے گا  
وہ جو بوڑھا کلی میں رہتا ہے  
حال پوچھو تو بس دُعا دے گا  
مجھ کو عزم و یقین کی چاہت ہے  
جانتی ہوں مجھے خدا دے گا  
وہی ہوگا عظیم سب سے کنول  
جو گرے شخص کو اٹھا دے گا  
(یاسمین کنول/ پرورد)

### غزل

دنیا کے جھیلے میں اکثر ہم نے دیکھا ہے  
غرضوں کے سب قتلحق ہیں پیار محبت دھوکہ ہے  
ہر سو نفسا نفسی ہے ہر سو خوف کا عالم -  
دن خوشیوں سے خالی ہیں افسردہ ہر لمحہ ہے  
گلشن میں کب پھول کھلے کب کونل خاموش ہوئی  
جبر کے موسم نے ہم سے ہر امید کو چھینا ہے  
بہتے آنسو کہتے ہیں شب بھر کس کو روتے ہو  
پاگل ہو تم پاگل ہو پنا کب سچ ہوتا ہے  
ہائے مقدس ناز تمہیں ہر پل شکوہ ہے خود سے  
قسمت میں جو لکھا ہو وہ تو ہو کر رہتا ہے  
(مقدس ناز/ لاہور)

### جیب خالی ہو تو

گردش ایام زمانے کی رفتار بدل دیتی ہے  
زندگی کا اسلوب بدل جاتا ہے تقدیر بدل جاتی ہے  
طرزوں کی صف میں جگہ پاتا ہے رو بھکاری کیلئے  
قانون بدل جاتا ہے بیگناہی کی تعبیر بدل جاتی ہے

شافہ محشر کی نظر کرم ہو تو ہر تقدیر بدل جاتی ہے  
ابھی وقت ہے گناہوں کا احاطہ کر لے  
وقت مرگ تو چہرے کی تصویر بدل جاتی ہے  
(قاضی محمد یوسف - مقط)

### حالی دل

فرتوں کے موسم میں  
یاد کے گئے بادل  
چرخِ دل سے اٹھتے ہیں  
اور وفا کے وعدوں کی

برا وقت ہو تو سر راہ ملاقات میں شناسا چہرے  
رُخ بدل لیتے ہیں چہروں کی تصویر بدل جاتی ہے  
کہتے ہیں مقدر میں لکھا ہوا مل جاتا ہے بہر کیف  
پھوٹی تقدیر ہو تو لوحِ ازل کی تحریر بدل جاتی ہے  
آہوں میں ڈھل جاتے ہیں بلبل و مینا کے نغمے  
آندھیوں کی لپیٹ میں فصلِ گل کی تفسیر بدل جاتی ہے  
لاکھ لئے پھرتا رہے بیگناہی کا اشتہار  
جیب خالی ہو تو عدل کی تعبیر بدل جاتی ہے  
خیر و شر یوم جزا ڈرے ڈرے کا حساب ہوتا ہے

### چنگیز ہلاکو ختم ہوئے

ہے دولت کی گرمی دل میں  
ہاتھ سر پہ میرے یوں رکھتا ہے  
قوموں کو دھوکے دے دے کر  
لگاتا ہے یہ آگِ باغوں میں  
یہ چھری چھپا کے جھولی میں  
یہ پیار کرے ہے ہم سب سے  
کاغذ کے پھولوں کا یہ خالق  
ہیری ہے یہ پکا 'مزدور' کا  
جب رانجھوں پر ہو جاتا ہے  
فطرت ظاہر کر دیتی ہے پھر  
پھبتا نہیں ہے یہ ظلمِ زمانے میں  
آج ہماری باری ہے تو  
رہ جائے گا نامِ اللہ کا  
رہ جائے گا اک پیارِ نشانی  
یہ باتیں ہیں الہام کی

آگ کی طرح منہ جلتا ہے  
جیسے میرا وہ چاچا لگتا ہے  
کرتا ہے وہ باتیں پیار کی  
پر باتیں ہیں باغ و بہار کی  
اللہ اللہ پڑھا کرتا ہے  
پر پیار یہ زہر سانپ کا ہے  
اور دشمن ہے یہ باغِ بہاروں کا  
اور سنگی ہے یہ سرمایہ داروں کا  
ہر طرف سے ظلمِ سیالوں کا  
دھماکہ ایک بھونچالوں کا  
قانونِ اللہ کا جاری ہے  
کل ان کی باری ہے  
چنگیز 'ہلاکو' ختم ہوئے  
نمودِ فرعون ختم ہوئے  
یہ باتیں نہیں ابہام کی

یہ باتیں ہیں پاکستان کی  
کیا باتیں ہیں پاکستان کی

(اقبال - تبسم)

## وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ

(اور ہم نے آپ کا ذکر (سب پر) بلند کر دیا۔ القرآن)

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں  
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

پیغمبرِ آخر الزماں کی سیرتِ پاک **سیارہ ڈائجسٹ** کی طرف ایک لاثانی پیشکش

عام ایڈیشن: 275 روپے  
قیمت: ڈیٹیکس ایڈیشن مجلد: 450 روپے

# عکس سیرت

”میں نے جب یہ کتاب ختم کی تو اونچی آواز میں جسے میں بھی صاف  
سُن سکوں، ایک بار پھر کلمہ پڑھا۔ گویا اپنے آپ سے اپنے مسلمان  
ہونے کا اعلان کیا۔“ (عبدالقادر حسن، مشہور صحافی)

یہ ایمان افروز کتاب خود بھی پڑھیے اور اپنے دوستوں کو بھی پڑھائیے

سیارہ ڈائجسٹ - 240 مین مارکیٹ، ریواز گارڈن لاہور

فون: 042-37245412



دُہن کا نغمہ مل کر گاؤں  
سازِ امن بجاتا جاؤں  
گیتِ وطن کا گاتا جاؤں  
(ڈاکٹر سید نعیم احمد ادیب جعفری)

مارِ آستیں  
بے سہارا ہو کے آیا کام ایسا کر گیا  
جاتے جاتے فاصلے ہی  
آنکھ میں وہ بھر گیا  
احسان فراموش آخر راستہ بدل گیا  
کیسا اس کا ذوق تھا؟ کیسا اس کا شوق تھا؟  
آستیں کے سانپ بھی  
انگشتِ بدندان تھے  
ہوس کے پجاری نے  
پر خلوص لوگوں کو پھر فریب دے ڈھکڑا  
مجبوراً اپنی فطرت سے  
بے ضمیر کی کہنکھرو  
باندھ کر پاؤں میں  
گرہی کے رستے پر  
محور قص ہے ظالم کیسا شخص ہے ظالم؟  
(جاوید رائی)

### غزل

پتھر کے صنم سے جو وفا مانگ رہے ہیں  
خاشاک سے ہم رنگ حنا مانگ رہے ہیں  
ہم ظلم کی سنگلاخ چٹانوں پہ کھڑے ہیں  
ظلمات کے چھٹنے کی دعا مانگ رہے ہیں  
مجرم ہیں سبھی آج کٹہرے میں کھڑے ہیں  
ہم اپنے جرائم کی سزا مانگ رہے ہیں  
نفرت کی کڑی دھوپ میں بیٹھے ہیں مسلسل  
محبوب کے دامن کی ہوا مانگ رہے ہیں

بجلیوں کا شور وغل  
روح میں دھڑکتا ہے  
وصل کے حسین لمحے  
بوند بوند آنکھوں سے  
جب برسنے لگتے ہیں  
تب تمہاری یادیں ہی  
لفظ لفظ کا غنڈہ پر شعر کا بدن اوڑھے  
حالِ دل سناتی ہیں  
باخدا تری یادیں خونِ دل جلاتی ہیں  
بے پناہ ستانی ہیں رات بھر چمکتی ہیں  
(عاکف عثمان عاکف)

### گیتِ وطن کا گاتا جاؤں

بستی بستی، مگر مگر میں  
کوچہ کوچہ، ڈگر ڈگر میں  
پرچم کو لہراتا جاؤں  
گیتِ وطن کا گاتا جاؤں  
سبز ہلالی وطن کا پرچم  
جس میں چمکے تارِ چم چم  
اس کا مان بڑھاتا جاؤں  
گیتِ وطن کا گاتا جاؤں  
سب سے دل کش اور اُجیارا  
پاکِ وطن ہمیں جان سے پیارا  
سب کو یہ بتلاتا جاؤں  
گیتِ وطن کا گاتا جاؤں  
محنت میں ہے، عظمت اپنی  
عزت دولت شہرت اپنی  
ہر اک کو سکھلاتا جاؤں  
گیتِ وطن کا گاتا جاؤں  
آؤ! سب ہم وطنو! آؤ!

چاندنی راتوں میں رویا کیجئے  
ہم ہی اس کے عشق کے قابل نہ تھے  
کیوں کسی خالم کا شکوہ کیجئے  
(ناصر کاظمی)

### غزل

تجھے اُداس بھی کرنا تھا، خود بھی رونا تھا  
یہ حادثہ بھی مری جاں کبھی تو ہونا تھا  
جو داستاں اسے کہنا تھی پھر ادھوری رہی  
کہ میں بھی تھک سا گیا تھا اسے بھی سونا تھا  
وہ مجھ کو توڑ کے پھر جوڑتا رہا سر  
میں اس کے واسطے جیسے کوئی کھلونا تھا  
سنجیل سنجیل کے میں روتا رہا کہ فرقت میں  
جگر کا داغ مجھے آنسوؤں سے دھونا تھا  
میں تخت اکبر پہ سویا تھا رات بھر محسن  
کھلی جو آنکھ تو صحرا میرا بچھونا تھا  
(محسن بھوپالی)

جلادے کے ہاتھوں میں دیئے تیغ برہنہ  
ہم اپنی نوازش کا صلہ مانگ رہے ہیں  
انسان کی مجبوری حالات دیکھو  
قاتل سے کبھی آپ بقا مانگ رہے ہیں  
ممکن جو نہیں اس کو بھی ممکن ہیں سمجھتے  
اب آگ لگی ہے تو گھٹنا مانگ رہے ہیں  
انسان کا کیا بوجھ اٹھانی نہیں دھرتی  
اب چاند پرہنے کی جگہ مانگ رہے ہیں  
(ریاض حسین قمر)

### غزل

وہ کبھی مل جائیں تو کیا کیجئے  
رات دن صورت کو دیکھا کیجئے  
چاندانی راتوں میں اک اک پھول کو  
بے خودی کہتی ہے سجدہ کیجئے  
جو تمنا بر نہ آئے عمر بھر  
عمر بھر اس کی تمنا کیجئے  
عشق کی رنگینوں میں ڈوب کر

### خاص اعلان

محترم قارئین! بزم شاعری میں آپ کی دلچسپی کے پیش نظر ادارہ نے ایک خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس کے تحت ہر ماہ ایک خوش نصیب شاعر/شاعرہ کا تعارف بمعہ تصویر شائع کیا جائیگا۔ جو احباب اس سلسلہ میں شریک ہونا چاہتے ہیں وہ اپنی تازہ غزل/نظم/پندیدہ شاعر کی غزل/نظم اور دیگر تفصیلات کے ساتھ درج ذیل کو پُر کر کے سیرۃ ڈائجسٹ: 244 میں مارکیٹ ریو از گاؤڈن لاہور پر ارسال کریں۔

### کوپن برائے اس ماہ کا شاعر

یہاں اپنی

تصویر

منسلک کریں

نام: ..... تعلیمی قابلیت: .....

عمر: ..... پسندیدہ شاعر: .....

پسندیدہ غزل/نظم: .....

مشاغل: ..... تاریخ پیدائش/ہجرت: .....

شادی شدہ/غیر شادی شدہ: ..... پتہ: .....

ای میل: .....

نوٹ: اپنی پسندنا پسند شاعری کی ابتدا 'مزاج' اور دیگر تفصیلات الگ صفحے پر درج کر کے بھیجئے۔

# شہنائی کے آنسو

ابوضيا اقبال

وہ اپنی زنجی ٹانگ ليے ليک ليک ايک ايک بڑھنے لگا، اس نے ہاتھ لگا کر ديکھا، دھوتی خون ميں لت پت ہوگئی تھی، درد کی ٹيمیں ناقابل برداشت تھیں، پھر وہ غش کھا کر گر پڑا۔

ليکن زيونگھوڑے بچ کو سوري تھی۔  
بيٹی پر نظر پڑتے ہی کرم داد کے جسم ميں جھرجھری سی آگئی جوانی اس کے انگ انگ سے پھوٹی پڑتی تھی، اور چہرہ کھلے ہوئے کنول کی طرح تازہ تھا۔ کرم داد کی آنکھوں ميں فکر و تردد کے بادل تيرنے لگے اور ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔ جوان بیٹی بيل کی طرح چڑھے جارہی تھی۔ وہ بڑھاپے کی دلير پر قدم رکھ چکا تھا۔ نہ

کرم داد نے انگڑائی لی اور اٹھ بیٹھا۔ پو پھٹا چاہتی تھی اور ہوا ميں نسيم سحر کی مہک تير رہی تھی۔ گاؤں کی واحد مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ اس نے کلمہ پڑھا اور چار پائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پاس ہی دوسری چار پائی پر جنداں اور اس سے کچھ پرے زيونگھوڑی تھی۔ اس نے بیوی اور بیٹی پر اچھتی سی نظر ڈالی۔ جنداں پٹی کی نيند ميں تھی اور کسمسارہی تھی





تھی۔ زینو اپنے گھر سدھار گئی تو سکھ ہی سکھ تھا۔ صرف ایک حج کرنے کی خواہش تھی۔ اگر وہ چاہے تو اپنے گھر اور اپنے حبیب کے روضے کی زیارت کر سکتا ہے۔ وہ تو صرف بچکانہ نماز کے بعد گڑگڑا کر دعا ہی مانگ سکتا تھا۔

وظیفہ ختم کر کے مولوی صاحب نے بیچ منبر پر رکھی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے کرم داد کے پاس آئے۔

”بھائی کرم داد!“ انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”بڑی بُری خبریں سننے میں آرہی ہیں نمبردار کہہ رہا تھا کہ بھارت نے بھاری تعداد میں فوجیں پاکستان کی سرحد پر جمع کر دی ہیں میرا خیال ہیں کچھ بندوبست کر لینا چاہیے۔“

یہ کوئی نئی بات نہ تھی جسے سننے کے لیے انہوں نے کرم داد کو روکا تھا۔ ایک عرصے سے بھارتی فوجیں پاکستان کی سرحد پر جمع ہو رہی تھیں۔ اس نے سوچا لیکن یہ اس لیے تھا کہ کشمیر میں مجاہدین نے جنگ آزادی شروع کر رکھی تھی۔ بھارتی فوجوں کے اجتماع سے پاکستان کو کوئی خطرہ نہ تھا۔

”گھبراتے کیوں ہو مولوی جی! کوئی خطرے والی بات نہیں ہے“ اس نے مولوی صاحب کو دلاسا دیا۔

”میں گھبرا نہیں رہا ہوں بھائی!“ مولوی صاحب نے جواب دیا ”الحمد للہ مسلمان ہوں۔ خدا اور رسول ہمارا محافظ ہے کوئی ہمارا بال بیکا نہیں کر سکتا لیکن یہ تو حدیث شریف میں بھی ہے کہ کافر سے ہوشیار رہو۔ دشمن سے چوکنار ہنا تو حدیث رسول ہے۔“

”یہ تو ٹھیک ہے“ کرم داد نے کہا ”لیکن حکومت جو ہر دم چوکس ہے۔ آپ بالکل فکر نہ کریں کشمیر میں چاہے جو ہو پاکستان پر حملہ نہیں ہو سکتا۔“

”اچھا اللہ مددگار ہے“ مولوی صاحب نے بات ختم کی۔

جانے کب مالک حقیقی کا بلاوا آجائے۔ بیٹی کے سر پر ہاتھ کون رکھے گا۔ اچانک کہیں سے ایک کرن پھوٹی اور اسکی آنکھیں بجگانے لگیں۔ چوہدری چاچا نے رشتہ تو لگا یا ہی تھا۔ مہینے بیس دن تک لڑکے والے لڑکی کو دیکھنے آئی جانیں گے۔ خدا نے چاہا تو وہ اپنے گھر کی ہو جائے گی۔ پھر فکر کا ہے کی!

اس نے گھر پر ہی وضو کیا اور چادر کا ندھے پر رکھ کر زینو کو چگانے لگا۔

”اٹھ کھڑے! دن چڑھ آیا ہے“ اس نے کہا اور کلمہ پڑھتا ہوا باہر نکل گیا۔ زینو اٹھ بیٹھی اور سر ہانے دوپٹہ ڈھونڈنے لگی۔ کرم داد کی آواز سن کر چنداں کی آنکھ کھل گئی اور وہ بلند آواز سے کلمہ پڑھنے لگی۔

کرم داد باہر نکلا تو تجربہ کی ستم گری کے باوجود ہوا میں لطافت تھی۔ فضا آغوش کھولے سردی کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ مسجد کی سمت چل پڑا۔ دھندلا چھٹ رہا تھا اور روشنی کی چادر چار سو بڑھتی آ رہی تھی۔

وہ نماز پڑھ کر مسجد سے نکلنے لگا تو مولوی صاحب نے اُسے اشارے سے رُکنے کا کہا۔ وہ صحن میں رُک کر ان کے وظیفہ ختم کرنے کا انتظار کرنے لگا۔ بابا معراج دین پاس سے گزرا تو کہنے لگا ”چلو گے نہیں!“

”تم چلو مجھے مولوی صاحب سے بات کرنی ہے۔“ کرم داد نے کہا اور پیر کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگا۔ ”نہ جانے مولوی صاحب مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں؟“ وہ سوچ رہا تھا۔ وہ گاؤں میں پنہاری کی دکان کرتا تھا۔ تین چار روپے روزانہ بکری ہو جاتی، وہ اس سے مطمئن تھا۔ تین وقت پیٹ پھر روٹی مل جاتی، پہننے کو موٹا جھوٹا میسر آ جاتا۔ ایک بھینس تھی، دودھ دہی کے لیے کسی کی محتاجی نہ تھی۔ کسی سے لینا نہ دینا۔ مختصر سا کنبہ تھا۔ بیوی، بیٹی اور خود نیا تالا خرچ تھا، لے دے کر ایک زینو کی شادی کی فکر تھی سو یہ مشکل بھی آسان ہوتی نظر آرہی

دکان کھولی ہی تھی کہ حسب دستور کریم بخش آگیا۔ وہ علی الصبح حتے کا تمباکو لینے آتا تھا۔ کریم بخش شہر سے کپڑا لاتا اور اسے گاؤں میں گھوم پھر کر بیچا کرتا تھا۔ اس کی زبانی شہر میں پیدا ہونے والی خبروں کا تھوڑا بہت علم ہو جاتا تھا۔ درنہ گاؤں میں تو محض اتاج ہی پیدا ہوا تھا اور اتاج جسم کو تو پروان چڑھا سکتا تھا دماغ کو تو اتائی نہ دے سکتا تھا۔ رہے ریڈیو اور اخبار تو وہ اکاؤ کا گھروں میں تھے۔ پھر ان میں تو محض سرباز نظر آنے والی باتیں ہوتی ہیں، ڈھکی چھپی اور راز داری کی۔ گرم گرم خبریں تو زبانوں پر ہی چلتی ہیں۔ کریم بخش گاؤں کے ممبر نمبردار پنواری اور ڈاکیے کے بعد سب سے زیادہ باخبر آدمی تھا۔ گاؤں کے چوہدری بھی اس صفت سے محروم تھے۔

”سنا بھی کرم داد“ کریم بخش نے آتے ہی مولوی صاحب جیسے انداز میں کہا ”لڑائی کی تیاریاں زوروں پر ہیں۔“

”ارے بھی کیسی لڑائی کہاں کی لڑائی؟“ کرم داد نے چوکی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”اللہ کا نام لو“  
”کیسی لڑائی“ کریم بخش کو اس کی لاعلمی اور عدم واقفیت پر حیرت ہو رہی تھی۔ ”کہتے ہیں بھارت حملہ کر دے گا۔ شاستری نے دھمکی دے دی ہے۔“  
”ہونہا! دھمکی دے دی ہے لالہ کی دھمکی بس سنتے رہو“ کرم داد نے ہنس کر کہا۔

”ہندوؤں کو موت نے پکارا ہے کیا؟“  
”موت نے پکارا ہے تب ہی پاکستان پر حملے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔“ کریم بخش نے دانائوں کی طرح سر ہلا کر کہا۔

”شاستری کو پاکستان پر حملہ کرنے کے لیے دوبارہ جنم لینا پڑے گا“ کرم داد بھی کب دانائی میں کسی سے کم تھا۔

”اللہ مددگار ہے“ کرم داد نے تائید کہا اور مسجد سے باہر نکلا۔ کمیت جاگ گئے تھے۔ رہٹ چل پڑے تھے۔ گلیوں میں زندگی انگڑائیاں لے رہی تھی۔ صرف رات کا تھا کہ ہارا چوپال گھڑی دو گھڑی سستا رہا تھا۔ اسے پھر مستعد ہوتا پڑا۔ کرم داد راہ میں ملنے والے آکاؤ کا گاؤں والوں سے علیک سلیک کرتا دھیرے دھیرے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ مولوی صاحب کی باتیں اس کے ذہن سے نکل چکی تھیں۔ اب ذہن میں صرف چوہدری چاچا کا تصور بسا ہوا تھا۔ وہ ان کی کامیابی کی دعا میں مانگ رہا تھا۔

گھر میں داخل ہوا تو زینو دودھ بلو کر مکھن اُتار رہی تھی، جنداس چولہے پر روٹی سینک رہی تھی۔ وہ صحن میں پڑی چار پائی پر بیٹھ گیا۔ زینو کرم گرم روٹی پر مکھن اور لسی کا گلاس لیے آئی۔ جب وہ چنگیر چار پائی پر رکھ کر جانے لگی تو اس کی کمر پر بل کھاتی لمبی چوٹی کرم داد کو سانپ بن کر ڈس گئی۔ اچانک زینو کے سیاہ بالوں کی جگہ چوہدری چاچا کے سفید بال نظروں کے سامنے پھر گئے۔ ان کا جھریوں بھرا چہرہ سامنے آگیا۔ وہ تصور میں بارات آتے، شہنائیاں بجتے اور زینو کو ڈولی چڑھتے دیکھنے لگا اور دل میں مسکراتا رہا۔

روٹی کھا کر اس نے بلند آواز سے شکر الحمد للہ کہا اور کمرے میں جھانک کر جنداس سے کہنے لگا۔  
”کب آنے کو کہہ گیا ہے چوہدری چاچا؟“  
جنداس پچکنی منہ سے ہٹاتے ہوئے بولی۔  
”جیسے کا کہہ گیا ہے۔“

کون سا جعد؟“  
کرم داد کو بیوی کی سادگی پر ہنسی آگئی۔ پھر وہ خود ہی شرمندہ ہو گیا کہ انگریزی تاریخ کا حساب تو اسے خود بھی نہ آتا تھا۔ اسے تو محض چاند کے اُتار چڑھاؤ کا پتا تھا لیکن اس زمانے میں چاند کی تاریخوں کا حساب ہی کون رکھتا تھا۔ وہ اٹھ کر دکان پر چلا گیا۔

سیارہ ڈائجسٹ کا عظیم الشان نمبر



# رسول نمبر

کانیا ایڈیشن ضروری ترامیم و اضافہ کے ساتھ شائع ہو گیا ہے

- « سیرت پاک پر ایک جامع دستاویز « حسین و جمیل سرورق
- « بے شمار نعتوں کا انتخاب « عکسی طباعت
- « ہر جلد کے پانچ سو صفحات « 2 جلدوں پر مشتمل
- « دنیائے اسلام کے اہل علم کے رشحاتِ قلم کا مجموعہ

مکمل سیرت 320/-  
فی جلد 160/-

قارئین حضرات اپنے آرڈر سے جلد مطلع فرمائیں

منگوانے کا پتہ

سیارہ ڈائجسٹ 240 مین مارکیٹ ریواڑ گارڈن لاہور۔ فون: 7245412



لیے وضو کرنے لگا۔ پھر اس نے دُکان بند کی اور مسجد چلا گیا۔ دوپہر کے وقت گا ہک بھولے سے بھی نہیں آتے تھے۔ وہ ظہر کی نماز پڑھ کر مسجد میں ہی لیٹ جایا کرتا تھا۔ سلام پھیر کر مجاہدین کے حق میں دُعا مانگی گئی اور لوگ جانے لگے تو وہ لپک کر مولوی صاحب کے پاس گیا اور ان کے کان میں کہنے لگا۔

”مولوی صاحب! مبارک ہو جنوں فتح ہو گیا۔“  
 ”ہاں سنا میں نے بھی ہے“ مولوی صاحب نے بے یقینی سے کہا ”ہمیں غافل نہیں رہنا چاہیے۔“

کرم داد جھنجھلا گیا۔ ہمیشہ اُلٹی سوچتے ہیں مولوی صاحب۔ اس نے دل میں کہا اور صحن میں سائبان تلے جا بیٹھا۔ آج اسے غنودگی محسوس ہو رہی تھی۔ عصر کی نماز پڑھ کر دکان پر چلا گیا۔ مغرب تک دو چار گا ہک مٹی کا تیل لینے آہی جاتے تھے یا کسی کو پیٹھے چاول کھانے کی خواہش ہوتی تو گڑ لینے آ جاتا۔

آفتاب دھیرے دھیرے اپنی کرنیں سینٹنے لگا اور مل گجا بڑھ آیا۔ مغرب کی نماز پڑھ کر وہ سیدھا گھر چلا جاتا تھا۔ اگر اس وقت کسی کو کوئی چیز درکار ہوتی تو اس کے گھر چلا جاتا تھا۔ چیزوں کا سناک تو وہیں رکھا تھا۔ گھر پہنچا تو زینو روٹی پک رہی تھی۔ جندال پاس ہی بیٹھی گا ہے گا ہے چولہے میں کڑیاں ٹھیک کر رہی تھی۔ وہ بلا متوقع گھر میں ادھر سے ادھر پھرتا رہا۔ ایک پل چین نہ آتا تھا گھر پہنچنے پر جموں اور چوہدری چاچا گلدھڑ ہو گئے تھے۔ پھر وہ تھک ہار کر صحن میں چار پانی پر دراز ہو گیا۔ زینو روٹی لائی تو وہ اٹھ بیٹھا۔ جلد جلد روٹی کھائی اور باہر جانے لگا۔ وہ ہمیشہ عشاء کی نماز کے وقت باہر جایا کرتا تھا۔ اسے اس وقت خلاف معمول جاتے دیکھ کر جندال نے کہا ”کہاں چلے؟“

”یونہی ذرا چو پال تک!“ وہ اس پر اپنا لڑکپن ظاہر نہ کرتا چاہتا تھا۔ آج وہ عشاء کی نماز سے پہلے چو پال کا ایک آدھ چکر لگانا چاہتا تھا تاکہ کوئی تازہ خبر

”لیکن گڑ بڑ ضرور ہے!“ کریم بخش اپنی بات کرتی دیکھ کر افسردہ ہو گیا پھر وہ تباہ کو لے کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد کرم داد پھر چوہدری چاچا کے متعلق سوچنے لگا۔ بات سچی ہوگئی تو شاید بھینس بچ دینی پڑے۔ وہ تیل کے کنست پر صافی پھیر رہا تھا کہ نور دین آ گیا۔  
 ”لے بھی خوش خبری“ اس نے کہا ”جموں فتح ہو گیا۔“

”ہیں بچ!“ کرم داد خوشی کے مارے اچھل پڑا اور جھٹ مٹھی بھر بتا شے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا ”لے منہ میٹھا کر۔“  
 نور دین نے اس کی ہتھیلی سے دو تین بتا شے اٹھائے اور کہنے لگا۔  
 ”بالکل سچ خبر ہے۔“

”ریڈیو میں بتایا ہے؟“ کرم داد کی آواز مسرت سے کانپ رہی تھی نور دین ایک آنکھ میچ کر رازداری سے بولا۔  
 ”ابھی بتایا تھوڑے جانے گا لیکن خبر سچی ہے۔“  
 ”یاموللا! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے“ کرم داد چوکی پر ہی سجدہ شکر کرنے لگا۔ نور دین نے بتا شے چباتا چلا گیا۔

دن پوری آب و تاب سے چڑھ آیا تھا۔ ہوا میں تمازت رینک رہی تھی۔ فضا میں ستمبر کی بے کیفی کا احساس پھیل گیا تھا۔ پھر دوپہر ہوگئی اور جندال روٹی لے آئی۔ اس تمام عرصے میں کرم داد دکان پر آنے والے گا ہکوں کو بتا شے تقسیم کرتا اور اس خبر کو زینو کی شادی کے لیے نیک فال خیال کرتا رہا۔ جندال دیکھتے ہی بول پڑی۔ ”لے بھاگ بھریے! جموں مل گیا، نماز پڑھ کر مجاہدین کے لیے دُعا کیا کر۔“

جندال کو جموں کے محل وقوع کا خاک علم تھا لیکن وہ بھی خوش ہوگئی۔ کرم داد روٹی کھا چکا تو وہ خالی برتن اٹھائے مجاہدین کی کامیابی کی دُعا میں مانگتی چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد وہ ظہر کی نماز کے

اسے بھی علم تھا کہ کرم داد کو چوہدری چاچا کا شہت سے انتظار ہے۔ وہ بیٹی کو ڈولی چڑھا کر پائی پائی جوڑتا چاہتا ہے تاکہ اپنی زندگی کی آخری خواہش کو پورا کرنے کے لیے خانہ خدا کی زیارت کرے۔ روزہ مبارک کی چوٹ کو بوسہ دے۔ اس مقدس سرزمین کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر دل کی پیاس بجھائے۔ جہاں سرور کائنات ﷺ نے آنکھیں کھولیں، نعرہ حق بلند کیا اور اپنے محبوب سے جا ملے لیکن اس خواب کی تعبیر اس وقت پوری ہو سکتی تھی جب زینو اپنے گھر کی ہو جاتی باپ کو آتا دیکھ کر اس نے آنکھیں موند لیں۔ کرم داد نے ایک نظر اسے دیکھا اور چارپائی پر دراز ہو گیا۔

وہ عموماً دو چار کروٹیں بدل کر نیند کی آغوش میں پہنچ جاتا تھا۔ لیکن اس رات نہ جانے کیوں نیند اچاٹ ہو گئی تھی۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے اور ذہن نہ جانے کن تنگ و تاریک سرنگوں میں بھٹک رہا تھا۔ جن میں داخل ہونے کا راستہ تو تھا، باہر نکلنے کا کوئی راہ بھائی نہیں دیتی تھی۔ ایسی ہی ایک سرنگ میں اسے ایک سایہ ریختا نظر آیا جو دیواروں سے دیوانہ وار سرگراں رہا تھا اس کا جی چاہا کہ سائے کا پیچھا کرے لیکن وہ تو ایک چھلاوہ تھا۔ جب وہ اس کے قریب پہنچتا تو وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ کہیں دُور نظر آتا۔

اچانک کہیں بجلی کوندی اور اس نے دیکھا کہ سایہ تو زینو تھی، اس کی بیٹی زینو!

”زینو! وہ چلا یا۔“

”چاچا! زینو اپنی چارپائی سے ہڑبڑا کر اٹھی جنداس بھی گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔“

”کیا بات ہے زینو!“ جنداس بولی۔

زینو منہ سے کچھ نہ بولی، چپ چاپ باپ کو دیکھتی رہی۔ کرم داد آسمان کو تنک رہا تھا۔ اسی وقت

رہ گئی ہو تو سن لے۔ وہ چوپال سے گزرا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ عشاء کی نماز میں ابھی وقت تھا۔ وہ وقت گزارنے کے لیے دکان پر چلا گیا۔ دراصل اسے نور دین یارجم بخش سے ملنے کی خواہش ہو رہی تھی لیکن وہ ان کے گھر جا کر اپنی بے تابی کا اظہار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ چوپال واحد جگہ تھی جہاں ریڈیو اخبارات اور سینہ گزٹ خبریں سن آتی تھیں۔

دکان پر بیٹھے بیٹھے عشاء کی اذان سنائی دی اور وہ دکان بند کر کے مسجد چلا گیا۔ نماز سے فارغ ہو کر اسے ایک گونہ اطمینان سا محسوس ہوا۔ اب لوگ چوپال کی طرف جا رہے تھے۔ سب بڑے بوڑھے جمع ہوئے۔ حقے تازہ کیے گئے اور کریم بخش شہر سے لائی ہوئی خبریں بانٹنے لگا۔ نور دین اس کی باتیں بڑے دھیان سے سن رہا تھا۔ اسے ان ہی خبروں کو ہیر پھیر کر اپنی طرف سے پیش کرنا تھا۔ دیر تک قیاس آرائیاں ہوتی رہیں۔ محفل برخاست ہو گئی اور سب اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوئے۔

کرم داد کے دن دکان پر اور راتیں چوپال میں گزرتی رہیں نہ تو جموں فتح ہونے کی تصدیق ہوئی نہ چوہدری چاچا لڑکے والوں کو لیکر آئے۔ مجاہدین کی پیش قدمی کی خبریں بدستور آتی رہیں لیکن کرم داد جموں اور چوہدری چاچا دونوں سے ناامید ہو گیا تھا۔ زینو کی پس پردہ چلی جانے والی فکر پوری شدت سے عود کر آئی تھی۔ گاؤں میں ایسا کوئی لڑکا نہ تھا جو گجھو ہوں میں چلتا۔ جو تھے وہ پہلے ہی شادی شدہ تھے۔ نماز کے بعد جب بلند آواز سے مجاہدین کی کامیابی اور پاکستان کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگی جاتیں تو وہ دل ہی دل میں زینو کے رشتے کے لیے گڑگڑا کر دعا مانگتا۔

ایک رات وہ چوپال سے لوٹا تو جنداس سو رہی تھی۔ زینو چارپائی پر لیٹی کچھ سوچ رہی تھی۔ وہ اتنی نادان بھی نہ تھی کہ باپ کے ٹھکرات کو نہ سمجھ سکتی۔

کرم داد جب جنداں اور زینو کو گھسیتا ہوا مسجد کے قریب پہنچا تو اس کے من میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ دروازے پر دھکا چیل ہو رہی تھی کسی کو ہوش نہ تھا نفسا نفسی کا عالم تھا۔

کرم داد کے حواس اب تک قابو میں نہ تھے۔ اس نے چلا کر کہا ”ارے سارے ایک جگہ کیوں اکٹھے ہو رہے ہو یہاں سے نکلنے کا راستہ بھی نہیں ملے گا کہیں ادھر ادھر چھپ جاؤ صبح تو ہو لینے دو یہ کہہ کر وہ جنداں اور زینو کو لیے اندازے کے مطابق کماد کے کھیتوں کی طرف بڑھنے لگا۔ جن لوگوں نے اس کی آواز سن لی تھی اور اس کا مشورہ قبول کر لیا تھا، وہ بھی ادھر ادھر ہو لیے، لیکن انہیں اس بات کا علم نہ تھا کہ چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔ گاؤں میں چاروں طرف بھارتی ٹینک پھیل گئے تھے۔

کرم داد چند قدم ہی چلا ہوا کہ گولیوں کی بو چھاڑ ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی فضا میں کئی دلدوز چٹخیں گونجیں۔ وہ بیوی اور بیٹی کو لیے ایک درخت کی آڑ میں دب گیا۔ گولیاں چلنی بند ہو گئیں تو اس نے سرگوشی میں انہیں گھنٹوں کے بل رینگنے کا کہا۔ اسے معلوم تھا کہ کھیت شمال میں تھے اور کھیتوں میں ٹینک نہیں جاسکتے تھے۔ کھیتوں میں سے گزر کر ساتھ والے گاؤں میں پہنچنا ممکن تھا بشرطیکہ اس پر بھی بھارتی میڈیٹوں نے رات کی تاریکی میں قبضہ نہ کر لیا ہو۔ کرم داد کو اپنی فوج کا خیال آیا وہ یہاں سے کتنے فاصلے پر کہاں ہوگی۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ صبح تک یہاں پہنچ جائے اور انہیں ان درندوں سے نجات دلوائے۔

تینوں گھنٹوں کے بل آہستہ آہستہ رینگ رہے تھے۔ جنداں اور زینو خوف اور دہشت سے قہر قہر کانپ رہی تھیں۔ جنداں کے لیے اس طرح چلنا دو بھر تھا لیکن کرم داد اسے گھسیت رہا تھا۔ اچانک ایک گولی سنناتی ہوئی آئی اور کرم داد کو یوں لگا جیسے

بادل گرجنے لگے بجلی رہ رہ کر چمکنے لگی۔ مگن گرج سے کانوں کے پردے پھٹے جاتے تھے۔ فضا میں روشنی کے گولے پھٹ رہے تھے۔ ایک دم چار سو روشنی پھیل جاتی اور ہیبت ناک گرج میں ڈوب جاتی۔

کرم داد گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ پسینے میں شرابور تھا۔ سانس زور زور سے چل رہی تھی۔ یہ سب کیا تھا؟ بادل، بجلی، گرج، دھماکے اور اس کے ساتھ چیخ و پکار۔ آہ و بکا۔ شور و غل۔ یہ سب اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں سن ہو رہے تھے اور ذہن ماؤف ہوا جا رہا تھا۔

اچانک بہت سے لوگوں کے بھاگنے کی آواز سنائی دی۔ کرم داد اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ نہ کہیں بادل تھا نہ بجلی لیکن دھماکے اور روشنی کے گولے!! کچھ لوگ بھاگتے ہوئے اس کے پاس سے گزرے ”ہندوستانی فوج گاؤں میں گھس آئی ہے“ کسی نے کہا۔

”کرم داد جان بچا اپنی بھاگ“ ایک طرف سے آواز آئی۔

دفعتاً ایک گولہ اس سے کچھ فاصلے پر آکر پڑا۔ اس کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ وہ بھاگ کر اندر گیا۔ جنداں اور زینو ایک دوسرے سے چٹنی کھڑی تھیں۔

”جنداں زینو“ نکلوا بھاگو“ اس نے ہانپتے ہوئے کہا ”بھارت نے حملہ کر دیا ہے“۔

زینو اپنی جوتی دھوٹنے لگی لیکن کرم داد ایک ہاتھ سے اسے دوسرے سے جنداں کو کھینچا ہوا باہر نکل گیا۔

ہر طرف افراتفری مچی تھی۔ عورتوں اور بچوں کے رونے پینے کی فلک شگاف آوازیں گونج رہی تھیں۔ بھگدڑ مچ گئی تھی۔ گھروں سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ لوگ ایک ہی سمت میں بھاگ رہے تھے۔ ان کی امیدوں کا واحد مرکز خانہ خدا تھا۔ سب اس میں پناہ لینے بھاگے جا رہے تھے۔



لوگوں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ وہ یہاں سے کس طرح آگے بڑھے۔ اسے سخت پیاس لگ رہی تھی۔ آنکھوں کے آگے تارے ناچ رہے تھے۔ اسے موت کا کوئی خوف نہ تھا لیکن وہ جتناں اور زینو کو مصیبت میں چھوڑ کر ابھی مرنا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے ہمت کر کے رینگنے کی کوشش کی۔ ابھی اس نے جسم کو تھوڑا سا سر کیا ہی تھا کہ اسے سامنے زمین پر دوسرے نظر آئے۔ اس نے سرگھا کر دیکھا دو سکھ سپاہی رانقلیں تانے کھڑے تھے۔

”تو ابھی تک زندہ ہے؟“ ایک نے رانقل کا کندا اس کی پشت پر مارا اور وہ بلبلاتا تھا۔

”اسے گولی مار دو آرام سے مرے گا“ دوسرے نے کہا۔

”دیکھتے نہیں کتنی تکلیف میں ہے۔“

”اگر آرام سے مرنے دیا گیا تو کیا مزا آئے گا“ پہلے نے مکروہ قہقہہ لگایا ”اسے تڑپ تڑپ کر مرنے دو۔“

”تھہرؤ ذرا پوچھیں کہیں مال وال تو نہیں چھپا رکھا ہے؟“ دوسرے نے کہا اور کرم داد کے پاس اکڑوں بیٹھ گیا۔

”کیوں مسئلے!“ اس نے کرم داد کی گردن پکڑ کر کہا۔

”تیری جو رو، بیٹی بھی ہے؟“

کرم داد کی آنکھوں میں خون اتر آیا لیکن اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

”اگر ہوگی بھی تو بتائے گا تھوڑے ہی“ دوسرے نے اس کی پشت پر رانقل کا کندا مارا اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی ”یا مولا! یا مولا“ دونوں فوجی کھکھلا کر ہنس پڑے۔

”بلانا اپنے مولا کو ذرا“ ایک نے کہا ”رانقل بہت مضبوط ہے“ کرم داد نے جواب نہ

اس کی ٹانگ آگ کے شعلوں میں جا پڑی ہو۔ ”میری ٹانگ“ اس کے منہ سے نکلا اور درد کی شدت سے کچھ نہ کہہ سکا، اسے زکا دیکھ کر زینو نے ہولے سے کہا:-

”چاچا“

کرم داد اپنے درد کی شدت بھول گیا۔ ”بیٹی! تم جتناں کو لے کر کھیتوں میں جاؤ میں پیچھے پیچھے آ رہا ہوں“ اُس نے بہ مشکل کہا۔

”لیکن..... چاچا“ زینو کو کیا معلوم تھا کہ اس کے باپ کی ایک ٹانگ ناکارہ ہو چکی تھی۔

”وقت مت ضائع کرو“ جو کہتا ہوں وہ کرو، جلدی سے نکل جاؤ“ اس نے کراہتے ہوئے کہا۔

زینو ماں کو کھینچتی آگے بڑھ گئی۔ کرم داد اپنی زخمی ٹانگ لیے ایک ایک انچ بڑھنے لگا۔ اس نے ہاتھ لگا کر دیکھا دھوئی خون میں لت پت ہو گئی تھی۔ درد کی ٹیسیں ناقابل برداشت تھیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا اور وہ غش کھا کر گر پڑا۔

جب اسے ہوش آیا تو دن کی روشنی پھیل چکی تھی اس نے گرد و پیش پر نظر ڈالی کئی لاشیں پڑی تھیں۔ زمین خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ اس نے سراٹھا کر دیکھا۔ چاروں طرف بھارتی فوجی پھرتے نظر آئے۔ دائیں سمت چند ٹینک اور بہت سی چھوٹی بڑی توپیں دکھائی دیں۔ وہ کھیتوں سے ابھی بہت دُور تھا۔ اسے فکر لاحق ہوئی کہ نہ جانے جتناں اور زینو وہاں پہنچ بھی سکی ہیں یا نہیں۔ وہ درد کی شدت سے تڑپنے لگا۔ چلنا تو کجا اٹھنا بھی نامکن تھا۔ فضا میں سکوت طاری تھا۔ کہیں سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ اسے یہ جاننے میں دیر نہ لگی کہ گاؤں پر بھارتی فوج کا مکمل قبضہ ہو چکا تھا۔ اب کیا ہوگا؟ جتناں اور زینو کہاں ہوں گی؟ ان پر اور گاؤں کے دوسرے

آسمان پر کتوے اور گدھ منڈلا رہے تھے۔ آج ان کی بن آئی تھی۔ وہ مردار جانور کا سڑا ہوا گوشت کھا کھا کر تک آگئے تھے۔ آج انسانوں کا تازہ تازہ گرم لذیذ گوشت ان کا کھاجا بن رہا تھا۔ زمین پر پڑے ہوئے انسانوں میں وہ بھی تھے جن کی روح کا جسم سے ناطہ ٹوٹ چکا تھا اور وہ بھی جواب تک سک رہے تھے بھارتیوں کی گولیوں سے بچ رہنے والے ان کی سنگدلی سے تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہے تھے۔ خوش نصیب تھے وہ مرد جن کی بیٹیاں اور بہنیں ان کی آنکھوں کے سامنے خاک و خون میں تڑپ کر ٹھنڈی ہو چکی تھیں اور بد نصیب تھے وہ جن کی بیٹیاں اور بہنیں ابھی زندہ تھیں۔ بھارتی فوجیوں کے لیے سامان نشاط بننے پر مجبور کی گئی تھیں۔ نہ جانے کتنے کرم دادا اپنی اپنی زینوں کے لیے تڑپ رہے تھے۔

ایک گدھ کرم داد کے سر پر دیر سے منڈلا رہا تھا۔ کرم داد کے ہونٹ آہستہ آہستہ بل رہے تھے۔ کچھ دور زمانہ چھین اور بھارتی فوجیوں کے قہقہے گونج رہے تھے۔ چھین اور قہقہے بدستور گونجتے رہے۔ کرم داد کا خون کھول رہا تھا لیکن وہ مجبوریوں کی اٹھاہ گہرائیوں میں گہرا ہوا تھا۔

معا اس کے کانوں میں اللہ اکبر کی آوازیں گونجیں اور ساتھ ہی گولہ باری سے کان کے پردے پھٹنے لگے۔ بھارتی سپاہی ہڑ بڑا کر مورچے سنبھالنے لگے۔ پاکستانی فوج پہنچ چکی تھی۔ کرم داد کے چہرے پر سرخی دوڑنے لگی اور وہ سر اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ منہ ہی منہ میں پاکستان کی فتح و نصرت کی دعائیں مانگنے لگا۔ پاکستانی فوجی ابھی دور تھے۔ آسمان پر منڈلانے والے گدھ قریب تھے۔ زندگی کی آخری منزل قریب تھی۔ پھر اس کے ہونٹ ہلنے بند ہو گئے۔ ایک گدھ قریب، اور قریب آگیا!



دیا اور کراہتا رہا۔ اگر کسی لڑکی وڑکی کو کہیں چھپا رکھا ہے تو بتا دے۔ تیری مہم پٹی بھی کر دیں گے اور کھانا بھی دیں گے۔ ورنہ تڑپ تڑپ کر مر جائے گا۔ ایک نے ہمدردی جتائی، کرم داد نے پھر نفی میں سر ہلادیا۔ اکڑوں بیٹھے ہوئے سپاہی نے اس کے سر کو بالوں سے پکڑ کر دو تین مرتبہ زمین پر پٹکا اور جھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

کرم داد کے ماتھے سے خون بہنے لگا اور بلند آواز سے کلمہ پڑھنے لگا۔ دوسرے سپاہی نے اس کی کمر پر لات ماری اور دونوں چلے گئے۔ ”یا رسول اللہ!“ کرم داد نے کراہتی ہوئی آواز سے دہائی دی۔

”میری بیٹی کی عزت بچاؤ۔“

”یا مولا مجھ سے پہلے چنداں اور زینو کو موت دے دے۔“ اس کی دم توڑتی ہوئی زندگی کی ایک ہی خواہش تھی کہ زینو مر جائے۔ جس بیٹی کو ڈولی چڑھانے کا ارمان سالہا سال سے سینے میں دبائے وہ بارگاہ ایزدی میں شب و روز دعائیں مانگا کرتا تھا آج اس کی موت کے لیے گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہا تھا۔ اب اسے چوہدری چاچا کا انتظار نہیں تھا۔ اسے بارات دیکھنے اور شہنائیوں کی آواز سننے کی تمنا نہیں تھی۔ اسے زینو کے جوڑے بنانے کے لیے بھیس بیچ دینے کی فکر نہیں تھی۔ اسے اس لمحے زندگی اور موت کے دوراے پر، اپنی اکلوتی، لاڈلی بیٹی کے لیے دگر زمین اور لٹھے کے ٹکڑے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو چاہتا تھا کہ وہ کہیں کسی کھیت میں مرجائے اور اس کی بے گور و کفن لاش کو کتے اور گدھ کھا جائیں۔ اسے اپنی بیوی کی بوڑھی ہڈیوں کی فکر نہیں تھی۔ بیٹی کے جوان جسم کا تحفظ مقصود تھا۔ اس سے کچھ بن نہ پڑا تو زمین پر سر پھٹنے لگا۔



## اسماء الحسنیٰ کامیابی کا راستہ

پیر شاہ محمد قادری

تجويز فرمائيے۔ آپ کی دعاؤں کی طلبگار۔ آپ کی بہن  
☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ آپ کو اور تمام بہن  
بھائیوں کو اپنی رحمتوں اور برکتوں کے سائے میں رکھے  
آپ سب کی حوصلہ افزائی ہے جو کہ اتنا بڑا دینی  
پروجیکٹ پایہ تکمیل کی جانب رواں دواں ہے۔ آپ  
سب کی دعاؤں کا بے حد شکریہ آپ کے بچوں کے  
لئے امتحانی کامیابی اور خیر و برکت کیلئے لوح عطار د

شکلیہ تبسم۔ کراچی  
O محترم! میرا ایک مسئلہ ہے کہ میرے بچے بہت  
ذہین ہونے کے باوجود بعض اوقات ٹیسٹ میں پیچھے  
رہ جاتے ہیں۔ عام حالات میں وہ بہت اچھے نمبر  
لیتے ہیں مگر جب انہیں یہ بتا دیا جائے کہ آج امتحان  
ہے ٹیسٹ ہے تو پھر وہ پتا نہیں کیوں خوفزدہ سے  
ہو جاتے ہیں، اس صورت حال کے لئے کوئی نقش



اللہ تعالیٰ کرم فرمائیں گے۔ انشاء اللہ

عفراء خاتون۔ کوٹ عبدالمالک لاہور

محترم! گزشتہ طویل عرصے سے عجیب سی کیفیت رہتی ہے یوں لگتا ہے کہ جیسے کوئی اندر ہی اندر کبجہ کھرچ رہا ہے گھر میں عجیب قسم کی بدبو کا احساس ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے کاموں میں رکاوٹ پڑتی ہے یوں لگتا ہے کہ جیسے کسی نے ہمیں ان دیکھی زنجیروں میں جکڑ لیا ہے۔ بیٹی کی نسبت جہاں ڈیڑھ سال سے طے نمی انہوں نے اچانک بغیر کسی معقول وجہ کے رشتے سے انکار کر دیا بیٹے کا اقامہ اچانک کنسل ہو گیا شوہر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور ٹانگیں ٹوٹ گئیں ایک دن اچانک ایسا شارت سرکٹ ہوا کہ فریج، ٹی وی، مائیکرو ویو اوون گیزر سب بھک سے جل گئے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے نادیدہ بلاؤں نے چاروں طرف سے اپنا حصار کر لیا ہے۔

آپ ازروئے استخارہ کچھ ارشاد فرمائیے اور اس صورتحال کا تدارک کے لیے کچھ کیجئے۔ بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ سخت قسم کی بندش اور سفلی علم کیا گیا ہے سمجھ نہیں آتا کہ ہم سے کیا گناہ کیا نصیر ہو گئی ہے جو زندگی یوں عذاب کی لپیٹ میں ہے۔

☆ عزیز بہن! ازروئے استخارہ یہ تشخیص درست ہے کہ آپ حقیقتاً سفلی اور آئینی معاملات میں مبتلا کر دی گئی ہیں۔ اب اس کا غالباً آپ کا کسی خاص معاملے میں انکار تھا بہر کیف ظالم کا قہر اللہ کی رحمت کاملہ کے آگے کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے آپ ذاتی طور پر ”عمل اتار“ اور متعلقہ نقوش دفتر سے منکوالیں سورہ بقرہ کی تلاوت کثرت سے کیجئے۔ اور گھر میں باقاعدگی سے شیخ وقتہ اذان اور نماز کی طرف توجہ دیجئے۔ انشاء اللہ حالات میں فرق پڑ جائے گا۔

سہیلہ کریم۔ کراچی

☆ محترم! اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ مخلوق خدا آپ

ارسال کی جا رہی ہے۔ بروز جمعہ سورہ الجمعہ تین مرتبہ پانی پڑم کر کے پلایا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔

☆ سمر۔ شیخوپورہ

☆ آپ اپنی صحت کے لئے کسی اچھی لیڈی ڈاکٹر سے مشورہ کیجئے۔ بھائی کے لئے علاج درعقیم کے سلسلے میں دوبارہ میڈیکل رپورٹس کے ساتھ خط لاہور کے پتے پر لکھیں۔

☆ صدف جاوید۔

☆ عزیز بہن! دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے شوہر کو ہدایت دے (آمین) آپ بکثرت ”باعزیز یا قدوس“ پڑھا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ آپ لاہور کے پتے پر براہ راست بھی خط لکھ سکتی ہیں۔ دعاؤں کا شکریہ

☆ ع۔ ر۔ اوسلو ناروے

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ آپ کی ازدواجی ناہمواری کو بہتر فرمائے (آمین) ازروئے استخارہ اس فیصلے کے نتیجے میں کافی مسائل جنم لیں گے۔ اس لئے بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھائیں بکثرت ”یا ستار“ پڑھا کریں۔ آپ لاہور کے پتے پر براہ راست خط بھیج سکتی ہیں میرا ذاتی فون نمبر 92300-8425381 پاکستانی وقت کے مطابق صبح 10 بجے تا رات 10 بجے تک کال کر سکتی ہیں۔ دعاؤں کا شکریہ

☆ ہانیہ۔ آزاد کشمیر

☆ آپ کے معاملات میں خصوصاً بیرون ملک کے سفر میں تاخیر ہے۔ ”یا فتاح“ بکثرت پڑھیں۔ نماز کی پابندی کیجئے۔

☆ روشن رحمان۔ سرگودھا

☆ عزیز بیٹی! مایوس نہیں ہوتے بکثرت ”یا وہاب“ پڑھا کریں۔ حسب توفیق صدقہ دیں۔

کرتی ہے لیکن میں اس کے ساتھ بدسلوکی کرتا ہوں پھر بعد میں پچھتا ہوں مجھے کوئی ایسا اسم الہی عطا کریں کہ جس سے میں نرم مزاج ہو جاؤں میری خامیوں کی اصلاح ہو سکے۔ میں نے آپ کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے اس امید پر کہ آپ کے در سے خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔ میری مدد کیجئے آپ کا پرستار ادنیٰ خادم آپ کی نظر کرم کا شدت سے منتھی۔

☆ عزیزم! اللہ تعالیٰ آپ کی اور ہم سب کی اصلاح فرمائے اور ہماری بھلائی کے راستے کھول دے (آمین) جب انسان کے اندر اصلاح کی خواہش ہو خود کو بدلنے کی کج آرزو ہو تو اللہ تعالیٰ یقیناً مدد فرماتا ہے آپ کوشش کریں کہ زیادہ سے زیادہ با وضو رہا کریں اور بکثرت ”یا قدوس“ پڑھا کریں لوح اسم ذات برائے اصلاح اور روحانی ترقی کے لئے ارسال کی جارہی ہے نماز کی پابندی فرمائیں۔

مریم کوثر۔ اسلام آباد

○ محترم! گزشتہ کافی عرصے سے شدید پریشان ہوں سمجھ میں نہیں آتا کہ کس سے مشورہ لوں، ایک خاتون نے مجھے آپ کا کالم پڑھوایا۔ ایسا لگا کہ جیسے اندھیرے میں روشنی مل گئی۔ میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے مقامی دفتر میں کام کرتی ہوں وہاں مجھے ایک کو لیگ نے پر پوز کیا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کیونکہ میں اپنے بہن بھائیوں کی پرورش کا عزم لیکر گھر سے نکلی تھی اور تیسرے ہی مہینے میں کس طرح اپنے مقصد سے بے وفائی کر سکتی تھی۔ مگر اس کا اصرار بڑھتا ہی گیا پھر ایک وقت ایسا آیا کہ میں اس سے گریز نہ کر سکی اور اس سے اقرار کر بھی لیا مگر میں نے اس کو اپنے سارے حالات بتا دیئے کہ میں تم سے محبت تو کر سکتی ہوں مگر کم از کم چھ سات سال شادی نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اس وقت تک میرے بہن بھائی پڑھ لکھ کر کسی قابل ہو سکیں گے اس نے فوراً ہی

کے بنائے ہوئے دغائے صفحہ اسلامی طریقے سے فیض یاب ہو رہی ہے۔ ہماری تو ہر سانس میں یہی دعا نکلتی ہے کہ آپ اور تمام اہل خانہ دین، ایمان، اور مقامات دنیا میں ہمیشہ عروج پر فائز رہیں۔ میرا ایک مسئلہ یہ ہے کہ میں ہر بات میں بہت جلدی گھبرا جاتی ہوں۔ بچوں کو اسکول سے دیر ہو جائے میاں اگر کسی مہمان کو باہر چھوڑنے کے لئے جائیں، نوکرائی کسی دوسری نوکرائی سے کھسک پھسر کرے تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے کوئی سازش ہو رہی ہے سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ایسا کیوں ہو گیا ہے حالانکہ پہلے تو میں ایسی نہیں تھی۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میری بیٹی کی شادی کا مسئلہ کسی صورت حل نہیں ہو رہا ہے۔ لہذا آپ اس حوالے سے مجھے کوئی نقش یا لوح عنایت فرمائیں۔ گیارہویں شریف کے لئے پچیس ہزار مرتبہ درود شریف اس کو میری جانب سے شامل کر لیجئے گا۔

اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ اپنے حفظ و امان میں رکھے (آمین) آپ کی بہن۔ آپ کے لئے ہمیشہ دعا گو!

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ آپ سب کو بھی ہمیشہ عافیت کی چھاؤں میں رکھے (آمین) آپ ہر نماز کے بعد ”یا قوی یا سلام“ 125 مرتبہ پڑھ کر دعا کر لیا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ آپ کی کیفیت کے پیش نظر آپ کو لوح اسم ذات ارسال کی جارہی ہے۔ حسب ہدایت استعمال سے آپ کے خوف اور ڈپریشن میں کمی آجائے گی۔ انشاء اللہ

مراد بخش۔ کوٹلی لوہاراں

○ محترم! میری پریشانی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ میں مستقل مزاج نہیں ہوں۔ وہمی اور شکلی بھی ہوں، بات بات پر غرہ کرتا ہوں اور ایمان داری سے اپنا تجزیہ کروں تو آپ کو صاف صاف کہہ دوں کہ میں جلد باز، غصہ ور، کینہ پرور، اور کنجوس ہوں۔ میری بیوی بہت اچھی ہے میری ساری خامیاں برداشت

ایک گلاس پانی بھی دے نہیں سکتے۔ میرے شوہر نے میری تنخواہ کو بھی ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ کہتے ہیں کہ تم پہ یہ ساری مصیبت میری وجہ سے آئی ہے، ان کی باتوں میں سچائی بھری ہے۔ میں والدہ کو ماننا چاہتی ہوں۔ کوئی ایسا اسم بتائیے کہ جس سے میری ماں مجھ کو واپس مل جائیں کوئی لوح عنایت کر دیں تو بہت ہی مہربانی ہوگی۔ اس کے علاوہ میں چاہتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اولاد کی نعمت بھی عطا فرمادیں۔ آپ کی بیٹی محتاج دعا۔

☆ عزیز بیٹی! اللہ تعالیٰ آپ پر فضل و کرم فرمائے (آمین) بنیادی طور پر آپ نے کوئی شرعی اعتبار سے غلطی یا گناہ نہیں کیا مگر آپ نے چونکہ ان کے علم میں لائے بغیر یہ کام کیا اس لئے ان کی ناراضگی ہوئی دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ آپ کے والد کے انتقال کے بعد انہوں نے تمام توقع آپ سے وابستہ کر لی تھی اس حوالے سے بھی ان کا رد عمل شدید ہوا۔ تاہم خوشی اس امر کی ہے کہ آپ کے شوہر آپ کے معاملات میں آپ کے ساتھ عمل تعاون کر رہے ہیں آپ ہر نماز کے بعد ”یا عزیز یا قدوس“ پڑھا کریں 140 مرتبہ اول آخر 11 مرتبہ درود شریف والدہ کے لئے لوح تسخیر خاص اور اولاد کے لئے علاج در عقیم ارسال ہے دعاؤں کا شکریہ محمد ادریس۔ راولپنڈی

○ محترم! آج سے 7 سال پہلے میری نوکری بہت اچھی تھی میں نے نوکری چھوڑ کر پراپرٹی کا کام شروع کر دیا جس میں، میں نے بہت پیسا کمایا میرا کام زیادہ فائلوں کا ہوا کرتا تھا جتنے لوگوں کو میں نے فائلیں دلوائیں تھیں ان کو شروع میں تو منافع ہوا لیکن اب ان فائلوں کے ریٹ کافی کم ہو گیا ہے میں نے بھی جو پیسہ کمایا اس پیسے کی فائلیں خرید لی تھیں۔ اب نہ روزگار اور نہ کوئی سرمایہ ہے کہ کوئی کاروبار کر سکوں

اس صورت حال کو قبول کر لیا کیونکہ اس پر بھی بہت ذمے داریاں تھیں۔ اس کے بعد یوں ہوا کہ اس کا ایک دوست آسٹریلیا چلا گیا اور اپنا فلیٹ اس کو دے گیا کہ تم بہت دور رہتے ہو یہاں رہا کرو اس طرح تمہیں ہر ہفتے گاؤں آنے جانے سے نجات مل جائے گی۔ وہ بہت خوش ہوا، پھر اس فلیٹ کو میں نے سچایا سنوارا۔ وہ کہنے لگا گھر مل گیا ہے چاہے عارضی طور پر ہی سہی (یہ عارضی سال کم از کم پانچ سال تھے) ہم لوگ اکثر ویک اینڈ اکٹھا گزارتے اور اس سے پہلے کہ جذبات کے ہاتھوں کوئی غلطی کرتے ہم نے باہمی رضامندی سے نکاح کر لیا۔ بد قسمتی یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ ایک دن میری والدہ نے مجھے اس کے ساتھ گھومتے دیکھ لیا پھر انہوں نے کوشش کر کے میرا فلیٹ بھی دیکھ لیا پھر ایک دن وہ فلیٹ پر آ پہنچیں۔ اب وہ سخت ناراض ہیں انہوں نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ حالانکہ میں نے اور میرے شوہر نے ان سے پاؤں پکڑ کر معافی مانگی، ہمارے دو تین کولیک جو اس صورت حال سے واقف تھے انہوں نے نکاح کی گواہی دی، نکاح نامہ دکھایا مگر میری والدہ کی ناراضگی برقرار رہی۔ خدا گواہ ہے کہ اب تک میں نے گھریلو اخراجات میں کوئی کمی نہیں کی۔ اور ہمیشہ انہیں پیسے دینے کی کوشش کی۔ مگر وہ مجھ سے پیسے نہیں لیتی ہیں، اس قدر تنگی ترشی میں وقت گزار رہی ہیں کہ کیا بتاؤں آج اس خط کو لکھنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے کسی گھر میں کھانا پکانے پر تن دھونے کی نوکری کر لی۔ میرے چھوٹے چھوٹے بھائی مجھ سے ملنے کے لئے ترستے ہیں۔ مگر ماں کو چھوڑ نہیں سکتے۔ وال چٹنی کھا لیتے ہیں مگر مجھ سے پیسے لینے کی انہیں اجازت نہیں ہے ماں نے مجھے بہن بھائیوں سے ملنے سے نہیں روکا مگر میں ان سے مل کر کیا کروں، جب وہ مجھے



سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور بے مثال پیشکش

# آثارِ قیامت نمبر

شائع ہو گیا ہے

قیمت: 75 روپے

✧ ”علاماتِ قیامت“ قرآنِ کریم اور صحیح احادیث رسولؐ کی روشنی میں  
 ✧ واقعہ شق القمر..... سونے کا پہاڑ..... دم دار ستارے..... لشکرِ سفیانی کو  
 شکست..... ظہورِ امام مہدی اور امام مہدی کی جنگیں..... قومِ لوط.....  
 قومِ عاد..... ہیکلِ سلیمانی کی تعمیر نو..... فراموش کردہ شہرِ ریت کا سمندر  
 ✧ فتنہء دجال..... پیغمبروں کی سرزمینِ عراق پر صلیبی امریکی حملہ جیسی  
 قیامت کی نشانیوں پر مکمل تفصیلات!  
 ✧ گوانتا نامو بے میں عیسائیوں کے ہاتھوں قرآن مجید کی بے حرمتی اور  
 عالم اسلام کی خاموشی سے قیامت کا تعلق

یہ ایک علمی، تاریخی، تحقیقی اور دلچسپ دستاویز ہے جس کے بغیر آپ کی لائبریری نامکمل ہے

سیارہ ڈائجسٹ 240 ریڈار گارڈن لاہور فون: 042-37245412

میری مدد فرمائیں۔  
☆ ”یا وہاب یا قح“ بکثرت پڑھا کریں۔ نماز کی پابندی فرمائیں۔ لوح مشتری ارسال ہے۔  
تمیرا ثار۔ چوک اعظم  
○ محترم! اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میری شادی کو پانچ سال ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک اولاد کی نعت میسر نہیں آئی ہے۔ شادی کے پہلے سال تین ماہ کے بعد حمل ضائع ہو گیا تھا۔ پھر اس کے بعد آج تک کوئی معاملہ نہیں ہوا ہے۔ جبکہ طبی اعتبار سے ہم دونوں بالکل فٹ ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ محفل دعا میں ہمارے لئے اولاد کی دعا بھی فرمائیں اور اس حوالے سے مجھے روحانی علاج بھی تجویز فرمائیے۔  
آپ کی بیٹی۔ ہمیشہ آپ کے لئے دعا گو  
☆ عزیز بیٹی! اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیشہ آپ کے گھر کو شاد و آباد رکھے (آمین) آپ ہر نماز کے بعد 140 مرتبہ ”یا کریم یا سلام یا وارث یا پائی“ پڑھ کر دعا کریں اول آخر 9 مرتبہ درود شریف۔ آپ کی فرمائش پر اولاد دینے کے لئے علاج درعقیم ارسال کیا جا رہا ہے۔ دعاؤں کا شکریہ  
محسنہ اکبر۔ لیاقت آباد کراچی  
○ محترم! کافی ماہ سے ہمت کر رہی ہوں کہ آپ کو خط لکھوں مگر ہمت نہیں ہو رہی تھی میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے شوہر نے ہمیشہ مجھے دوسرے درجے کی عورت سمجھا، کبھی محبت اور پیار سے بات نہیں کی، کبھی بھروسہ نہیں کیا۔ میری ساری زندگی کی کمائی چار بچے ہیں جو کہ میاں کے سامنے موم کے تیلے بنے رہتے ہیں میرے شوہر مجھے جوان اولاد کے سامنے پیٹتے

ہیں اس طرح کھینچ کھینچ کر مارتے ہیں کہ بعض اوقات نمیش پھٹ جاتی ہے جوان اولاد کے سامنے بے عزتی ہوتی ہے۔ مجھے طلاق کا نہیں موت کا خوف طاری رہتا ہے۔ شوہر ایسا جنونی شخص ہے کہ کیا بتاؤں ان کو عورت پر اعتبار ہی نہیں۔ ہمیشہ بکھری کے لفظ سے یاد کیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس گناہ کی سزا مل رہی ہے۔ کبھی جی چاہتا ہے کہ خود کشی کر لوں مگر پھر سوچتی ہوں کہ اس حرکت کے بعد اگر خدا مجھ سے روٹھ گیا تو میرا ٹھکانہ کہاں ہوگا؟ بس انہی وجوہات کی بناء پر خود کشی نہیں کر سکی۔ چاروں جوان بیٹے، باپ سے خوف زدہ رہتے ہیں یوں لگتا ہے کہ انہیں خوابوں میں بھی صرف باپ ہی دکھائی دیتا ہے۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ میرا شوہر تشدد سے باز آجائے۔ کیونکہ مجھ میں اب مزید زخم کھانے کی استطاعت نہیں رہی ہے اس کے لئے آپ مجھے کوئی تعویذ کوئی دعا بتادیتے۔ یہ آپ کا مجھ پر سب سے بڑا احسان ہوگا۔ آپ کی کھیری بہن۔ ہمیشہ آپ کے لئے دعا گو رہے گی۔  
☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کے صبر اور استقامت کی جزا دینا اور آخرت دونوں ہی جگہ دے گا انشاء اللہ۔ آپ جیسی عورتوں نے ہی ہمیشہ آبرو قائم رکھی ہے۔ درحقیقت جب انسان بچپن سے عورت کا منفی رُخ دیکھتا آئے تو پھر اس کا یقین عورت ذات سے اٹھ جاتا ہے آپ کے شوہر کی والدہ کا کردار ان کی نفسیات پر اثر انداز ہوا اور یوں ایک عورت کی غلطی دوسری عورت کے لئے سزا بن گئی۔ آپ بکثرت ”یا قدوس“ پڑھا کریں۔ آپ کی فرمائش پر لوح تسخیر خاص ارسال کی جا رہی ہے۔ دعاؤں کا شکریہ۔

پیر شاہ محمد قادری B-359، فیمل ٹاؤن لاہور۔ پاکستان

فون نمبر: 35168036-35167842-42-92+

بذریعہ خط جواب کے لئے جوابی لفافہ ہمراہ ارسال کریں۔

وقت ملاقات: ظہر تا عشاء (تفصیل جمعۃ المبارک)

ایم اہلم

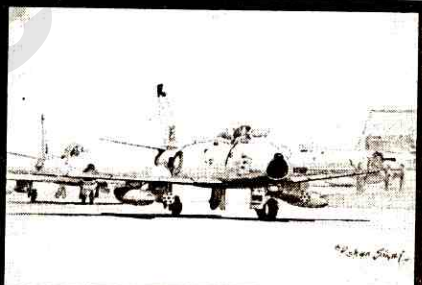
## شہر لاہور پر

لڑائی کے پہلے دن سے متواتر سترہ روز تک یعنی جب تک لڑائی جاری رہی نہ کسی کے چاقو مارا گیا، نہ کسی کو فوج گھونپا گیا، اور نہ کہیں چوری کی واردات ہوئی نہ کسی کی جیب کٹی نہ کہیں گالی گلوچ اور نہ کہیں سے لپاؤ گی کی خبر ملی۔ ہاں جب تک جنگ رہی لاہور کی مساجد میں پانچوں وقت غیر معمولی رونق نظر آئی۔ رات کو جگہ جگہ قرآن خوانی اور مولود خوانی ہوتی۔

## ستمبر 65ء کی جنگ میں لاہوریوں کی ہمت و حوصلہ کا آنکھوں دیکھا حال

بیدار کر دیا۔ لاؤڈ سپیکر لاہور پر بھارت کے حملے سے خبردار رہنے کی ہدایت کر رہے تھے۔ لاہور والے یہ اعلان سن تو رہے تھے لیکن جو کچھ سن رہے تھے۔ اس پر انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد چند خاکسار جیب میں بیٹھے آگے صوت سے لاہور والوں کو بتا رہے تھے کہ رات کے کسی وقت بھارتی طیارے لاہور پر حملہ

لاہور والوں کا پانچ ستمبر 65ء کا دن حسب معمول زندگی کے ہنگاموں میں گزر گیا جس طرح دن بھر لاہور کے کوچہ و بازار میں چہل پہل رہی اسی طرح رات کے بارہ بجے تک سینما گھروں میں رونق رہی۔ نصف شب کے قریب اچانک لاہور کی اکثر مساجد کے لاؤڈ سپیکروں کی کراخت آواز نے سونے والوں کو





لاہور والے سمجھ رہے تھے کچھ فاصلے پر توپیں چل رہی ہیں۔ لاہور کا قلعہ جب سے محکمہ آثار قدیمہ کی تحویل میں چلا گیا تھا، قلعہ کی فوج وارث روڈ پر لاہور گیر یژن میں منتقل ہو گئی تھی لیکن کبھی کبھی گیر یژن سے توپوں کی آواز بھی سنائی دیتی تھی لیکن یہ توپیں اسی وقت چلتی تھیں جب صوبے کا گورنر لاہور سے کہیں باہر جا رہا ہو یا دورے پر سے واپس آ رہا ہو یا توپیں کسی سرکاری معزز مہمان کی سلامی کے موقع پر چلائی جاتی تھیں۔ لیکن آج توپوں کا انداز کچھ اور ہی تھا۔ آواز بھی معمول سے زیادہ خوفناک تھی اور دھماکے بھی دلوں میں کچھ خوف سا پیدا کر رہے تھے۔ سورج کے نکلنے نکلنے پھر سارے لاہور میں یہ خبر پھیل گئی کہ گزشتہ رات بھارتی فوج پاکستان کی حدود میں داخل ہو گئی ہے اور واگے پر جولاہور سے صرف سولہ میل دور تھا آکھنچی ہے اور گولے برس رہی ہے۔ دشمن لاہور سے صرف سولہ میل دور تھا۔ اُس کی توپیں آس پاس کے مقامات پر گولہ باری کر رہی تھیں۔ گولوں کی آواز سے لاہور کے بام و در کا نیچے معلوم ہوتے تھے دشمن رات کی تاریکی میں سانپ کی طرح رینگتا ہوا اچانک لاہور کے دروازے پر آپہنچا تھا اور لاہور کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اَلَا مَانَ الْحَفِظ۔ لاہور والے کیسے خوفناک خطرے سے دو چار تھے۔ وہ خطرہ جو گزشتہ اٹھارہ سال سے پاکستان پر منڈلا رہا تھا آج لاہور والوں کے سر پر آن پہنچا تھا لیکن اس خطرے کا جس نے لاہور والوں کے موت اور زندگی کا سوال پیدا کر دیا تھا۔ لاہور والوں کی طرف سے رد عمل کیا ہوا؟ کیا لاہور والے خوف زدہ ہو کر لاہور سے بھاگنے لگے تھے یا پناہ کی جگہ تلاش میں گھروں سے نکل کر ادھر ادھر بھاگتے پھرتے تھے یا لاہور میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا، لاہور کے بازار سنان نظر آنے لگے تھے یا لاہور کے کالج اور سکول بند ہو گئے تھے؟ نہیں اس قسم کی کوئی بات کہیں نظر نہیں

کریں گے۔ لوگ اپنی حفاظت کا انتظام کر لیں لیکن لاہور کے خوش فکروں کی اداسی سے نزاع تھی۔ خوف زدہ یا ہراساں ہونے کی بجائے جن لوگوں کے پاس ہندو قیس تھیں، گھروں سے نکل کر بازاروں میں آ گئے۔ بعض آدمی ہندو قیس پکڑ کر اپنے کونٹوں پر چڑھ گئے۔ سب کی آنکھیں آسمان کی فضاؤں کو چیرتی نظر آتی تھیں۔ کان کوئی خوفناک دھماکہ سننے کے منتظر تھے، کچھ اللہ والے اللہ کو یاد کر رہے تھے۔ وقت گزر رہا تھا، آسمان کی نیلی نیلی خاموش فضاؤں میں تاروں کا قافلہ اپنی اپنی منزل پر رُک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ادھر ادھر سے وقت کے نقیب تین بجنے کا اعلان کرنے لگے۔ خطرے کا اعلان رات کے ایک بجے کے قریب ہوا تھا۔ اعلان ہوئے دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ لوگوں کی آنکھیں آسمان کو گھورتے تھک گئی تھیں۔ بازاروں میں پہرہ دیتے دیتے پاؤں بو جھل ہو رہے تھے۔ عورتوں اور بچوں کی آنکھیں نیند سے مندنے لگی تھیں۔ بعض لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ ہوائی حملے کا اعلان بھی ایک مذاق ہی تھا، بعض کا خیال تھا کہ حکومت نے لوگوں کی چوکی کا امتحان لینے کو یہ اعلان کیا تھا۔ ستارے رات کا سفر طے کر کے آسمان کی بے پایاں وسعتوں میں آنکھیں جھپک رہے تھے اور سویرا رات کی تاریکیوں کا دامن چاک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ادھر ادھر سے نعرہ توحید اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ فضا میں ایک ارتعاش سا پیدا کرتا سنائی دینے لگا۔ لوگ بیدار ہو کر نماز کی تیاری کرنے لگے اور گھروں سے نکل نکل کر مسجدوں کو ہو لیے۔ کچھ گھروں میں ہی قبلہ رُو ہو کر کھڑے ہو گئے اور بہت سے ایسے بھی تھے جو ابھی تک نیند کے مزے لے رہے تھے۔ سپیدہ سحر کے نمودار ہوتے ہی ایک عجیب سی گرج تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سنائی دینے لگی۔ یہ گرج کہیں نزدیک ہی سے آ رہی تھی۔

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور فخریہ کاوش

# ازوالِ اسلامی واقعات

قیمت 175 روپے شائع ہو گیا ہے۔

☆ رسولِ خدا، خلفاء راشدین، صحابہ کرامؓ اور صالحینؓ کی قابلِ تقلید زندگیوں

سے لیے گئے سنہری واقعات

☆ دورِ نبوت، خلافتِ راشدہ اور تاریخ میں موجود عدل و انصاف کی عظیم

روایات

☆ مسلم خواتین کی ذہانت متانت اور شجاعت کے حیرت انگیز قصے

☆ دورِ جدید میں نئی نسل کے جذبہ ایمانی کو از سر نو تازہ کر دینے والے روح

پرور واقعات

☆ ہر مسلم گھرانے کی لائبریری کی زینت، نوجوانوں کے لئے مشعلِ راہ۔

دعاؤں کے ساتھ

سیارہ ڈائجسٹ 240 ریوازاگارڈن لاہور۔ فون: 042-7245412

آتی تھی۔ اس کے برعکس زندہ دلان لاہور کے روزمرہ میں کوئی خلل نظر نہیں آتا تھا۔ بازار حسب دستور کھلے ہوئے تھے۔ طالب علم بغل میں بستے دبائے سکول اور کالج جا رہے تھے۔ کارخانے کھلے تھے۔ دفاتروں میں حسب معمول کام ہو رہا تھا۔ خانچے والے اور بچڑے ہر روز کی طرح گلی کوچوں میں ہانک لگا رہے تھے۔ بھک مٹنے ہاتھ پھیلا کر بھلا تیرا بھلا ہوگا، آنکھوں والوں آنکھیں بڑی نعمت ہیں کی صدا لگا رہے تھے۔ بازاروں میں کاروبار حسب معمول چل رہا تھا۔ دشمن کی توپوں کی آواز بھی آرہی تھی اور دکانوں پر پوری حلوہ بھی بک رہا تھا، انارکلی، بانو بازار، اعظم مارکیٹ اور مال پر شاپنگ کے وہی انداز تھے۔ سورج ڈھلے کرکٹ فٹ بال ہاکی اور پٹنگ بازی ہوتی تھی۔ سینماؤں میں وہی ریش اور رونق تھی۔ رات کو بارباب نشاط کے کوشوں پر ہارمونیم، سارنگی اور طبلے کی تھاپ کے ساتھ رقص و سرور کی محفلیں بھی جتنی تھیں۔ سڑکوں پر موٹروں، سکوٹروں، ہائیکل اور تانکے کی تیز رفتاری بھی وہی تھی اور توپوں کی گھن گرج بھی برابر سنائی دیتی تھی۔ یہ بھی لاہور والوں کی ایک اداسی۔ ایک ادا اور بھی تھی۔ سرحد پر لڑائی شروع ہو چکی تھی اور سرحد لاہور شہر سے صرف پندرہ سولہ میل دور تھی۔ دشمن اور لاہور والوں کے درمیان صرف نہر حائل تھی۔ دشمن کی توپوں کی ہولناک آواز تھوڑے تھوڑے وقفے بعد کانوں کے پردے پھاڑتی اور لاہور کے اکثر مچھلے موٹروں، بسوں، سکوٹروں اور تانگوں پر سوار ہو کر لڑائی کا تماشا دیکھنے اور پاکستان کے پاسپانوں کا ہاتھ بٹانے کے لیے واگے کی طرف جاتے نظر آتے تھے۔ لاہور والے اگر میلے ٹھیلوں، ٹھیل تماشے کا شوق رکھتے تھے تو ان کے دل میں قوم کا درد بھی تھا اور وطن پر جان دے دینا بھی کوئی بات نہیں سمجھتے تھے، لیکن بانا پور کے قریب پاکستان کے فوجی انہیں روک لیتے اور سمجھا بھجا کرواہیں بھیج دیتے

اور اسی لاہور شہر کے کچھ ایسے فرزند بھی تھے جو کسی نہ کسی طرح سرحد پر پہنچ کر اپنے فوجی بھائیوں کی مختلف طریق سے ہاتھ بٹانے اور ان کی خدمت کرنا اسلام کی خدمت سمجھتے تھے۔ جب بھارتی فوج کی مار دھاڑ اور مظالم سے تنگ آ کر سرحد کے آس پاس کی آبادیوں والے اپنے گھر لٹا کر سخت پریشانی کے عالم میں پاکستان کے اندرونی علاقے میں پناہ لینے کے لیے آئے تو لاہور والے ان کی پیشوائی اور خدمت کے لیے پہلے سے موجود ہوتے۔ انہیں کھلاتے پلاتے اور مصائب میں ان سے ہمدردی کرتے۔ لاہور والوں کا یہ روز کا معمول تھا۔

چند روز بعد لاہور کے رنگین مزاجوں نے ایک اور منظر بھی دیکھا۔ ایک روز لاہور سے لاریاں، بسیں، ٹرک واگے اور برکی حماد کی طرف جا رہے تھے۔ کسی نے خبر اڑادی کہ ان لاریوں، بسوں اور ٹرکوں میں بھارتی سپاہی جو پاکستان کے بہادروں نے لڑائی میں گرفتار کیے ہیں لائے جائیں گے۔ یہ خبر آگ کی طرح سارے لاہور میں پھیل گئی اور اہل شہر ہزاروں کی تعداد میں واگے سے آنے والی سڑک پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ سب کی نظریں سڑک پر لگی ہوئی تھیں۔ جب کوئی بس یا لاری دُور سے آتی نظر آتی تو لاہور والے بڑے زور سے اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے۔

20 ستمبر 65ء کو لاہور والوں نے ایک اور تماشا دیکھا۔ دوپہر کا وقت تھا، اچانک فضائی حملے سے شہر والوں کو خبردار کرنے کے لیے بے شمار سازن بجنے لگے، لیکن لاہور والے خطرے کو ب خاطر میں لاتے تھے۔ کچھ لوگ دشمن کے جہاز دیکھنے کے لیے بازاروں میں نکل آئے۔ کچھ کوشوں پر چڑھ گئے۔ شاید آج قدرت بھی لاہور والوں پر مہربان تھی۔ لاہور والوں کو فضائی لڑائی دیکھنے کا موقع مل گیا۔ دشمن

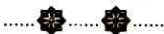


کے تین طیارے ہائی کورٹ کی جانب سے شہر کی طرف آرہے تھے اور پاکستانی طیارے شاہین کی طرح ادھر ادھر سے ان پر جھپٹ رہے تھے اور اس تاک میں تھے کہ موقع ملے تو راکٹ مار کر بھارتی طیاروں کو تباہ کر دیں۔ دشمن کے طیارے موچی دروازے کی طرف سے شہر پر آئے پاکستانی شاہین ان کا تعاقب کر رہے تھے اور جہاں موقع ملتا دشمن پر راکٹ مارتے۔ کسے معلوم نہیں کہ راکٹ ایک بڑی مہلک اور خطرناک چیز ہے لیکن زندہ دلان لاہور کو اس وقت نہ موت کا ڈر تھا نہ جان کا خوف۔ وہ یہ ہوائی جگ بڑے شوق سے دیکھ رہے تھے اور والہانہ انداز سے اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے فلک بوس نعرے لگا کر پاکستانی ہوا بازوں کی ہمت بڑھا رہے تھے۔ پاکستانی ہوا بازوں نے بھارتی طیاروں کو اس طرح گھیر رکھا تھا کہ وہ بم پھینکنا بھول کر جان بچانے کی فکر میں نظر آتے تھے۔ ادھر پاکستانی طیارے نہ ٹٹنے والی قضا کی طرح ہر طرف سے جھپٹ رہے تھے۔ اسی جھپٹا جھپٹ میں موچی دروازے کے دواڑی ہوائی جہاز کی گولی لگنے سے ہلاک ہو چکے تھے لیکن پھر بھی ہوائی جنگ کا جدھر زخ ہوتا لوگ بھی دیوانوں کی طرح بازاروں اور گلیوں میں بھاگتے پھرتے اور قدم قدم پر نعرے لگاتے۔ دہلی دروازے کے باہر ہوائی جنگ دیکھنے کے لیے بے پناہ ہجوم تھا۔ قرآن سے معلوم ہوتا تھا کہ پاکستانی ہوا باز اس کوشش میں ہیں کہ دشمن کو شہر سے ہٹا کر ان پر راکٹ ماریں تاکہ راکٹ چلنے سے شہر والوں کو نقصان نہ پہنچے۔ اگر شہر کی حدود میں دشمن پر راکٹ پھینکے جاتے تو ممکن تھا کہ تماشاخیوں میں سے بھی اکثر کو جان سے ہاتھ دھوئے پڑتے لیکن شاید قدرت کو بھی لاہور والوں کو آج خوش کرنا منظور تھا۔ لوگوں کے دیکھتے دیکھتے دشمن کا ایک طیارہ پاکستانی طیاروں کی آسمانی سے دہلی

دروازے سے کچھ پرے ہٹ کر کسی زخمی پرندے کی طرح قلابازیاں کھاتا زمین کی طرف آتا نظر آ رہا تھا۔ (یہ طیارہ لاہور سے 13 میل دور کالا شاہ کاکو کے پاس جاگرا تھا) ایک اور طیارہ بڑی تیزی سے اپنی سرحد کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ یہ طیارہ بھی اپنے عقب میں دھوئیں کے بادل چھوڑتا جا رہا تھا اور زمین کی طرف جھک رہا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ پاکستانی ہوا بازوں کا نشانہ بن چکا ہے۔ بھارتی فوج کا صرف ایک طیارہ پاکستانی ہوا بازوں سے بچ کر فضا میں گم ہو گیا۔

بھارتی فوج کی مسلسل کوششوں اور بے پناہ گولہ باری اور واسٹے کے محاذ پر گیارہ جان لیوا حملوں کے باوجود محض تین ایزدی سے لاہور کی فتح کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا، حالانکہ ایک پاکستانی جانباز کے مقابلے پر کہیں پانچ اور کہیں سات ہندوستانی سپاہی تھے۔ بھارتی کمانڈر انچیف جنرل چودھری نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ اپنے افسروں کے ساتھ لاہور جیم خانہ میں کاک ٹیل پارٹی منائے گا اور یہ بھی قدرت کا شاید ایک کھیل تھا کہ جہاں ہر روز دن میں دودو اور تین تین خنجر زنی اور چاقو مارنے کی وارداتیں ہوتی تھیں، چوریاں ہوتی تھیں اور جیسیں کشتی تھی، لڑائی کے پہلے دن سے متواتر سترہ روز تک یعنی جب تک لڑائی جاری رہی نہ کسی کے چاقو مارا گیا، نہ کسی کو خنجر گھونپا گیا، اور نہ کہیں چوری کی واردات ہوئی، نہ کسی کی جیب کٹی، نہ کہیں گالی گلوچ اور نہ کہیں سے لپاؤ مگی کی خبر ملی۔ ہاں جب تک جنگ رہی لاہور کی مساجد میں پانچوں وقت غیر معمولی رونق نظر آتی۔ رات کو جلہ جگہ قرآن خوانی اور مولود خوانی ہوتی۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے:-

مقام شوق تیرے قدسیوں کے بس کا نہیں  
انجی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد  
لاہور زندہ باد





## خواب

حنّا صغر

ایک مفلس شخص کا فسانہ، وہ خوابوں کو پورا کرنے کی سکت نہ رکھتا تھا  
اس لیے ان سے دستبردار ہو گیا تھا!

سے کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیئے تھے۔ سامنے  
اس کے خوابوں کا شہزادہ کمر بستہ محکمہ کی باندھے محبت  
پاش نظروں سے اسی کو تنگے جارہے تھا۔ نوری نے  
شرما کر اپنا چہرہ دوپٹے کی اوٹ میں کر لیا۔  
”مجھ سے پردہ کا بے کو کرتی ہے میں نے ہی  
ساری عمر اس چہرے کو دیکھا ہے اب تو“ کرم دین

تازہ پنے..... تازہ پنے..... پنے والا آیا  
پنے والا آیا۔ پنے لے لو تازہ پنے۔ گرم دین کی  
بھاری بھر کم آواز اس کو دوپٹے کی اس تپتی گرمی  
لوڈ شیڈنگ اور جس زدہ ماحول میں خوشگوار بہار کے  
جھونکے کی مانند لگی تھی۔ تازگی کی اس نئی لہر نے اس  
کا جسم خوشبوؤں سے معطر کر دیا تھا۔ اس نے شبانی

کر سکے گا۔ وہ بہت کالی ہے تجھے تو چنی لڑکیاں پسند ہیں مجھ جیسی“ وہ تقاخر سے بولی، اس کے الفاظ کرم دین کو اندر تک شرمسار کر گئے تھے۔

”تجھے پتہ ہے تیری یاد میں اک اک بل مشکل لگا ہے مجھے، سارا دخت (وقت) میں اس کھڑکی کے قریب ٹھہر کر اتجار (انتظار) کرتی رہی ہوں“ نوری نے اپنی بے چینی و بے تابیوں کی داستان اس کو سنادی تھی۔

”لے جھلی نہ ہو تو میں سویرے سے گھر سے نکلا ہوں۔ سارا دن مارا مارا فرا (پھرا) ہوں لیکن دخت (وقت) تھا کہ گجر نے (گزرنے) کا نام نہ لے رہا تھا۔ دو دن پردیس جا کر ہر بل ترسا ہوں تجھ سے بات کرنے کو، تیری شکل دیکھنے کے واسطے اور دیکھ تیرے واسطے کیا لایا ہوں میں۔“

”کیا لایا ہے دکھا“ نوری نے مشتاق لہجے میں پوچھا۔ وہ بے اختیار مسکرا دیا۔ کرم دین نے ریڑھی پر رکھے دو سیاہ شاپر اس کے حوالے کر دیئے تھے۔ ایک شاپر میں بہت بڑا سا رنگ برنگے دھاگوں سے بنائیشوں والا پرانہ تھا اور دوسرے شاپر میں سرخ و سفید رنگ کی چوڑیاں تھیں۔ اس کے دیئے گئے تحفے نے نوری کی آنکھیں جھللا دی تھیں۔

”تجھے میرا اتنا خیال ہے کرم دین“ نوری نے اٹھلا کر پوچھا۔ ”پاکل نہ ہو تو، تیرا خیال نہ کرونگا تو کیا اس مسرت کا کرونگا۔“

”اچھا سن شام کو بلا آئے گا تو ٹو آکر بات کریں ناں اس سے۔“

”کیا بات کروں؟ وہی اپنے اتھڑے لہجے میں چاچا کہے گا پہلے کوشا ڈال پھر بیاہ کرونگا۔“ کرم دین کا لہجہ و آواز ساٹ ہو گئی تھی۔ نوری کا دل ایک بار پھر پھٹنے لگا تھا۔ کیونکہ رات ہی ابانے لماں سے کہہ دیا تھا کہ اگر کرم دین کو کھانا بنا دے گا تو اس کو ہرگز رشتہ نہ دوں گا اور کل رات سے آج دوپہر تک کا وقت نوری نے کانٹوں

بے تابی سے کھڑکی کے قریب آکر بولا۔ ”اندر آ جا ناں.....“ نوری کے کہنے پر اس نے دائیں بائیں دیکھا، گلی بالکل سنسان بھی پھر بولا ”چاچا کیا گھر پر ہے؟“ وہ گھر پر نہیں ہے۔ آج کل دی بھلے بہت بکنے لگے ہیں اسی لیے صبح سویرے چلا جاتا ہے۔ اب تو ہم نے ٹھنڈے پانی کی موٹر بھی لگالی ہے۔“

”اچھا یہ تو اچھا ہوا ویسے بھی گرمی بڑھ گئی ہے“ جانے کیوں نوری کو کرم دین کا رنگ اڑتے ہوئے محسوس ہوا تھا۔ ”نہیں میں ٹھیک ہوں“ نوری کے کیے گئے سوال کا جواب اس نے بہت دیر سے دیا تھا۔

”پہلے ٹو مجھے یہ بتا، آگئی تجھے میری یاد، کتنے دنوں بعد آیا ہے ٹو؟“ نوری نے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا۔ کرم دین کی ساری تھکن ساری کلفت تو اس کو دیکھ کھنڈر ہو گئی تھی۔ اس کا دیدار کر کے اس کو ناقابل بیان خوشی و اطمینان ملا تھا، کچھ لمحے کی شرمندگی اب دُور ہو گئی تھی۔

”میں ٹیم پر آیا ہوں، ٹو ہی اس گرمی میں منہ سر لپیٹے پڑی تھی، کافی دیر سے کھڑا چلا رہا تھا۔ تجھے پتہ بھی ہے کتنا بے چین رہا ہوں“ کرم دین نے ڈھٹائی سے کہا۔ نوری نے جیکھی نظروں سے اس کو گھورا پھر بولی۔ بس رہن دے تجھے پتہ ہے کتنی دیر سے میں تیرا اتجار (انتظار) کر رہی تھی، پچاس بار دروازے پر دیکھ کر آئی ہوں تجھے لیکن تیرا تو کوئی اتہ پتہ نہ تھا، آخری میس (میس) ہو کر سو گئی تھی میں۔ ”ہاں ٹو نے تو سوچا ہووے گا کہ میں مسرت کے ساتھ بھاگ گیا ہوں گا۔ غلو ہی میں سمجھتا ہوں تیری جھمیت (ذہنیت) کو“ کرم دین نے اس کو گھورا جواب میں وہ ہلکھلا کر ہنس دی۔ مسرت کرم دین کی خالہ کی بیٹی تھی جس کے ماں باپ اس کے بچپن میں ہی انتقال کر گئے تھے اور کرم دین کی ماں نے اسکو پالا تھا، وہ ان کے گھر میں رہتی تھی۔ ”مجھے پتہ ہے ٹو مر کر بھی یہ کام نہ



کر دے تیرا۔ اتنی مہنگائی میں، میں اتنا کماسکوں کہ وال  
دلیا مل جاوے تو کیا کہنے یہ کوٹھا بنانا میرے بس کا نہ  
ہے۔“ وہ کہہ کر آگے بڑھ گیا، نوری اس کو پکارتی رہ گئی  
اور پہلی بار وہ نوری کے پکارنے پر بھی نہ رکا تھا۔ نوری  
کے دل میں ایک پھانسی کھس گئی تھی۔

”دیکھو اللہ یار، اکو اک لڑکی ہے ماری۔ میں  
اس کو تجھ سے کئے گئے وعدے کے بدلے بیاہ نہ  
سکوں جب تک ٹو کوٹھا نہ ڈلوائے گا۔ یہی بات کلی تھی  
تاں اب آنا کافی کا بے کو کر رہا ہے تو۔“

”میں آنا کافی نہیں کر رہا، بھرا اللہ دتہ میرے  
حالات مندے ہیں، بیمار ہوں میں۔ مارا ایک چھوڑا  
کمائے ہے۔ میری بیوی سارا دن گھروں میں برتن  
مانجھے پھر جا کر گھر کا گزارا ہووے۔ ایسے حال میں کوٹھا  
کیسے ڈلوادوں۔“ اللہ یار بے بسی سے بولا۔ لیکن اس کی  
بے بسی کا اللہ دتہ پر مطلق کوئی اثر لڑا نہ ہوا تھا۔ اس نے  
بڑے بھائی کی دیکھی نہ کی اور بھڑک کر بولا۔

”پھر تو بیاہ مشکل ہووے گا۔“ اللہ دتہ نے صاف  
ہری جھنڈی دکھائی جس پر نوری کی ماں مداخلت  
کرتے ہوئے بولی۔

”اب ہماری اتنی بڑی لست تو نہ ہے پھر مانسوں  
کی بھرا اللہ یار۔ کرم دین نے نزدیکی بستی میں جو  
دوسرے کا ملاٹ لیا ہے اس پر صرف ایک کوٹھا ڈلوادے  
میری بچی سسکی رہ جاوے گی۔ جھکیوں میں اب نہ رہ  
سکے گی نوری۔ نہ بچلی نہ گیس نہ ٹھنڈا پانی، نہ چھت، نہ  
جمین اس کو تو اینٹ والے کوٹھے میں رہنے کی عادت پڑ  
گئی ہے“ نوری کی ماں کے بے لاگ تبصروں نے کرم  
دین کا خون کھول دیا تھا۔ وہ بھڑک کر بولا۔

”پھر کسی جمین والے سے بیاہ دے اس کو، اب  
میری حیثیت تو نہ ہے کہ میں اس کو کوٹھا بنا کر دے  
سکوں، میرا باپ بیمار ہے پھیپھڑوں کا مرتج  
(مریض) ہے۔ ہزاروں کا خرچہ ہوتا ہے اس کی

پر گزرا تھا۔“ پھر انکار کر دے گا، اب تو سمجھتا کا ہے کو نہیں  
ہے؟ نوری نے تپ کر کہا۔

”دیکھ نوری میں بندہ ہوں کھرا، ٹو سن لے۔ اماں  
تو ویسے ہی تجھ میں ہمارا نقص نکالتی ہے یہ تو میری جد  
ہے کہ وہ رُکی ہے ورنہ اس کا بس چلے تو آج ہی مجھے  
اس کالی مسرت سے بیاہ دے۔ تیرے باپ کی  
پھر مانس سن سن کر گھر والے بے چار (بیزار) ہو گئے  
ہیں۔ جب سے تیرے باپ نے یہ کوٹھا بنایا ہے ناں  
خود کو جانے کیا سمجھنے لگا ہے۔ ہمارے ساتھ جھوپڑے  
میں رہتا تھا اور اب خللوں کے خواب دیکھنے لگا ہے۔ بجلی  
اور گیس کے مزے لے رہا ہے۔ وہ دن بھول گیا جب  
ہمارے ساتھ بیٹھ کر کچھ جھلتا تھا، لکڑیاں جلاتا تھا، گندا  
پانی پیتا تھا، کاروبار کیا چل نکلا ہے مجاز بدل گئے ہیں  
اس کے۔ میرا باپ بیچارہ ہوتا تو ہم بھی کوٹھے میں  
ہوتے جھوپڑے میں نہ رہتے اور نہ ہی مجاز دار بنے۔“  
کرم دین کے سنگناخ و سپاٹ الفاظ نے نوری کا رنگ  
اُڑا دیا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اُڑنے لگی  
تھی۔ نفخت و سکی کے احساس نے اس کی پیشانی عرق  
آلود کر دی تھی۔ وہ تھوک نکلتے ہوئے بولی ”تو کیا ٹو  
مسرت سے بیاہ رچائے گا؟“۔ ”میں نے یہ تو نہ کہا ہے  
میں تو یہ کہہ رہا ہوں چاچا کو سمجھا، اگر نہیں مانتا تو بھاگ  
چل میرے ساتھ۔ کراچی میں میرا دوست رہوے ہے  
نکاح کر کے اس کے پاس چلے جاویں گے۔“

”دیکھ کرم دین میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد  
ہوں، بہت منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوئی ہوں۔  
میری ماں نے مجھے شہزادیوں (شہزادیوں) کی طرح  
پالا ہے۔ وہ سارا دن لوگوں کے گھروں میں برتن مانجھتی  
ہے پر میں گھر پر رہتی ہوں۔ میرا باپ مجھے ملکہ کہتا ہے،  
ان کی کنڈ (پشت) پیچھے یہ کام نہ کر سکو تو ایسے منالے  
میرے باپ کو یہ بھاگنے کی رہن دے۔“ ”تو ٹھیک ہے  
پھر اپنے باپ سے کہہ شہزادے (شہزادے) سے بیاہ

”تیری خاموشی بڑی نہ ہے، میری جیب ہی کھالی ہے نوری۔ کھالی (خالی) جیب تو کھالی دل سے بھی بے یاد (زیادہ) خطرناک ہو دے۔ کوئی دل نہ دیوے کوئی رشتہ نہ دیوے۔“ وہ کہہ کر چل پڑا۔ اس کے شکستہ قدم دیکھ کر نوری کی آنکھوں میں خوابوں کی بھری کرچیاں جیسے گلی تھیں، آنسو تو اترے بہنے لگے تھے۔

پورا ایک ہفتہ گزرنے کو آیا تھا۔ کرم دین نے پلٹ کر خبر بھی نہ لی تھی۔ تو وہ خود آیا تھا اور نہ ہی اس نے اپنے ماں باپ کو بھیجا تھا۔ نوری کے ماں باپ بھی پریشان تھے اور نوری کی حالت تو ناگفتہ بہ تھی۔ نوری کے دل پر بے کلی سی چھائی ہوئی تھی۔ دل کو کسی طور چین نہیں آ رہا تھا۔ کیا وہ اس کے خوابوں کو پورا کرنے میں بخت گیا تھا۔ کتنے سارے سوالات تھے جو اس کے سامنے منہ پھاڑے کھڑے تھے۔ ایک ہفتے کے اختتام پر اس نے دل کڑا کر کے اس کے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے اپنی ماں سے کہا، وہ فوراً اس کو بھیجنے کے لیے تیار ہو گئی۔

”دیکھ نوری کرم دین کو ہاتھ نہ چڑھا (چڑھا) اس کو احساس دلا کہ تو وہاں نہ رہ سکے۔ مری چھو کو تو ادوا (ادائیں) بھی نہ آوے جس سے مرد کو پھنسا (پھنسا) لیویں دوسری چھو دیاں (لڑکیاں)۔ اب تیار ہو کر جا اور اس کو راجی (راضی) کر کہ وہ کوکھا ڈالوائیں۔“

”اماں تو پھنکر (فکر) نہ کر میں اس کو منا لوگی، وہ مانتا ہے مری، اس گندے نکالوگی میں“ نوری نے عزم سے اپنے گھر سے نکلی تھی۔ تو اس کے قدم ڈمک گئے تھے نہ دل میں بدگمانیوں نے جنم لیا تھا۔ وہ خواہشات کی سرزمین پر ثابت قدمی سے چل رہی تھی۔ گندے نالوں سے گزرتے ہوئے وہ اب جھکی والوں کے ناختم ہونے والے جمونپڑوں میں داخل ہو گئی تھی۔ جو تپڑوں کے باہر سے گزرتے ہوئے اسکے پیچ گوگرد سے اٹ گئے تھے۔ اس نے کراہت سے دو غلیظ گالیاں وہاں کے

دوادارو پر، بہت مشکل سے دال ساگ بنتا ہے۔ کوکھا کہاں سے ڈال دوں میں، ٹو بتا کہاں سے پیسہ لاؤں۔“ کرم دین نے بھڑک کر کہا۔ جبکہ دوسری جانب ٹھہری نوری کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ یہ وہ کرم دین تو نہ تھا جو ہمہ وقت اس کی محبت کا دم بھرتا تھا۔ یہ تو کوئی اجنبی اکھڑ کرم دین تھا جس کو صرف اپنے مسائل اور گھروالوں سے سروکار تھا۔ اس کو نوری کی ذرا بھر بھی پرواہ نہ تھی۔ اس بات نے نوری کو آبدیدہ کر دیا تھا۔

”پھر سوچ لے کرم دین ایسے بیاہ تو میں بھی نہ کرونگا۔ اوپر سے ٹو، تو دخت (وقت) بھی نہ مانگ رہا ہے۔“

”چاچا میں جانو ہوں اپنے ٹھنڈیلوں کو، مجھے معلوم ہے کہ میں گھر نہ بنا سکوں چاہے جتنی خاموش (خوابش) ہو میری۔ ٹو آٹھ سال کا دخت (وقت) دے گا میرے کو بول، اپنی بیٹی کو میرے اتجار میں بٹھا سکے گا۔“

”نہ اتنا عرصہ نہ بٹھا سکوں، حنیف درزی کب سے مانگ رہا ہے اس کا رشتہ۔“ تو ٹھیک ہے کر دے پھر سادی اس کی“ اللہ یار یہ کہہ کر آٹھ کھڑا ہوا، بیوی اور بیٹا بھی ساتھ کھڑے ہو گئے تھے۔ اللہ دتہ نے سرسری طور پر بھی ان کو روکنے کی سعی نہ کی تھی۔ کرم دین نے باہر نکلنے سے پہلے دروازے کی اوٹ میں ٹھہری نوری کو دیکھا پھر اس کے قریب آ کر بولا۔

”نوری بیاہ کر کے میرے ساتھ بھاگ چل میرے ساتھ تیرا باپ بیاہ نہ کرے گا چار سال ہو گئے، اب اماں نہ مانے گی اتنی بے جتنی (بے عزتی) کے بعد تو مان جا۔“

”ٹو میرا جواب جانے ہے کرم دین“ نوری نے سر جھکا کر ہنسیکے لہجے میں جواب دیا۔ اس کے جواب نے کرم دین پر گھڑوں پانی ڈال دیا تھا۔ ”کرم دین کیا ٹو میری اتنی سی خاموش (خوابش) پوری نہ کر سکے ہے کیا بہت بڑی ہے میری خاموش (خوابش)؟“

رہی تھیں۔ فوج (غلیظ) لوگ نہ ہوں تو۔ اس نے دوپٹے سے اپنا آدھا منہ ڈھانپ لیا۔ لیکن اس کوڑے پر بکھرے سرسوں کے مرجھائے ہوئے پہلے پھولوں نے اس کوڑے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے سرعت سے جھوپڑے کا پردہ سر کیا اور اندر نظر آنے والے منظر نے اس کے پیروں کے نیچے سے زمین سرکا دی تھی۔ سامنے چار پانی پر کرم دین بیٹھا تھا اور مسرت اس کے بالکل قریب سرخ جوڑے میں ملبوس انتہائی تیز میک اپ کیے ہوئے تھی۔ وہی کالی سیاہ مسرت جس کا وہ اور کرم دین مذاق اڑا پاتے تھے۔ کرم دین اپنے ہاتھوں سے اس کو روٹی کے ٹوالے بنانا کھل رہا تھا اور ہر ٹوالے کو منہ میں رکھنے کے بعد وہ شرماتا جاتی تھی اور کرم دین ہر ٹوالے پر نہال ہو رہا تھا۔

دوسرے کو نے میں چاچی دیگ میں سے بچے ہوئے چاول پرات میں ڈال رہی تھی۔ اماں نوری کے گھر بھی چاول دے آئیو اور ہاں اس کے باپ سے کہہ دیجو کہ اپنی شجادی (شہزادی) کی شادی کسی شجادی (شہزادے) سے کر دے میرا اختیار (انتظار) نہ کرے مجھے میری شجادی (شہزادی) مل گئی ہے۔“ کرم دین نے محبت پاش نظروں سے مسرت کو دیکھا جن نظروں سے کبھی وہ نوری کو دیکھا کرتا تھا۔ نوری کے دل پر آئے چلنے لگے تھے۔

آنکھوں سے زار و قطار بہتے آنسو اس کے ٹوٹے بکھرے خوابوں کو کسی تنگ و تاریک قبر میں دفن کر رہے تھے۔ محبت کا ہر جانی خواہشات کا کتبہ اس کی قبر سے اتار کر درور پھینک چکا تھا، وہ ان خوابوں کو پورا کرنے کی سکت نہ رکھتا تھا اس لیے دستبردار ہو گیا تھا۔

نوری کے خواب کیا بے جا تھے؟ کیا اس کے خوابوں کی قیمت بہت مہنگی تھی، کرم دین سے بھی زیادہ مہنگے اور اونچے تھے اس کے خواب؟



رہنے والوں کو دیں۔ وہاں جگہ جگہ زمین پر پانی جمع تھا اور وہاں کے رہائشی اسی پانی کا استعمال کرتے تھے۔ اس نے گوبر کوٹھی سے رگڑ رگڑ کر ہٹایا تھا لیکن پاؤں کی اگھیاں ابھی بھی لتھڑی ہوئی تھیں۔ اس نے تالاب میں پاؤں ڈال دیئے، قریب بیٹھی عورت چلانے لگی ”اری اوانی (اندھی) ہے، یہ پانی ہم پیو گے، ٹو نے کیا کیا کم بخت پانی کھراب (خراب) کر دیا۔“ نوری نے جواب نہ دینے میں عافیت جانی اور آگے بڑھ گئی۔ کالی سیاہ عورتیں انہی زمین دوز تالابوں پر بیٹھی اپنے کپڑے دھو رہی تھیں۔ دوسری جانب تنگ دھڑنگ بچے اسی تالاب میں نہا رہے تھے کچھ عورتیں اسی پانی سے اپنے منگے بھر رہی تھیں۔ حالانکہ کپڑوں کا کنڈا جھاگ اسی پانی کا حصہ بن رہا تھا۔

میں کبھی بھی اس ماحول میں نہ رہ پاؤں گی۔ بجلی اور گیس کے بغیر میں کیسے کیلی لکڑیاں سلاؤں گی۔ اس جگہ بیٹھ کے کیسے کپڑے دھوؤں گی۔ وہ خود سے مخاطب تھی۔

”ارے ٹو نوری ہے ناں، جو کچھ ارچہ پہلے یہاں رہے تھے“ ایک کالی سیاہ لڑکی نے اس کی کلائی تھام کر پوچھا۔ اس کا گورا رنگ اس کے گہرے سانولے رنگ میں اور بھی زیادہ سفید لگ رہا تھا۔ ”نہ میں نہ ہوں نوری، میں بھاگاں ہوں، ٹو نے نہ پہچانا (پہچانا؟)۔“ ”میں نے نہ پہچانا“ وہ کہہ کر آگے بڑھ گئی ”مندانے لوگ نہ ہوں تو“ اس نے نخوت سے سر جھٹکا تھا۔ اس کو تو اس حوالے سے بھی شرمندگی ہوتی تھی۔ اب کرم دین کو میری بات ماننا ہوگی میں بیاہ کر کے اس کو ابا کے گھر لے جاؤں گی۔ ہاں یہ ٹھیک ہے، جب وہ کوٹھا بنوالے کا گب میں ابا کے گھر سے جاؤں گی۔ مستقبل کے خواب بٹتے بٹتے وہ کرم دین کے جھوپڑے تک پہنچ گئی تھی۔ اس کے جھوپڑے کی ایک جانب کوڑے کا بہت بڑا ڈھیر تھا۔ جس پر کھیاں بٹھینا

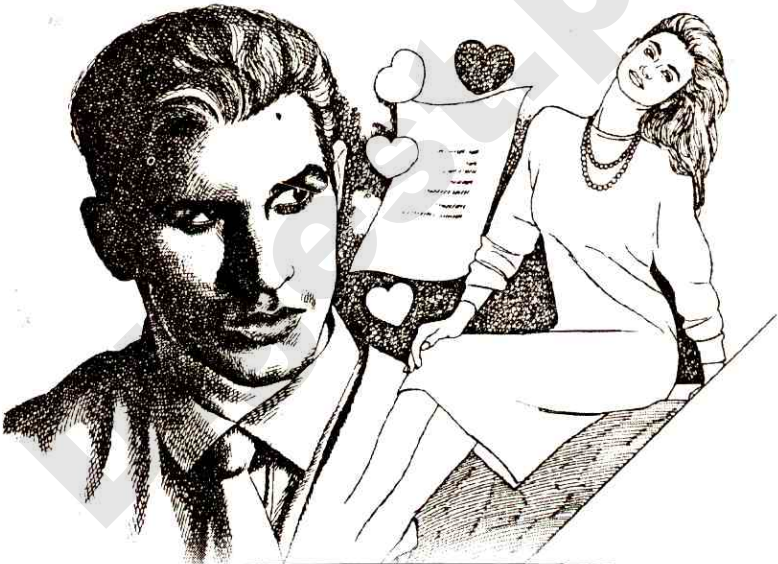




شوکت افضل

## گمانِ وفا

شوکت افضل حب معمول اس بار بھی قارئین سیارہ ڈائجسٹ کے لیے ایک شاہکار کہانی لکھ کر آئی ہیں۔ یہ کہانی ایک ایسے شخص کی ہے جو شادی سے قبل ایک کلنڈر رائیسن زادہ تھا مگر اُس نے ایک جنت نما ازدواجی زندگی کا خواب ضرور سجا رکھا تھا۔ تلاشِ بسا رہ کے بعد اُسے اپنی پسند کی شریکِ حیات تو مل گئی مگر شادی نے اُس کی زندگی یکسر تبدیل کر کے رکھ دی ہے..... کہانی کے کردار انتہائی مضبوط اور پلاٹ جاندار ہے، یہی وجہ ہے کہ قاری ایک بار پڑھنا شروع کرنے پر کہانی کے سحر سے نکل نہیں پاتا۔



ایک شخص کی دلگداز کہانی، جس نے جنتِ نظیر زندگی کا خواب دیکھا تھا

اندرونی بتی جل اُٹھی تو رنج اور صدمے کا ایک اور نوکیلا خنجر محسن کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ حقیقت ایک منہ زور وحشی درندے کی طرح اس پر لپکی۔ فرزانہ نہایت ہی ناز و انداز سے لہراتی بل کھاتی کار

رات کے گھر نے بارہ بجائے اور پھر ایک کار کی ہیڈ لائٹس اس کی کونجی کے گیٹ پر پڑیں۔ محسن یکدم چونک کر دبے پاؤں گیٹ کے دروازے کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ کھڑی کار کا دروازہ کھلتے ہی کار کی

میں حسد کی چنگاری سلگ اٹھی ہے۔ ٹھیک ہے تم میرے شوہر ہو لیکن انسان کو اتنا بھی dominate نہیں ہونا چاہیے۔“ فرزانہ سر کو خم دے کر کان سے دوسرا بندہ بھی نکال کر بولی۔

”جس چیز کو چنگاری سمجھ رہی ہوتا۔ وہ ایک دن تمہارے سر پر آتش فشاں بن کر پھٹے گا فرزانہ بیگم۔ تمہیں نہ صرف میرے احساسات سمجھنے کی قیمت ادا کرنی پڑے گی بلکہ معاشرے میں بھی کہیں کی نہ رہو گی۔ میں دو سال سے صبر کے گھونٹ پی رہا ہوں اور تم کو اس کا ذرہ بھر احساس نہیں کہ یہ دو سال مجھ پر صدیاں بن کر گزرے ہیں لیکن آج کانوں سے سب کچھ سن کر اور آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لینے کے بعد میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے فرزانہ۔“ محسن شدت احساس سے ہانپتے ہوئے جیسے جی کے گھونٹ بھر کر بولا۔

فرزانہ نے گلے سے لاکٹ اُتارتے ہوئے قدرے آنکھیں سے محسن کی طرف دیکھا۔ وہ ٹانگیں پھیلائے کمرے کے وسط میں کھڑا تھا اور اس کی آنکھیں وحشت سے پھٹ رہی تھیں۔ آج پہلی دفعہ اسے اتنے کڑے تیوروں میں دیکھ کر فرزانہ کا دل ایک لمحہ کو دھڑک اٹھا۔ وہ لرزی گئی مگر خود کو بظاہر نارل ثابت کرنے کے لیے فوراً ہی لائقیت سے بیڈ کے نیچے جھک کر ہاتھ روم سلیر ڈھونڈنے لگی اور پھر چند منٹ بعد اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے اس نے آرام سے سلیروں میں پاؤں ڈالے۔ پھر قریب بڑے صوفے پر بیٹھتے ہوئے سائیڈ ٹیبل کھول کر سگریٹ کیس نکالا اور سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے دوسرے صوفے کی طرف اشارہ کرتے بولی۔

”تم بھی بیٹھ جاؤ محسن۔ آرام سے بیٹھ کر بات کرو۔“ محسن آگے بڑھ کر صوفے پر جیسے گرسا گیا۔ فرزانہ نے سلگتا ہوا سگریٹ محسن کی طرف بڑھایا جو اسے

سے نیچے اتاری اور سٹیرنگ پر بیٹھی شہر کی ایک باڑھ شخصیت نے ادباً شانہ انداز میں سگریٹ کا کش لیا اور پھر ایک ہوائی بوسہ اُچھالتے ہوئے کارڈیورس کرنے لگا۔ ہلکا سا نفرتی قبچہہ رات کی تاریک فضا میں نکسیرتے ہوئے فرزانہ نے ہاتھ ہلا کر ”ہائی“ کہا اور پھر گنگنائی ہوئی پرس جھلانی گیٹ کے اندر داخل ہوئی۔ اس کے لباس کی معطر لپٹ محسن کی ناک میں آئی تو وہ گیٹ کی اوٹ سے نکل کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا اور رو رو کر سوچی ہوئی سرخ سرخ آنکھوں سے اسے گھورنے لگا۔

فرزانہ کا پرس جھلاتا ہوا ہاتھ فضا میں رُک کر رہ گیا۔ وہ ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی اور کھیاہٹ سے اسے دیکھنے لگی۔ چند لمحے دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر فرزانہ اک ادائے ناز سے شانوں تک کٹے ہوئے خمدار بال پیچھے کو جھٹک کر آگے بڑھتی گئی۔ وہ اس کے پیچھے اس کے کمرے میں آکھڑا ہوا۔ فرزانہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر پرس میز پر رکھا اور جھک کر سینڈل اُتارنے لگی۔

”کہاں سے آ رہی ہو؟“ محسن نے خشک اور کھوکھلی، پھٹی ہوئی آواز سے پوچھا۔

”کیوں پوچھ رہے ہو؟“ وہ بدستور سر جھکائے ہوئے اس کی طرف پیٹھ کیے بولی۔

”شاید مجھے اس بات کی بار بار وضاحت کرنی پڑے گی کہ میں تمہارا شوہر ہوں۔“ محسن کی آواز رنج اور غصے سے کانپ رہی تھی۔

”بکھی اس اجارہ داری سے بہت کر بھی بات کر لیا کرو محسن۔“ فرزانہ لاپرواہی سے پرے دیکھتے ہوئے کان سے بندھ نکالتے بولی۔ ”ڈرائیور کئی دنوں سے چھٹی پر ہے۔ تمہیں میرے لیے وقت نہیں ملتا تو پھر کیا کروں۔ گھٹ کر مر جاؤں۔ آج کلب سے واپسی پر امجد صاحب مجھے چھوڑ گئے ہیں تو تمہارے دل

ہوگی۔ میں عام لوگوں سے بچتی بچاتی کسی ایسی ہی منزل کی تلاش میں تھی کہ تم نے ایک موٹر پر آکر میرا راستہ روک لیا اور راحت کے سبز باغ دکھانے پر میں تمہیں منزل سمجھ بیٹھی کیونکہ ایک طرح سے تم یوں بھی میرے لیے مناسب انتخاب تھے۔ بھائی بھادجوں، ماں، باپ کے جھگڑوں سے آزاد خوبصورت، نوجوان اور خوش مزاج۔ بس یہیں میں دھوکا کھا گئی کیونکہ تم میری توقع کے مطابق مالدار نہ نکلے۔ تم بس ایک خاندانی، شریف اور متوسط سفید پوش آدمی ہو اور مجھے ان روایات سے نفرت ہے۔ سفید لباس مردہ لاشوں کو پہنایا جاتا ہے۔ زندہ انسان کے لیے تو خدا نے کتنی رنگین دنیا بنائی ہے لیکن ان رنگینیوں کو سینے کے لیے جمیوں ایسی سنہری ہونی چاہئیں۔ سفید چادر کو تو نفن سمجھ کر آتے جاتے راہ گزر از راہ ترحم چند کلمے پھینک کر راہ لیتے ہیں۔ آج جن صاحب کو میرے ساتھ دیکھ کر تم آپے سے باہر ہوتے جا رہے ہو، وہی تو ہمارا اُن داتا ہے، جو محض شیریا یا مچھلی کے ایک دو جام میں ساتھ دینے پر تمہارے بزنس کے لیے بڑے بڑے آرڈرز پر دستخط کر دیتا ہے۔“ فرزانہ ذرا جھوم کر سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے بولی۔

فرزانہ کے لہجے میں برف کی سی بخ بھٹی تھی اور الفاظ اس کے منہ سے اولوں کی طرح تڑخ تڑخ کر اے عصاب پر گر رہے تھے۔ محسن جو ابھی تک خاموشی سے اسے برداشت کیے جا رہا تھا، شراب کے جام کے لفظ پر اس طرح چونکا جس طرح اسے بچھونے ڈمک مار دیا ہو۔ وہ تمام جان سے لرزا اور اس کا روٹکا روٹکا کھڑا ہو گیا۔ اچانک ہی اس کا ہاتھ اٹھا اور ایک زناٹے دار پتھر کی آواز کمرے میں گونج اٹھی۔

”اوہ تم ذلیل عورت! تم اس حد تک گر جاؤ گی، میں سوچ نہ سکتا تھا! نیک نامی عورت کا سرمایہ ہوتی

لیتا پڑا اور پھر فرزانہ نے ایک دوسرا سگریٹ سلاگایا اور کش لے کر نہایت سٹائل سے سرصوٹ کی پشت پر ٹکا دیا۔ اس کے خوبصورت نیم وا ہونٹوں سے آہستہ آہستہ دھوئیں کے مرغولے نکلنے لگے۔ محسن کو معلوم نہ تھا کہ فرزانہ نے سگریٹ نوشی بھی شروع کر دی ہے۔ وہ قدرے چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”اس میں حیرانی کی کوئی بات ہے بھئی، جس ماحول میں تم نے پرورش پائی ہے وہاں لڑکیاں بالیاں کبھی کبھار چھپ کر ایک آدھ سگریٹ کے ٹوٹے کا سونٹا لگا کر کھی کھی کر لیتی ہیں کہ کارنامہ کر لیا لیکن جس ماحول کی میں پروردہ ہوں، اس ماحول میں ہر تہذیب یافتہ ماڈرن خاتون ٹینشن دور کرنے کے لیے سگریٹ جیتی ہے۔ اس سے ذرا گفتگو کرنے میں بھی یکسوئی آ جاتی ہے۔“ فرزانہ کچھ دنوں سے محسن کو آپ سے تم کہنے پر اتر آئی تھی ”ہاں تو میں یہ کیا کہہ رہی تھی؟ نجبانے کیا بات تھی؟ ہاں یاد آیا کہ تمہیں بتانا چاہتی ہوں محسن، کہ میں نے ایک نہایت امیر گھرانے میں پرورش پائی ہے۔ تنگدستی کے نام تک سے نا آشنا رہی۔ ایک حادثے میں میرے ماں باپ دونوں ختم ہو گئے تو پھر کجنت بھادجوں کا راج آ گیا۔ انہوں نے میرے بھائیوں کے ذہنوں پر قبضہ کر کے مجھے ترکہ میں حصے کی رقم دے کر الگ کر دیا۔ یہی رقم میری اعلیٰ تعلیم پر بھی استعمال ہوئی۔ میں شروع ہی سے ماں باپ کی لاڈلی تھی اور اعلیٰ طرز زندگی کی عادی تھی۔ جب یہ رقم جواب دے گئی تو میری اتانے قبول نہ کیا کہ میں ان ذلیل بھادجوں کی ماتحتی کر کے زندگی گزاروں، چنانچہ میں نے وقتی طور پر ملازمت کر لی۔ مجھے اپنی اعلیٰ تعلیم، ذہانت اور خوبصورتی پر ہمیشہ سے ناز اور بھروسہ رہا۔ میں سمجھتی تھی کہ میں کسی سے کم نہیں تو ضرور ایک وقت ایسا آئے گا کہ پھر سے میرے پاس دولت کی ریل پیل



ہیں۔ تم خود تو برباد ہو گے، مجھے بھی برباد کرو گے۔  
فرزانہ گلو گیسے لپٹے میں بولی۔

”وہ اور لوگ ہوتے ہیں جو ایسی ذلتوں سے  
سمجھوتے کر لیتے ہیں۔ میں اس طرح نہیں کر سکتا۔  
میں خاندانی نجیب الطرفین آدمی ہوں۔ میں نو دولتیا  
نہیں کہ مال و دولت کو خدا سمجھوں اور اس کے حصول  
کو اس قدر اہمیت دوں کہ پستیتوں کے پاتال تک اتر  
جاؤں اور کان کھول کر سن لوں۔ اگر آج کے بعد تم نے  
گھر سے باہر قدم بھی رکھا تو تمہاری ٹانگیں توڑ کر رکھ  
دوں گا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ تم میری محبت میرے  
لحاظ کا اس حد تک ناجائزہ فائدہ اٹھاؤ گی“ محسن  
دانت پیٹے ہوئے بولا۔

”اور تم بھی سن لو کان کھول کر گھٹیا انسان۔ میں  
اونچے سینڈرز کی سوشل وومن ہوں اور کسی رعب  
تسے آنے والی نہیں ہوں۔ چاہے وہ میرا شوہر تو کیا  
کوئی بھی ہو۔ میں دیکھوں گی تم مجھے کیسے باہر جانے  
سے روکتے ہو“ فرزانہ نے غصے سے پھنکارتے  
ہوئے کہا ”اور جو تھڑم تم نے مجھے لگایا ہے یہ بھی تمہیں  
بہت مہنگا پڑے گا۔“

”وہ تو میں تمہیں ابھی بتاتا ہوں کہ میں تمہیں باہر  
جانے سے کیسے روکتا ہوں“ مارے اشتعال کے محسن  
کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکلنے لگیں اور وہ اس  
طرح مٹھیاں بھنچ کر فرزانہ کی طرف لپکا گویا اسے کپا  
ہی چا جائے گا کہ پیچھے سے آواز آئی ”..... ابو.....!“  
یکا یک محسن کے بڑھتے ہوئے قدموں کو جیسے  
بریک لگ گئی۔ اس نے تڑپ کر پیچھے مڑ کے دیکھا۔  
اس کا بڑا بیٹا حسن دروازے میں کھڑا تھا۔ بڑی بڑی  
سبھی ہوئی معصوم آنکھوں میں رحم اور ترس کے لیے  
ایک خاموش التجا تھی۔ بچے کے زخمی پرندے کی سی  
معصوم نظریں محسن کے دل پر ایک بجلی بن کر گریں  
اور اس کے وجود پر قیامت سی نازل ہوئی۔

ہے۔ لیکن تم تو عورت کے نام پر گالی ہو۔ فرزانہ  
..... کاش میں تمہیں پہلے سمجھ سکتا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ  
تمہارے اس حسین و دل فریب پیکر کے اندر اس قدر  
غلظ روح ہے۔ تم تو براہ راست شیطان کی شاگرد  
لگتیں۔“

فرزانہ کو محسن سے اس رویے کی اُمید نہ تھی۔ اس  
نے ششدر سی ہو کر اپنے دہکتے ہوئے رخسار پر ہاتھ  
رکھ لیا اور پھر دانت پیٹیں کھنکھناتے ہوئے بولی۔  
”حد ہو گئی۔ کس بات پر مار رہے ہو۔ میں نے  
شراب پینے کی بات کی ہے اس لیے؟ لعنت ہے تم پر  
..... تم جیسے کسی پینے والے متوسط طبقے کے گھٹیا انسان  
کو کیا خبر کہ اونچی سوسائٹی میں تو محض فریش ہونے  
کے لیے بھی ہر کوئی ایک دو پیگ لے لیتا ہے، اسے  
کوئی بھی بُرا نہیں سمجھتا اور میں نے تمہارا سینڈرز  
آف لائف بلند کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ یہی  
صلہ دینا تھا تم نے مجھے۔ اس کا؟“ غصے سے فرزانہ  
کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

”سینڈرز، سینڈرز، سینڈرز“ میں کہتا ہوں بند  
کرو یہ بکواس۔ نہیں چاہئے مجھے ایسا سینڈرز، روپیہ  
دولت پیسہ۔ کیا کبھی تم نے اس چیز سے آگے بھی  
بڑھ کے کچھ سوچا ہے بیچ عورت۔ سونے چاندی  
کے برتن میں ہی کھا لینا تو سب کچھ نہیں ہوتا۔ کیا  
اعلیٰ تعلیم نے یہی شعور دیا ہے تمہیں۔ میں نہیں جانتا  
تھا کہ تم وہی طور پر اس قدر معذور اور احمق ہو، محسن  
نے تلملاتے ہوئے کہا۔

”احق تو تم ہو۔ اگر تم میں ذرہ برابر بھی عقل ہوتی  
تو حالات سے سمجھوتہ کر سکتے تھے۔ دنیا میں آخر  
دوسرے مرد بھی ہیں۔ دوسروں کی بیویاں بھی شمع  
محفل ہوتی ہیں لیکن وہ تمہاری طرح حاسد، تنگ نظر  
اور جاہل نہیں ہوتے۔ نہ تو وہ گھر آئی دولت پر لات  
مارتے ہیں نہ ہی بیویوں کی زندگیاں اجیرن کرتے

جس طرح فرزانہ نے اپنی پوری پوری افتاد طبع اور قلبی کیفیات کی وضاحت کر دی تھی، اس کی واپسی کا خفیف سامکان بھی دم توڑتا معلوم ہو رہا تھا۔ اب تک اس کے دل میں اُمید و ہیمن کا ایک شعلہ روشن تھا کہ شاید سنگلاخ چٹان میں کوئی سبزے کی پتی اُگ آئے لیکن آج کے سانچے نے ظاہر ہو کر تمام تر اُمیدوں اور خوشیوں کو خاک میں ملا دیا۔ دوسرا تمام دن بھی اس نے سٹڈی میں گزار دیا۔ نوکروں کے کھٹکھٹانے کے باوجود اس نے دروازہ نہ کھولا اور اندر ہی سے منع کر دیا کہ اسے ڈسٹر ب نہ کیا جائے۔ جب گہری شام پڑ گئی تو وہ سٹڈی کا عقبی دروازہ کھول کر پچھلے لان میں اُتر گیا اور آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ بچوں کی خوابگاہ کی کچھلی کھڑکی کا پردہ سرکا ہوا تھا اور روشنی باہر لان میں پڑ رہی تھی۔ وہ دبے پاؤں چلتا ہوا کھڑکی میں اندر دیکھنے لگا۔ اس وقت اس کے دونوں بچے سب کچھ بھول بھال کر آپس میں مینوسیٹ سے کھیل رہے تھے۔ ان کے چہرے کھلے ہوئے تھے اور آنکھیں روشن تھیں۔ بڑا بچہ حسن کھیلتے کھیلتے بار بار Ruby Marray کے گانے کا یہ بند ہرارا ہا تھا۔ I shall love you ever more! محسن کو یاد آیا کہ یہ گانا فرزانہ کو پسند تھا اور وہ روزانہ دن یا رات میں اس کو دو تین دفعہ ضرور سنا کرتی تھی۔ محسن کے سینے سے ایک گہری آہ نکلی اور وہ زیر لب بولا:

”تمہیں کیا پتہ میرے بچے، محبت کا چھوٹا سا چراغ گھر کو روشنی دیتا ہے مگر کبھی کبھی یہ چراغ گھر کو آگ بھی لگا دیتا ہے، محسن سے وہاں کھڑا نہ رہا گیا اور وہ پھر سٹڈی روم میں چلا آیا۔ وہ رات بھی اس جتنے بھوکے پیاسی حالت میں وہیں گزار دی۔ گزرے ہوئے شیریں لمحات اور حسین یادوں کو یکے بعد دیگرے اکٹھا کر کے ان کو مایوسی کا کفن پہنا کر

”ہماری امی کو مت ماریے ابو.....!“ بیٹے کی فریاد کرتی ہوئی غزدرہ آواز ایک چھری کی طرح اس کی روح میں اُترتی چلی گئی۔ محسن کو اپنی ٹانگیں مفلوج ہوتی محسوس ہوئیں اور اس نے لڑکھڑا کر چوٹ کا سہارا لیا۔ بیٹے پر نظر پڑتے ہی فرزانہ نے بھاگ کر بیٹے کو گود میں اُٹھالیا اور چیخ چیخ کر رونے لگ پڑی۔ بچہ اس نئی افتاد سے مزید بوکھلا گیا اور وہ بھی ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔ دو منٹ محسن کو اپنا سانس برقرار کرنے میں لگے۔ اس نے خاموشی سے ماں بیٹے کو روتا دیکھا اور پھر سر سے پاؤں تک پسینے میں نہایا ہوا کمرے سے نکل کر اپنے سٹڈی روم میں چلا گیا اور اندر سے دروازہ بند کر کے دھڑام سے صوفہ پر گر گیا۔ اس کا ذہن اور وجود بے رحم شکاری کے جال میں پھنسے پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا لیکن اسے فرار کا کوئی راستہ بھائی نہ دے رہا تھا۔ وہ اپنے ہی الاؤ میں جلتا اور اپنے ہی کانٹوں پر رت پتا رہا۔ باہر بارش ہوئی شروع ہو گئی اور بارش کے قطرے آوارہ روجوں کی طرح کھڑکی کے شیشے پر دستک دینے لگے۔ وہ سٹڈی روم میں بغیر بتی جلائے بیٹھا تھا۔ اس کے سینے میں بار بار گھٹاسی اُمنڈ رہی تھی اور وہ صوفے میں دھنسا سوچتا رہا۔

”شاید مجھے اپنے وقت کا بیشتر حصہ فرزانہ کے ساتھ ہی گزارنا چاہیے تھا۔ شاید اس طرح مجھے اس کو سمجھنے میں زیادہ آسانی ہوتی۔“ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ عورت اس کے لیے ہمیشہ اجنبی رہی۔ وہ اسے جانے بوجھے بغیر دولت کمانے میں مصروف رہا تھا۔ صرف اسی کی خوشنودی کی خاطر لیکن خود اس کے وجود میں فرزانہ کے دل میں کوئی اہمیت نہ تھی جیسا کہ وہ سمجھتا رہا۔ آج فرزانہ کی ذات پر بے تحاشا اعتماد کرنے، اس سے بے اندازہ محبت کرنے کے نتیجے میں جہاں فرزانہ کے قدم پہنچ چکے تھے اور آج

”اوہ! تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی“ حسن نے تھملا کر سوچا اور پھر وقفے سے بولا ”یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے سیٹھ صاحب اور میرا خیال ہے اس میں دوسروں کو دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے۔“

”لیکن بیوی پر بے جا روک ٹوک اور ظلم کرنا بھی تو اخلاق کے منافی بات ہے“ اس نے ناگواری سے کہا۔

”آپ نہیں جانتے سیٹھ صاحب وہ ..... وہ خیر بہر حال وہ میری بیوی ہے اور قانوناً شرعاً میں اس کے بُرے بھلے کا خود ذمہ دار ہوں۔“

ٹھیک ہے کہ وہ بہت بڑا سرمایہ دار تھا جس سے محسن کے مالی مفادات منسلک تھے لیکن اس سے مرعوب ہونے کے باوجود اس کی اس قسم کی اہانت آمیز گفتگو سے محسن کو بھی غصہ آنے لگا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس تمام گفتگو کے پیچھے فرزانہ کا اپنا ہاتھ ہے تاہم وہ صبر نہ کر سکا۔

”دیکھو محسن!“ وہ سگریٹ کا گہرا کش لگا کر بولا ”میں تمہارے ہی بھلے کے لیے کہہ رہا ہوں، از دو اجبی زندگی باہمی اعتماد کے بغیر نہیں گزر سکتی۔“

”جب اعتماد کے رشتوں کا بھرم ہی ٹوٹ جائے تو انسان نہ صرف اپنی بلکہ دوسروں کی نگاہ میں رسوا ہو کر رہ جاتا ہے سیٹھ صاحب اور بیوی کی بے وفائی جو اس کے بچوں کی ماں بھی ہو، خاوند کے لیے محض کہنی کی چوٹ نہیں ہوتی جسے وہ سہلا کر چپ ہو لے۔“

محسن یک دم کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور اسے غناک نظروں سے گھورتا ہوا بغیر سلام کیے ہی باہر نکل گیا۔ اس کے بعد محسن کو فون پر بھی اس شخص میں الٹی سیدھی دھمکیاں ملتی رہیں۔ محسن فطرتاً بذل نہ تھا۔ وہ کئی دفعہ مختلف قسم کے مراحل سے گزر چکا تھا لیکن اس نے ہمیشہ بہترین طریقے پر زندگی گزاری تھی۔ وہ صلح کن، خوش مزاج اور مرجان مرغ طبع کا حامل تھا اور اسی خاصیت کی وجہ سے بچپن ہی سے

حالات کے بے رحم دھاروں پر ان کے جنازے رخصت کرتا رہا۔ کئی دفعہ اسے محسوس ہوا کہ وہ بھی مر رہا ہے، ساتھ ہی مر رہا ہے مگر پھر ایسے ہی لحوں میں ایک نکھی سی شیریں آواز I shall love you ever more کا رُخ تبدیل کر دیتی۔

وہ سوچتا ”اس وقت میرے بچوں کی زندگی احساسِ محبت سے معمور ہے۔ اگر زندگی کے اس معصوم دور میں ان کو تلخیوں نے گھیر لیا تو وہ نفسیاتی مریض بن جائیں گے۔ تمام زندگی تکیاں اور نفرینیں ہی بانٹتے پھریں گے۔ صبح کے قریب وہ کھڑکی کے پاس آیا تو بادلوں کی اوٹ سے ایک روشن تارہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

”ہاں میں زندہ رہوں گا۔ اسی طرح سے زندگی کے دن گزاریں گا۔ اپنے بچوں ..... اپنی آنکھ کے تاروں کے لیے لیکن فرزانہ!! آج کے بعد میں اپنے دل کے دروازے تم پر بند کرتا ہوں۔ ہمیشہ ..... ہمیشہ کے لیے۔“

پھر اس کے دو تین دن بعد ہی جب محسن اپنے متعلقہ سیٹھ صاحب کے پاس کوئی ضروری کاغذات لے کر گیا تو اس نے محسن کو بٹھایا اور پھر باتوں باتوں میں کہنے لگا۔

”محسن میرا تو خیال تھا کہ تم جیسے نوآموز بزنس پیشہ لوگوں کو محض بڑے آرڈرز اور بلوں کو رقوم کی وصولی سے دلچسپی اور مطلب ہوتا ہے۔“ اس نے گھاٹکھٹکار کر معنی خیز انداز میں سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

”میں سمجھتا نہیں سیٹھ صاحب!“ محسن نے کچھ حیران سا ہو کر کہا۔

”مجھے معلوم نہ تھا کہ تم جو دیکھنے میں اتنے سمجھ دار معلوم ہوتے ہو۔ اتنے تنگ نظر اور حاسد شوہر ثابت ہو گئے“ اب وہ ذرا کھل کر بات کی طرف آتا ہوا بولا۔



ایمان افروز ..... عقل پرور ..... عمل آفرین

سیارہ ڈائجسٹ  
کا عظیم الشان

قارئین کے اصرار  
اور مانگ کے تحت دس  
سال کے بعد نیا ایڈیشن  
شائع ہو رہا ہے۔

# قرآن نمبر

☆ ..... دائمی اہمیت اور افادیت کا حامل ☆ ..... ایک متاع بے بہا

☆ ..... ایک دستاویز ☆ ..... اعلیٰ رنگین طباعت

☆ ..... ضخامت 1500 صفحات ☆ ..... تین جلدوں میں

اپنی خدمات، مصنوعات کا اشتہار جلد جاری فرمائیں

مکمل  
قیمت - 525/-

راشتہ نازات دہیے کی آخری تاریخ  
30 مئی 2013 ہے

قارئین کرام براہ راست بذریعہ منی آرڈر یا وی پی قرآن نمبرنگوا سکتے ہیں

سیارہ ڈائجسٹ 240 مین مارکیٹ ریواڑ گارڈن، لاہور۔

فون: 3724512

سے چند فٹ پرے کچھ بڑا دکھائی دیا۔ اس جگہ روشنی ٹھیک نہ پہنچ پاری تھی۔ اس نے بغور اس طرف دیکھا تو اس کا ماتھا ٹھنکا اور اس کے قدم وہیں رُک گئے۔ وہ واپس آ کر قریب سے دیکھنے لگا کہ یہ کیا چیز ہو سکتی ہے۔ بے یقینی کے صبر آزمائحوں میں اس کی نگاہوں نے جو کچھ دیکھا تو وہ وہیں سکتے کی سی حالت میں کھڑا رہ گیا اور پھر قدرے توقف کے بعد من من پاؤں لیے نجانے کس طرح وہ آگے بڑھا اور جھک کر اسے دیکھنے لگا۔

”شمسین کے ایک دوپگ تو تمہیں فریش کر دیا کرتے تھے مگر یہ آج زمین پر رینگنے والے حقیر کیزوں کی طرح فرش کی ان پہنائیوں میں کس خوشی میں لیٹی ہو فرزانہ بیگم؟ چلو دفعہ ہو جاؤ، مجھے تم سے کیا لینا دینا،“ محسن کے وجود میں کرب کی لہریں اٹھنے لگیں اور اس نے غم و غصے سے منڈھال ہو کر واپس جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

”خود ہی جب نشوونو تو چلی آنا اندراٹھ کے“ محسن یہ سوچ کر چل بڑا مگر پھر اس کے دل سے آواز آئی۔

”تمہار جاؤ محسن۔ اس نے شاید آج ضرورت سے زیادہ دسکی چڑھائی ہے۔ اس لیے یہ ہوش و خرد سے بیگانہ تمہاری دہلیز کے باہر پڑی ہے لیکن یہ مت بھولو کہ یہ تمہارے بچوں حسن اور علی کی ماں ہے، تمہاری عزت ہے۔ جیسی بھی ہے جو بھی ہے حقیقت سے تم نظریں نہیں چڑا سکتے۔ اسے اٹھاؤ اور اندر لے جاؤ،“ محسن پھر پلٹا اور قریب آ کر فرزانہ کا بازو پکڑ کر بلایا اور آواز دی۔

”فرزانہ!!“

”لیکن فرزانہ کا بازو برف کی طرح ٹھنڈا اور بوجھل تھا۔ محسن کو ایک نہایت ہی عجیب سا احساس ہوا اور اس کے اعصاب کو جیسے بجلی کا کرنٹ لگا۔ وہ ششدر ہو کر عجیب نگاہوں سے فرزانہ کے سر پائے کو

خونی رشتوں سے محرومی کے باوجود اس پر زمانے کے سرد گرم نے کوئی خاص اثر نہ ڈالا تھا لیکن اب آخر اسے یہ محسوس ہونے لگا کہ پہلے جو کاروباری حلقے اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے اب انہوں نے اس سے منہ موڑنا شروع کر دیا ہے اور اس چیز کا محسن کے کاروبار پر ناقابل برداشت اثر پڑنا شروع ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آمدنی برائے نام رہ گئی اور پھر بینک میں جمع شدہ رقم خرچ ہونا شروع ہو گئی مگر اس دوران فرزانہ کے نہ تو اخراجات میں کوئی فرق آیا نہ معمولات میں۔

محسن نے کچھ عرصہ سوچ بچار کے بعد کاروبار کی تلاش میں باہر کا رخ کیا اور اب وہ اکثر گھر سے باہر رہتا۔ اس کا شیرازہ حیات منتشر ہو کر رہ گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس کی قسمت کا ستارہ گردش میں آچکا ہے۔ وہ جو مٹی میں ہاتھ ڈالتا تھا تو سونا ہو جاتی تھی، آج وہ سونے کو ہاتھ لگاتا تھا تو وہ مٹی ہو جاتا تھا۔ تقدیر کی ستم ظریفی نے اب ایک ایسا پانسہ پھینکا جس نے محسن کو وہ ضرب لگائی کہ اس کی زندگی کا رخ ہی تبدیل ہو کر رہ گیا اور جینا اس کے لیے تہمت ہو گیا۔

ہمیشہ جب وہ کام کے سلسلے میں باہر جایا کرتا تھا تو اکثر اس کو دو تین دن بلکہ کبھی تو ہفتہ لگ جاتا تھا۔ مگر اس دفعہ وہ باہر گیا تو ایک رات گزارنے کے بعد اس کا جی گھبرانے لگا۔ تمام دن ایک بے نام سے اضطراب نے اس کی روح کو گھیرے رکھا۔ شام کو وہ کام سے کافی دیر بعد فارغ ہوا تو بھی اس کی چھٹی جس نے اسے بے چین کیے رکھا۔ آخر وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر رات ہی وہاں سے روانہ ہو پڑا۔ جب وہ گھر پہنچا تو رات کے دو بج رہے تھے۔ اس وقت تمام نوکر چاکر کوارٹر میں سو رہے تھے۔ کارگیران میں کھڑی کرنے کے بعد اس نے پورچ کی سیڑھی پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ اسے پورچ



آج یہ اتنا بڑا فیصلہ بھی خود اکیلے اکیلے ہی کر لیا..... مجھے نہ کچھ بتایا، نہ پوچھا۔ فرزانہ! ہمارے پاس ایک خوش حال زندگی بسر کرنے کو کیا کچھ نہ تھا۔ کسی چیز کی کمی نہ تھی مگر تم قامت کو موت سمجھتی تھی۔ تم نے مجھے حقیر سمجھا، ٹٹ پونجیا کہا..... تم تو راتوں رات امارات کے آسمان پر پرواز کر کے ستاروں کو جھولینا چاہتی تھیں۔ پھر میں نے تمہاری منہ زور طبیعت کے آگے ہتھیار پھینک دیئے اور میں کرتا بھی کیا۔ میرا تم پر زور ہی کب چلتا تھا فرزانہ.....! اور اب

اب دکھاؤ نہ ٹوٹے ہوئے پر اپنے یہ دوستی کا نتیجہ ہے آسمانوں سے تم نے اعلیٰ سٹینڈرڈ کی خاطر اونچی اڑان لیتے ہوئے کبھی نظریں جھکا کر نیچے نہ دیکھا، جہاں ایک خوبصورت خوشحال گھر تھا، محبت کرنے والا شوہر، پیارے بھول سے دو بیٹے تھے اور پھر میں نے لاچار ہو کر دیدہ دانستہ تمہیں کھلی فضا میں آزاد چھوڑ دیا اور دل کے دروازے تم پر بند کر لیے مگر گھر کے دروازے تم پر بند نہ سکا۔ یہ سوچ کر کہ جیسی بھی ہو میرے بچوں کی ماں ہو اور ان کی معصوم نگاہیں تمہارے انتظار میں دروازے پر لگی رہتی ہیں اور پھر یہ بھی سوچتا رہا کہ شاید کبھی تو تم اپنے اس بے منزل سفر سے لوٹ ہی آؤ گی۔ اور آج تم واقعی لوٹ تو آئی ہو مگر تمہاری اس واپسی کے بارے میں تمہارے معصوم بچوں کو کیا جواب دوں گا۔ ہاں کیا جواب دوں گا؟ فرزانہ..... بولنا؟..... جواب دو فرزانہ کیا جواب دوں گا میں تمہارے بچوں کو؟.....

تمہیں تو اپنے حسن و شباب، اپنی ذہانت پر بہت مان تھا، اعتماد تھا، تمہارا اثر کش تو ناز و انداز کے تیروں سے بھرا رہتا تھا۔ جس سے تم من پسند شکار پر تاک تاک کر نشانے پھینکا کرتی تھی مگر ایک دن تم خود ان

گھوڑے لگا۔ فرزانہ کا لباس سخت بے ترتیب تھا۔ قیمتی ساڑھی جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی اور گرد آلود تھی۔ چہرے اور بازوؤں پر جگہ جگہ خراشوں اور زخموں کے نشان تھے۔ محسن یک دم اس پر جھک گیا اور اس کا سر سیدھا کر کے اسے پھر آواز دی۔

”فرزانہ..... فرزانہ..... اٹھو فرزانہ!!“

مگر فرزانہ کی کھلی ہوئی آنکھیں فضا میں ایک طرف ہی مرکوز تھیں۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں ساکت اور بے نور تھیں۔ اس کا حسین چہرہ خاک آلود اور زخمی تھا۔ اس کی شکبار زلفیں بکھری ہوئی تھیں اور جسم بے حس و حرکت اور برف کی طرح سرد تھا۔ اس کے مرمیں گلے پر نیلے نیلے نشان تھے شاید کہ اس کا گلا بھی گھونٹا گیا ہو لیکن اب وہ اس دنیائے رنگ و بو میں سانس نہ لے رہی تھی..... وہ مرجی گئی۔

محسن کی رگوں میں خون نمجند ہونے لگا۔ فرزانہ کے لب و لہجہ کی خوبصورتی اور اس کی آواز کا ترنم کبھی اس کے کانوں میں رس گھولا کرتا تھا، آج اس کے کانوں میں بھیانک جیج بن کر گونجنے لگا۔ اسے ایسے لگا جیسے اس کا سینہ شق ہو جائے گا۔ وہ بے دم سا ہو کر فرزانہ کے بے جان جسم کے پاس بیٹھ گیا اور محسن کے منہ سے ایک گہری آہ کے ساتھ نکلا۔

”تو تم اپنے اس رسوا کن سفر کی ہولناک منزل کو آخر پہنچ ہی گئیں، فرزانہ بیگم..... سفر جو تم نے بدنامی سفلی راستوں پر ناختم لوگوں کے ساتھ عیش و نشاط کی نام نہاد چکا چوند روشنیوں میں کیا تھا۔ کیا اسی دنیاوی جھولی شان بان کے لیے تم نے ضمیر کا سودا کیا تھا جسے چھوڑ کر آج تم موت کی اندھیری وادیوں میں اتر گئی؟ ارے تم تو ان وادیوں میں بھی مجھ سے پوچھ بغیر اکیلی ہی چل دیں۔ مگر تم مجھ سے کچھ پوچھنے کی پابند ہی کب تھیں۔ اپنا یہ حق تو تم نے ہمیشہ اپنے پاس ہی رکھا۔ اپنے فیصلے ہمیشہ خود ہی کیے اور



بیکراں اندھیروں میں ایک خیال روشنی کی کرن بن کر چمکا اور وہ اپنا ریزہ ریزہ وجود سمیٹ کر اندر کو لپکا۔ کافی دیر فون کی کھنٹی بجتی رہی، پھر رضانا ریسپور اٹھایا اور نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا ”کون ہے ابھی اس وقت؟“۔

”ہیلو۔ رضانا میں محسن بول رہا ہوں“ محسن نے خشک اور پھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

”اوہ محسن خیریت تو ہے ابھی“ رضانا ہنسی لیتے ہوئے بولا ”تم تو کہیں باہر گئے ہوئے تھے تاہم وہاں سے، کہاں سے بول رہے ہو؟“

”گھر ہی سے بول رہا ہوں، ابھی دو بجے پہنچا ہوں تم اور راحت فوراً آ جاؤ یہاں..... اسی وقت..... دیر مت کرو۔“

”ارے معلوم ہے اس وقت کیا بجا ہے؟..... ڈھائی بج رہے ہیں رات کے۔ کیا پھر کوئی جھگڑا تو نہیں کھڑا کیا تم نے؟“ رضانا بیزار سے ایک اور جھائی لے کر کہا۔ ”سو جاؤ یا رنج دیکھا جائے گا۔“

”جو میں تمہیں کہہ رہا ہوں وہ کرو..... رضانا فوراً آ جاؤ یا تم نہیں سمجھتے سچویشن کو۔ راحت بھابھی کو جگاؤ اور فوراً پہنچو..... دیکھو یہ مذاق نہیں ہے نہ ہی مذاق کا وقت ہے“ محسن بے ربط سے فقروں میں بولا۔

”خدا خیر کرے، مگر خدا کے بندے کچھ پھوٹو تو منہ سے۔ آخر راحت کو میں جگا کر کیا بتاؤں کچھ بات بے بھی تو پڑے۔“ رضانا ناگواری سے کہا ”عجیب سسپنس پیدا کر رکھا ہے چند نے۔“

”میں کچھ بھی نہیں بتا سکتا رضا“۔ سسکتے ہوئے محسن نے کہا ”مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تم خود ہی آ کر دیکھ لیتے تو اچھا تھا۔“

”کیا دیکھ لیتا؟“ رضانا کے منہ سے بے ساختہ

تیروں کا نشانہ بن جاؤ گی۔ یہ تو میں سوچ بھی نہ سکتا تھا، پُر ہوں سرمایہ داروں کی جس اعلیٰ سوسائٹی کے سمندر میں تم خود کو ایک ماہر تیراک سمجھتی تھی آج اسی سمندر کی مہیب لہروں نے تمہیں تمہاری مہارت سمیت رسوا کن موت کی اندھی گھاٹیوں میں لا چٹا ہے فرزانہ..... آخر آج وہ تمہارا پرس میں رکھا ہوا ہسٹول بھی کام نہ آ سکا فرزانہ!“

مختلف قسم کے جذبوں نے محسن کے ذہن کو جکڑ رکھا تھا۔ مختلف خیالات اس کے ذہن میں پڑی پر تیزی سے چلتی ٹرین کی طرح کھنا کھٹ بھاگے جا رہے تھے۔ کیا باریک اس کا جی چاہا کہ اپنا گریبان پھاڑ کر چیخ چیخ کر اور گرد گھسیوں میں سکون سے سونے والوں کو اکٹھا کرے اور اونچی سوسائٹی کے اس شاہکار کے اس انجام کو دکھائے..... پولیس کو بلائے..... رپورٹ لکھوائے۔

مگر..... پولیس.....؟ پولیس کا خیال آتے ہی ایک انجانے خوف نے محسن کے دماغ کو ایسا جھٹکا دیا جیسے اس پر کسی نے منوں پانی ڈال دیا ہو۔ اس کا ذہن چکرانے لگا۔ لاتعداد وسوسے کچھو کے دینے لگے۔

”لوگ کیا کہیں گے؟ محسن علی خان کی بیوی کے بارے میں کیا کہیں گے؟ لوگ میرے معصوم بچوں کی سیاہ کارماں کے بارے میں کیا کہیں گے؟ رنج والہ کا یہ تاسور میں تو دل میں چھپالوں گا مگر رسوائی کا جو سیاہ داغ میرے ماتھے پر لگ جائے گا تو یہ ظالم دنیا کے سنگدل لوگ روز مجھے طعنوں کے پتھر ماریں گے۔ میں روز مروں گا اور روز مرمر کے جعبوں گا۔ کیا ہوگا میرا جینا؟ کیا ہوگا میرا جینا؟“ محسن دونوں ہاتھوں میں سر تھامے اس اذیت ناک کشمکش کے سمندر میں ڈوب اُبھر رہا تھا کہ یکایک اس کے ذہن میں چھائی دھند چھٹنے لگی۔ اس کی سوچ کے

نکلا۔

”فرزانہ کی لاش“۔

رضا کو یوں محسوس ہوا جیسے زلزلے سے ہر چیز زمین بوس ہوتی جا رہی ہے۔ وہ فون کا ریسیور کرڈیل پر پینچ کر راحت کو چگانے بھاگا۔

میں منٹ کے اندر اندر رضا اور راحت پہنچ گئے۔

وہ دونوں میاں بیوی بھی وہیں لاش کے پاس ہی

حیران و پریشان ہو کر بیٹھ گئے۔ آدھے گھنٹے کے

سوچ بچار کے بعد رضا اور راحت کے ذہن میں

ایک ترکیب نے سر اُبھارا اور انہوں نے کچھ اطمینان

کا سانس لیا۔ محسن کو سمجھایا بھجایا اور پھر اس کے

لرزتے کانپتے حواس باختہ وجود کو سنبھال کر اندر لے

جا کر بٹھا دیا اور باقی معاملے کی کمان رضا اور راحت

نے سنبھال لی۔ پہلے تو دونوں نے فرزانہ کی لاش

وہاں سے اٹھائی اور اندر لے آئے۔ روتی سسکتی

راحت نے بچپن کی سیٹیلی کے بے جان جسم سے گرد

آلود پھٹی ہوئی ساڑھی اُتار دی۔ اس کے جسم سے

تمام دھول صاف کی اور پھر اسے شبِ خوبی کا لباس

پہنا کر دو تین جگہ سے پھاڑ دیا اور بستر کی چادر بے

ترتیب کر کے اسے اُلٹے زاویے سے لٹا دیا پھر سوچ و

بچار کے بعد انہوں نے کمرے میں فیچر درہم برہم

کر دیا۔ جس الماری میں فرزانہ اپنے قیمتی لباس اور

جیولری رکھتی تھی اس کا تالا توڑ کر کچھ چیزیں زمین پر

بکھیر دیں اور باقی جیولری ایک علیحدہ بس میں چھپا

کر رکھ دی۔ الغرض انہوں نے ایک ایسا نقشہ ترتیب

دیا جس سے معلوم ہو کہ یہ تمام کارروائی نامعلوم حملہ

آدروں کی ہے جنہوں نے زیور اور رقم کے لیے یہ

سب کچھ کیا اور مدافعت کرنے کی کوشش میں انہوں

نے فرزانہ کو بھی مار ڈالا اور جیولری لے کر بھاگ گئے

اور اس سب کارروائی کے بعد انہوں نے پولیس کو

اطلاع دی۔

بقیہ تمام رات محسن فرزانہ کی لاش کے پاس بیٹھا

سکستا رہا۔ اس سیاہ رات میں درختوں میں سے

سنسناتی ہوئی ہوائیں آوارہ مضطرب روحوں کی طرح

بین کرتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ خوارگاہ کے باہر اُگے

ایک بوڑھے قدیم درخت کی لمبی لمبی شاخیں بار بار

خواب گاہ کی کھڑکیوں سے سرکرا رہی تھیں۔ آسمان

کسی اُجڑے ہوئے مزار کی طرح دیران اور چپ

چاپ تھا۔ دُور دُور تک کوئی ستارہ نظر نہ آ رہا تھا۔ گھر

کے باہر و در پر موت کے مہیب سائے منڈلا رہے

تھے اور محسن کے کانوں میں یادوں کی بازگشت گونج

رہی تھی ”یہ سب کیا ہے۔ فرزانہ؟ تمہارے مرمریں

جسم سے مدھوش کن خوشبو کی جگہ خون کی بساندہ

کیوں آ رہی ہے؟ اس وقت زندگی کی چمک سے

محروم چہرے پر موت کا سنگین پہرہ ہے۔ اور میں

تمہارے سرہانے بیٹھا سگریٹ کے سٹلکے دھوئیں

سے جلتے ہوئے سینے کو اور جلا رہا ہوں۔ میں وہ پتھر

ہوں جس کو تم نے ٹھوکروں سے پامال کر دیا تھا اور

آج میں درِ ماندہ دل شکستہ خالی ہاتھ تمہارے سامنے

بیٹھا ہوں۔ میرے دامن میں تمہارے خون کی

سوغات ہے۔ یہ سوغات مجھے کس نے بھیجی ہے بتاؤ

نا؟ بولو نا جواب دو؟ کون تھے وہ لوگ جنہوں نے

مجھے اور تمہیں آج اس حال پر پہنچا دیا ہے؟ میں ان کو

بے نقاب کر کے رہوں گا۔ میں ان سے انتقام لے

کران کو ایسی ذلت اور بے آبروئی کی دلیلیں پر پتھوں

گا کہ وہ معاشرے میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں

گئے۔“

سورج طلوع ہوتے ہی یہ واقعہ ہر خاص و عام کی

زبان پر تھا۔ ہر ایک کے پاس ایک نیا انداز بیان

تھا۔ چونکہ فرزانہ اس شہر کی مشہور ہستی تھی؟ لہذا پولیس

بھی دائرہ تفتیش وسیع کرنا چاہتی تھی اور پھر بڑوں کی

ایک خاتون کے پاس تو بالکل ایک علیحدہ ہی کہانی

باپ کے خلاف اکساتی رہتی۔ محسن بے چارہ گردش حالات کے ہاتھوں معاشی وسائل کے پیچھے پیچھے مارا مارا پھرتا رہتا۔ اسے معلوم بھی نہ ہوسکا کہ جو والدین آپس میں لڑتے رہتے ہیں وہ بچوں کو اپنے اپنے ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں، حالانکہ بچے دونوں کا ہو کر جینا چاہتا ہے۔ فرزانہ نے اپنی کوتاہ نظری کے ہاتھوں شب خون مار کر اس کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے اور آنکھ کے تارے بچے بھی جہنی طور پر اس سے جدا کر دیئے تھے۔ جتنی دیر وہ بچوں کے پاس ہوتا، ان کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لرزتی رہتیں۔ وہ اسے دیکھ کر بدکتے اور کوٹوں کھدروں میں چھپنے کی کوشش کرتے۔ بچوں بچوں وقت گزرتا جاتا تھا۔ محسن زیادہ افسردہ اور طول رہنے لگا۔ وہ بار بار فرزانہ کے کیس کو جو کہ فائل ہو چکا تھا، آگے چلانے کے لیے رضا سے الجھتا حالانکہ پہلے وہ اس بات کے خود بھی خلاف تھا۔

”دیکھو محسن سمجھنے کی کوشش کرو۔ ٹھوس ثبوت کے بغیر دنیا کا کوئی قانون کسی کو قاتل یا مجرم نہیں ٹھہرا سکتا۔ خاص طور پر کسی مقتدر ہستی پر الزام لگانا اور پھر ثبوت پیش نہ کرنا تو صریحاً جرم بن جاتا ہے۔“

”کئی لوگ ایسے ہیں جن پر صاف طور پر شبہ کیا جاسکتا ہے۔“ محسن پھڑکی جیسے ہونٹ چبا کر بولا ”جن کے ساتھ فرزانہ اکثر رہا کرتی تھی۔“

”شبہ تو پھر تمہاری ذات پر بھی کیا جاسکتا ہے۔ لوگوں کی اکثریت کو پتہ ہے کہ تمہارے درمیان ناچاقی تھی۔ یہ مت بھولو کہ مرنے والا مظلوم بن کر ہر ایک کی ہمدردی حاصل کر لیتا ہے۔“

”تو پھر پکڑو دادو مجھے ہی۔ تم دیکھتے کیا ہو؟“ محسن نے چڑکھا۔

”بکومت..... میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ ان لوگوں کو مجرم ثابت کرنے کے لیے، جو فرزانہ بھابھی کی

تھی۔ قتل کے شعبہ سے تعلق رکھنے والے جاسوس سادہ کپڑوں میں مکان کے ارد گرد گھوم رہے تھے۔ مگر قاتل نجانے کہاں گن بیٹھے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ٹیلیفون کی گھنٹیاں بار بار بجنے لگیں۔ افسوس کے لیے آنے والے لوگ ایک دوسرے سے منہ جوڑے کھسک پھسک کر رہے تھے لیکن چند دن کی کارروائی کے بعد پولیس نے کیس فائل کر دیا اور یہ کہہ دیا کہ اس سب کارروائی کے پیچھے محض چند ڈاکوؤں کا ہاتھ ہے جو کہ ایک خطرناک گروہ بن کر لوگوں کو لوٹنے پھرتے ہیں اور محسن کو بھی یہ کہہ کر تسلی دے دی کہ جلد ہی چوری کیے ہوئے زیورات بازیاب کر کے اسے واپس دلانے جائیں گے۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ جس شخص کے فرزانہ زیادہ قریب تھی اور شروع شروع میں بڑے بڑے آرڈرز پر سائن کرداتی رہی تھی، اس شخص کی بیوی نے فرزانہ کے وجود کو اپنی ذات کے لیے خطرہ سمجھ کر اسے راستہ سے ہٹوایا تھا اور بعد میں کافی عرصہ تک شہر میں یہ خبر بھی گرم رہی اور افواہیں گشت کرتی رہیں کہ شہر کی چند بااثر اور مقتدر ہستیوں نے دباؤ ڈال کر یہ کیس ختم کروایا ہے تاکہ اس داستان کے چند رنگین باب ان کے بارے میں بھی کہیں رقم نہ ہو جائیں۔

محسن کے حالات نے اسے زندگی کے عجیب دوراہے پر لاکھڑا کیا تھا۔ خود تو فرزانہ چلی گئی تھی مگر محسن کو نہ ختم ہونے والی اذیت کے کانٹوں پر سسکتا چھوڑ گئی تھی۔ ایک طرف بے وفا، جفاکار، غدار بیوی کی پراسرار موت اور دوسری طرف دو بچے جن کو محسن باپ سے زیادہ اپنی ماں کا قاتل نظر آتا تھا۔ اور ان کو اپنے خون سے بدگمان کرنے کی ذمہ دار بھی فرزانہ تھی۔ اس نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اپنی موت سے کئی مہینے پہلے بچوں کی برین واشنگ شروع کر دی تھی اور بات بے بات بچوں کو



ایک الگ صورت اختیار کرنے پر مصر تھا اور اس حالت میں جب اس کے ایک واقف کار نے اسے اس کے اس درد کی دوا ایک خوبصورت جام میں بھر کر پیش کی تو اسے پی کر محسن نے جانا کہ ہوش میں رہ کر اذیت کی ٹیسیں سہنے سے بہتر ہے کہ انسان مدہوش رہے اور پھر دو دن بعد جب وہ گھر لوٹا تو شراب کی نئی لذتوں سے آشنا ہو چکا تھا۔ اب اس کی الماری اور میز شیمین ریڈوائن اور دسکی کی بوتلوں سے بھری رہتی اور وہ گرد و پیش سے بے خبر ہر دم نشے میں غرق رہتا۔

رضانے جب اس کی یہ حالت دیکھی تو بے حد پریشان ہوا ”اس طرح تو تم تباہ ہو جاؤ گے محسن۔ زندہ درگور ہو جاؤ گے، یہ تم نے کس زہر کو منہ لگا لیا.....؟“

”لو پھر کیا ہوا، ایک دفعہ ہی تو مر جاؤں گا“ محسن نے ہنس کر سرشار ڈوبے ہوئے لہجے میں جیسے گنگناٹے ہوئے کہا ”روز جینے اور روز مرنے سے تو بچ جاؤں گا۔ کوئی مر جاتا ہے اور کوئی مر مر کے جیتا ہے..... ہیں؟ کیا ہے فلسفہ بولو؟“

”پینے کی بھی آخر کوئی حد ہوتی ہے۔ محسن۔ یہ سب تو خود کشی کے مترادف ہے۔“ رضانے اس کے ارد گرد خالی بوتلیں اور سگریٹ کے کھڑوں سے بھرے ایش ٹرے دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے مرنے سے ڈر نہیں لگتا۔ رضانہ۔ موت سے تو وہ لوگ ڈریں جن کو زندہ رہنے کی ضرورت ہو۔ مجھے تو نہ کچھ حاصل کرنے کی تمنا ہے۔ نہ کھو دینے کا اندیشہ۔ میرے لیے زندگی اور موت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔“ محسن نے جھومتے ہوئے لڑکھرائی زبان میں کہا۔ ”مجھے تو اک گونہ بے خودی دن رات چاہئے۔“

محسن کی اس حالت سے خوف زدہ ہو کر راحت

پراسرار موت کے ذمہ دار ہیں، ایسے ایسے حقائق اور رازوں سے پردہ اٹھانا بڑے گا کہ ہر طرف رسوا کن جھچکا پھیل جائے گا۔ لوگ تماشا دیکھیں گے۔ دنیا کسی کے اندر تو جھانک کر نہیں دیکھ سکتی۔ صرف سیکنڈز کی شوقین ہوتی ہے۔ اپنی ذات کا ڈھکھ صرف وہی جانتا ہے جو خود اس چتا میں دھمے دھمے جل رہا ہو اور پھر رسوائی تو موت سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے دوست۔“

”مگر رضا اس طرف رسوائی ہے تو اس طرف میرے جگر کے کلزے میرے بچے ہیں جن کے ذہنوں میں اس شک کے ناگ پھنکا کر رہے ہیں، کہ میں ان کی ماں کا قاتل ہوں۔ میں ان کو کیا منہ دکھاؤں رضا؟ کیا منہ دکھاؤں؟..... جب تک صحیح قاتل سامنے نہ آئیں گے۔ لاکھ سمجھانے کے باوجود مجھے ہی الزام دیتے رہیں گے۔ میں اپنی نظروں میں خود گر چکا ہوں۔ ان کی ملامت بھری سوالیہ لگا ہوں میں سمانی دہشت میرے سینے میں خنجر کی طرح پیوست ہو جاتی ہے۔ رضا بولو..... میں کیا کروں؟“ محسن ہاتھوں کی دونوں منھیاں بھینچ کر اپنے ماتھے پر مارتے ہوئے بولا ”میری تو وہ حالت ہے کہ ادھر آگ ہے تو ادھر پانی ہے۔“

میں کس کے ہاتھ پر اپنا لبو تلاش کروں سارے شہر نے پہننے ہوئے ہیں دستانے واقعی محسن کی حالت اس انسان کی سی تھی جس کا تمام متاع حیات چھن چکا ہو اور کسی لبق و قہر میں جلتی دھوپ کے نیچے کھڑا ہو۔ وہ ہر ایک سے منہ چھپائے پھرتا تھا۔ اس کے حلقہ احباب میں کتنی کے چند دوست ایسے تھے جن کو وہ اپنا کہہ سکتا تھا مگر اس موقع پر محسن کے جذبات ان سے مختلف تھے۔

تقدیر نے اس کے وجود کے کلزے کلزے کر دیئے تھے۔ اس کی زندگی کا ہر ایک حصہ اس سے باغی ہو کر

منکوں کی بڑی بڑی تسبیحیں ڈالے اور ہاتھوں میں کوزے لیے تارک الدنیا عبادت گزار لوگ، یا علی کے مست نعرے لگانے والے مجاوروں کے جھرمٹ، ہر طرف پھیلی ہوئی اگر بتی اور لوبان کی افسردہ کر دیئے والی بو جمل مقدس خوشبو، درگاہ کے مقبرے کی جالی پکڑ کر آہ بکا کرتے فریادی۔ حاجت مند۔ یہ بھی زندگی کا ایک رخ تھا مگر راتوں کو درگاہ کی پچھلی کوٹھڑیوں کے سامنے قش گالیاں بکتے، نشے میں دھت مجاوروں کے درمیان جوئے کی بازیاں لگتیں اور درگاہوں کے دوسرے گوشے بے نقاب ہوتے۔ ایک دن ہاتھ پائی کرتے ہوئے سگھم سگھما دو مجاوروں کو چھڑانے کی کوشش میں محسن بھی اس لپیٹ میں آ گیا۔ اب اس کی جان ہی کہاں تھی۔ وہ یہ سب نہ کر سکا اور اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ ایک مجاور اس کو اٹھا کر اپنی کوٹھڑی میں لے گیا اور کئی دن تک اس کی چوٹیں سینکنا رہا۔ ان ضمیر کے قیدیوں کے درمیان یہ مجاور فرشتہ رحمت ثابت ہوا۔ محسن کی شوریدہ سری نے اس کو ایسے حالات میں پھنسا دیا تھا کہ دیکھنے والے کا پتہ پانی ہو کر رہ جاتا۔ ہوش میں آتے ہی وہ جیسے انگاروں پر لونے لگتا اور اس کے تن من کھلساتی آگ کو بھنگ کا پیالہ ہی سر در کر سکتا۔ وہ اکثر غنودگی میں سر جھکائے ہوئے کٹھڑی بنا درگاہ کے کناروں پر پڑا ہوتا جہاں قریب ہی بھوکے ننگے فقیروں کے پرے کے پرے بیٹھے ہوتے، جن کے چروں پر اداسی اور محتاجی کی داستان لکھی ہوتی۔ ان کے کپڑوں سے جو کہ میلے پھتھروں کی طرح ہوتے، بو آرتی ہوتی۔ وہ ہر حاجت مند ہر گزرنے والے کے آگے ہاتھ پھیلاتے اور پھینکی ہوئی خیرات پر جیل کی طرح جھینٹے۔ لوگ محسن پر رحم کھا کر اس کے آگے بھی کچھ رقم پھینک جاتے جو کہ اسی طرح پڑی رہتی۔ کئی لوگ اس کی یہ بے نیازی دیکھ کر اسے

سے مشورہ کر کے رضا نے دونوں بچے ہاسٹل میں داخل کروا دیئے اور محسن کو اپنے ہاں لے آیا تاکہ اس کو نظروں کے سامنے رکھ کر اس کی بلا نوشی پر کچھ پابندی لگا سکے مگر پانی سر سے گزر چکا تھا۔ اس نے ہر اُس دوست کو دُکھ جانا جس نے اسے سمجھایا۔ وہ دوستوں کی پابندیوں کا حلقہ توڑ کر بھاگ آتا اور اپنی اسی تنہائی کی ریفیقہ کو گلے سے لگایا۔ اس حالت میں وہ کاروبار تو کیا چلاتا، اس کا پینک بیننس بھی اس لت کا متحمل نہ ہو سکا لیکن اس کی محسن کو پرواہ کب تھی۔ اسے تو اپنے سینے میں ڈھکے کی بھی سر د کرنے کے لیے دن رات کی بے خودی چاہئے تھے۔ اس نے جائیداد اونے پونے فروخت کر لی شروع کر دی۔ پھر جائیداد بھی کہاں تک لٹا تھ دیتی۔ پہلے محسن اپورٹڈ شراب پیتا تھا۔ اب ٹھڑا بھی مرغوب تھا بلکہ اس میں تو کچھ زیادہ تیزی تھی اور اتنی ہی تیزی سے محسن بھی تباہی کی طرف جا رہا تھا۔ اب وہ لنگال ہو چکا تھا۔ رضا کے پاس کس منہ سے جاتا۔ قرض خواہوں نے جب گھر پر بھی تالے ڈال دیئے تو سر چھپانے کو بھی جگہ نہ رہی۔ بے وفا فرزائے کی ذلت بھری موت کے حادثے نے محسن کی ہنسی کھیتی باعزت زندگی کا رخ موڑ کر اسے در بدر کر دیا۔ اسے ہولناک انقلاب سے دو چار کر کے رکھ دیا۔ اب وہ دوستوں کی نظروں سے چھپ کر مارا مارا پھرتا۔ اسے نشے کی جستجو رہتی۔ کوئی بھی نشہ جو اسے چند لمحوں کے لیے اپنے آپ کو بھلا دینے میں مدد دے سکے۔ جب اس کے پاس سر چھپانے کا بھی کوئی آسرا نہ رہا تو وہ ایک بزرگ کی درگاہ کی طرف جانکلا۔ وہاں کے مجاوروں نے جو گئے دم بیٹے غم کی تفسیر بنے چرس پی کر مست ہو رہے تھے محسن کا ہاتھ تمام لیا اور چرس اور بھنگ کے نشہ سے آشنا ہو کر محسن نے وہیں ڈیرہ ڈال لیا۔ ہاتھوں پر رکوع و سجود کے محراب سجائے، گلے میں

کراہنے کی ایسی آواز آئی جو اس کی روح میں نشتر کی طرح اُترتی چلی گئی۔ اس نے نظر اُتائی ہوئی آواز کی سمت دیکھا تو سامنے قریبی کوٹھڑی سے ایک مجاور کیوتروں کا دانہ لیے باہر آتا نظر آیا۔

”یہاں اندر کون کھائیں رہا ہے میاں؟“ بابارمضو نے بے چینی سے اسے پوچھا۔

یہاں سچی سرکار کے خادموں کے علاوہ کون ہو سکتا ہے بابا۔“ مجاور بے نیازی سے کہہ کر آگے چلا گیا۔ بابارمضو ایک لمحہ زکا اور پھر بے دریغ کوٹھڑی میں داخل ہو گیا۔ چند لمحوں بعد جب کوٹھڑی کی تاریک فضاؤں سے اس کی آنکھیں مانوس ہوئیں تو اسے سامنے ایک جھلنگا چار پائی پر ہڈیوں کا شجر نظر آیا جو سینے پر ہاتھ رکھ کر کھانسا اور پھر اس کے منہ سے ایک دلدوز آواز نکلی۔

”ہائے“

یہ آواز تو بابارمضو لاکھوں، کروڑوں آوازوں میں بھی پہچان سکتا تھا۔ وہ اس کے قریب گیا اور اس کی اُن بھی ہوئی لٹوں اور ڈاڑھی والا چہرہ اٹھا کر دیکھا۔ پھر اس کی رقت بھری جیج کوٹھڑی میں گونج اُٹھی۔

اور آج محسن کو ہسپتال میں داخل ہوئے تیسرا دن تھا۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اپنے ارد گرد اپنے دوستوں کو دیکھا جو کہ پریشانی سے اس پر نظریں گاڑے کھڑے تھے۔ اس دوران اسے گھوٹو اور دیگر طاقت کی کئی ڈرپس مل چکی تھیں اور اس کا باقاعدہ علاج ہو رہا تھا مگر وہ موت و زیست کی سرحد پر پڑا تھا۔ اس کی بحالی کی رفتار نہایت سُست تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ جس وقت بھی وہ پورے ہوش و حواس میں آتا۔ اُنھہ کر بھاگ جانے کی کوشش کرتا لیکن رضا کے علاوہ اس کے دو اور قریبی دوست ظفر اور اسد دن رات اس کی پوری چوکی پر مامور تھے۔ وہ باری باری اس پر ڈیوٹی دیتے۔ اس دفعہ انہوں نے صرف

کوئی پہنچا ہوا بزرگ سمجھتے اور اس کے گرد دعا کروانے کے لیے اکٹھے ہو جاتے لیکن محسن پاتال کے اس عالم کی سیر کر رہا ہوتا تھا جہاں ان کی آوازیں تک نہ پہنچ سکتی تھیں۔ بس چرس اور بھنگ کے جام ہی اس کی سانسوں کا رشتہ اس کے جسم و جاں سے جوڑے ہوئے تھے اور اسی مدھوشی میں وہ زندگی کے باقی سانس بھی پورے کرنا چاہتا تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ محسن کا حلیہ اس طرح تبدیل ہو گیا کہ کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ بڑی ہوئی ڈاڑھی اور اس کثیف و بوسیدہ لباس میں یہ آدی کوئی چرس و بھنگ کے نشہ میں سرشار ملک نہیں بلکہ یہ تو ایم اے پاس کامیاب بزنس مین صاحب جائیداد ایک خوب رو اور زندہ دل انسان تھا جو کبھی کبھوں کی محفلوں کی جان تھا۔ دوستوں کا، مرجان مرخ اونچے اونچے قہقہے لگانے والا ہنس مکھ اور بے فکر دوست تھا اور جب دنیا کی یہ زمین اس کے پاؤں تلے سے کھسک گئی تو وہ دھڑام سے اس پاتال میں آگرا اور یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ اس کو گرد و پیش کی کوئی خبر نہ تھی۔ اس کی اس مدھوش دنیا میں نہ کوئی کیلنڈر تھا نہ گھڑی۔

یونہی کئی ماہ گزر گئے مگر محسن اس غم کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی سخت جان ثابت ہوا۔ رضا اور راحت کے علاوہ اس کے اور بھی کئی دوستوں نے اس کو ڈھونڈنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی مگر مزاروں کی طرف کسی کا خیال نہ گیا تھا۔ بابا رمضو جو کہ محسن کا پرانا خدمت گار تھا اور محسن کا بچپن بھی اس کی گود میں گزرا تھا۔ مزاروں پر جا کر اس کی برآمدگی کیلئے جھولی پھیلا پھیلا کر فریادیں کرتا مگر اسے بھی یہ کہاں معلوم تھا کہ اس کا گوہر مقصود یہیں کہیں کسی درگاہ پر دھول خاک میں زل رہا ہے۔

آج صبح وہ اسی درگاہ پر گرہی وزارت کرنے کے بعد باہر نکلا تو جوتا پہنتے ہوئے اسے کھانسنے اور پھر



کے لیے منشیات کا استعمال کرتا ہے تو اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دوسری منشیات کی نسبت بھنگ، چرس بے ضرر ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بھنگ یا چرس کا بھی دل و دماغ پر وہی اثر ہوتا ہے جو دیگر منشیات کا۔ ایسے چرس اور بھنگ پینے والوں کی کافی تعداد ہے جن کو عین خودکشی کے وقت پچایا گیا۔ دیکھا گیا ہے کہ اکثر لوگوں کو چرس نوشی کی ترغیب یہ کہہ کر دلائی جاتی ہے کہ چرس بے ضرر چیز ہے لیکن نئی نسل کے وہ نوجوان لڑکے لڑکیاں جو اس وقت بہروئن اور دیگر قسم کی منشیات کے عادی ہو چکے ہیں، انہوں نے ابتداء بھنگ یا چرس سے ہی کی تھی۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی آف کیلیفورنیا کے شعبہ صحت کے ڈائریکٹر ڈاکٹر براؤن کا کہنا ہے کہ چرس نوشی سے جسمانی درد ہسٹریا اور ذہنی خلفشار پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح جیسا کہ اس وقت ہمارے اس نوجوان مریض میں یہ علامات پائی جا رہی ہیں۔“ ڈاکٹر نے حسن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ تو حسن نے انتہائی بیزارگی سے منہ پھیر کر آنکھیں بند کر لیں۔ ڈاکٹر نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا، ”اس سلسلے میں چرس میں موجود ”نیٹرہائڈروکینا بائیو نال“ نامی کیمیائی مادہ انسانی جسم میں پائے جانے والے بنیادی جینیاتی ذرے ”ڈی این اے“ میں مل کر روایتی خصوصیات کو بھی ختم کر دیتا ہے۔ اور اس کے علاوہ خون کے سفید خلیے جو دماغ کے لیے بے حد ضروری ہے، ان کو بھی برباد کر دیتا ہے، سو میرے عزیز دوستو! تم میں سے جو مرد آب بھی کہے کہ:-

گلستان میں گھوم لیتا ہوں بادہ خانوں میں جھوم لیتا ہوں  
زندگی جس جگہ بھی مل جائے اس کے قدموں کو چم لیتا ہوں  
اسے خبر دار ہو جانا چاہئے۔“ ڈاکٹر ہنستے ہوئے حسن کی طرف دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے قریب

زبانی سمجھانے پر استغناء کیا بلکہ جواباً کارروائی کی اور اس کے خاصے ہاتھ پاؤں مارنے کے باوجود اس کی ایک نہ چلنے دی۔ مٹکی چٹ، جوؤں بھری جٹاؤں کی حجامت کروا کر سیٹ کرایا۔ چہرہ حسب سابق کلین شیڈو کروانے اور غسل کے بعد اُبلے کپڑے پہنانے کے بعد وہ ٹھہرا کھڑا سا زرد و زردی مگر معصوم بچہ معلوم ہونے لگا جو کہ آنکھیں کھول کر ہوش میں آتے ہی کھانے پینے کی چیزیں اٹھا کر بیچ دیتا اور نشہ مانگتا۔ نشے کی طلب سے اس کی حالت غیر ہونے لگتی۔ وہ تمام جان سے لرزے لگتا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اٹھنے لگتے۔ زبان کپکپانے لگتی اور ایسے معلوم ہوتا جیسے کہ وہ اب آخری سانسوں پر ہے۔ وہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر ہکلاتے ہوئے ایک ایک دوست ایک ایک نرس اور ڈاکٹر کا منہ دیکھتا، ان کی منت سماجت کرتا مگر اسے کسی کے چہرے پر بھی اپنے لیے ترس کی جھلک نظر نہ آتی۔ دوست یا ایسی کیفیت میں اس کو بُری طرح نظر انداز کر کے آپس میں سنجیدہ گفتگو کرتے۔ ایسی ایسی باتیں کرتے جو اس کی سماعت پر بارگزر تھیں لیکن اس کا بس نہ چلتا کہ کس طرح ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر وہاں سے چلتا بنے اور اپنی اسی دنیا میں پہنچ جائے۔ خصوصاً اسے وہ ڈاکٹر جو کہ ظفر کا دوست تھا زہر لگتا۔ وہ اس کے کمرے میں اکثر آکر بیٹھ جاتا اور منشیات کے خلاف لیکچر دیتا۔ آج پھر وہ کچھ بتا رہا تھا اور رضا، ظفر اور اسد بہترین گوش ہو کر اُس کی باتیں سن رہے تھے۔

”مغرب کے ڈاکٹر لکی موہان، جو ایک ایسے ادارے کے ڈائریکٹر ہیں جہاں سے اب تک تین ہزار سے زائد مریض اپنا علاج کروا کر منشیات سے چھٹکارا حاصل کر چکے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایک شخص جو روزمرہ کے مسائل خواہ وہ معاشرتی ہوں، گھریلو ہوں، یا تعلیمی، ان سے فرار حاصل کرنے

دیران اور پیاسی خشک آنکھوں سے نجانے کہاں سے آنسوؤں کا سیلاب امنڈ پڑا اور اس کے چہرہ پر ہونٹ سسکیوں سے لرزنے لگے ..... ظفر یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح محسن کے اندر سے صدیوں کا بیٹھا ہوا تہہ در تہہ جمود ٹوٹے۔ غم و اندوہ اور آنسوؤں کا جویلاب اس نے اپنے اندر چھپا رکھا ہے، وہ بند توڑ کر باہر آئے اور اس کے پھرائے ہوئے دل و جان کو دھوکہ گداز کر دے۔ ظفر درود شریف پڑھتا جا رہا تھا اور محسن پر ایک وجدانی کیفیت طاری تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو امنڈ امنڈ کر اس کی صدیوں کی پیاسی روح کو سیراب کیے جا رہے تھے۔ اس کے اندر کا سناٹا ٹوٹ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ظالم دنیا کے ستائے ہوئے دیران خانہ دل میں کوئی سارہا ہے اور ایک عجیب سا احساس اس کے جسم و جان میں تحلیل ہو رہا ہے۔ ظفر نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ عبادت ایک عجیب سرمستی اور نشہ کی طرح محسن کے وجود پر طاری ہوتی گئی۔ ایسے محسوس ہوتا جیسے ایک نہایت ٹھنڈا ٹھنڈا روح کو سکون دینے والا مرہم ہے جو اس کے زخموں سے لہو لہو جسم پر پھیل جاتا ہے اور اس کی چڑھی ہوئی آداس آنکھیں، آہستہ آہستہ مند جاتیں ..... اب وہ نارٹل ہو رہا تھا اور اس نے شراب اور دوسری منشیات کے لیے ضد کرنی بھی چھوڑ دی تھی۔ اس کے دوست اب پُر امید ہو رہے تھے لیکن پھر بھی کھارا یا ہوتا کہ اس پر درود پڑ جاتا۔ اس کے پُر سکون چہرے پر کڑھکی آجاتی۔ آنکھیں پتھرا جاتیں اور جڑے سخت ہو کر جم جاتے مگر پھر یکدم ہی جیسے اسے کچھ یاد آ جاتا۔ اس کا لرزتا ہوا ہاتھ جیب کی طرف جاتا اور جیب میں پڑھی سیج کو مٹھی میں سمیٹ لیتا۔ ایک ٹھنڈی آہ کے ساتھ اللہ کا نام اس کے سانسوں پر تیرتا ہوا اس کے سینے سے باہر آ جاتا۔ اور اس کی پھرائی ہوئی

جا کر اس کی پیٹھ پر چھکی دیتے ہوئے بولا۔  
”اودہ کم آن یگ مین۔ بہادر بنو۔ زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانا سیکو۔ فرار سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ شاہباش دوا کی پی پی تم نے۔ دیکھو اب تم جلدی سے ٹھیک ہو رہے ہو۔ بس ذرا حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہے ..... اچھا دوستو.....“

"Wish you all the best of luck" یہ کہہ کر ڈاکٹر باہر نکل گیا۔

اب محسن آہستہ آہستہ سنبھل رہا تھا۔ دوست احباب کی مخلصانہ کوششیں اب رنگ لانا شروع ہو گئی تھیں۔ وہ مسلسل اس سیلاب میں بند باندھنے کی کوشش میں مصروف تھے، جو کہ محسن کے وجود کو نیکے کی طرح بہائے لیے جا رہا تھا۔ اس آگ کو بجھانے کی کوشش کر رہے تھے جس کی سوزش نے اس کا تن من جھلسا کر رکھ دیا تھا اور اب کافی حد تک ان کو اپنی اس کوشش میں کامیابی کا احساس ہو رہا تھا۔ محسن خاصا سنبھل تو گیا لیکن اس کی خوبصورت آنکھیں جو کبھی زندگی کی چمک سے معمور تھیں اب وہ دیران خانے تھے، چہرہ سنا ہوا تھا اور جڑے ایک انجانے جذبے سے جھنجھے رہتے تھے جیسے وہ روح اور جسم کا رشتہ جوڑے رکھنے کے لیے پوری قوت صرف کر رہا ہو۔ ان دوستوں میں ظفر ڈاکٹروں کی طرف سے پوری طرح مطمئن نہ تھا چنانچہ اب ایک ماہ کے بعد وہ اسے ہسپتال سے فارغ کرا کے گھر لے آیا۔ وہ خود طبعا مذہبی اور دین دار شخص تھا اور اسے عبادت سے کافی شغف تھا۔ اس نے ایک دن محسن کے ہاتھ میں سیج پکڑا دی اور خود درود شریف پڑھ کر اسے بھی دہرانے کو کہا۔ محسن مذہب سے پہلے بھی بیگانہ تھا اور پھر کچھ عرصہ سے تو اس کے ہاتھ صرف بوتل اور جام پکڑنے سے آشنا تھے۔ لیکن جو بنی اس کے ہاتھ میں سیج آئی اور اُس نے ابھی ”اللہ“ ہی کہا تھا کہ اس کی

میں گفتگو کرتا۔ جب وہ اپنی لمبی لمبی پلکوں والی غلافی آنکھیں اٹھا کر دوسروں کو دیکھتا تو معلوم پڑتا کہ یہ آنکھیں بیداری میں کوئی المناک خواب دیکھ رہی ہیں۔ گورنگ اب ساناوٹا ہو گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ہنسنا مسکرانا سب کچھ بھول گیا ہے۔ بہت ہوا تو تراشیدہ ہونٹوں کے کونے ذرا دب سے گئے۔ جیسے وہ ہنسانے کی کوشش کرنے والے کا دل رکھ رہا ہے۔ بعض دفعہ ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھ رہا۔ اگرچہ اب وہ کافی حد تک نارمل ہو چکا تھا تاہم نہ اسے لباس کی پروا تھی نہ کسی اور چیز کی۔ مکتبے اور پرشمن لباس میں وہ متضاد سی شخصیت معلوم ہوتا تھا۔ حالانکہ وہ اب بھی کافی جاذب نظر انسان تھا لیکن بے حسی کی کیفیت اسے اب اس صحرا میں لیے پھرتی تھی جہاں نہ سرسراتے ہوئے خوبصورت حریری لباس تھے نہ حسن و شباب کی محفلیں اور نہ ہی سرور آگئیں کھلتے ہوئے قہقہے۔ کبھی وہ کلبوں اور قصبے کا ہوں کا زندہ دل و سر مست ممبر تھا، اور آج اسے تقدیر کس ڈگر پر لے آئی تھی۔

اب دوست احباب نے اس کی طرف سے قدرے اطمینان کا سانس لیا تھا کہ وہ پھر ایک دن غائب ہو گیا۔ سخت پریشانی کے عالم میں رضا، ظفر اور اسدا اسے اسی درگاہ پر ڈھونڈنے آئے مگر وہ وہاں نہ مل سکا۔ شہر میں جتنی درگاہیں تھیں انہوں نے کھنگال ڈالیں۔ واپسی پر انہوں نے سوچا کہ شاید مسجد میں نہ چھپ گیا ہو تو قریبی مسجد میں کھس گئے۔ وہاں لاؤڈ سپیکر پر مولوی صاحب چندے کی کی ایمل کر رہے تھے۔ بار بار لاؤڈ سپیکر پر ایک نعت کا بند دہراتے اور جب کوئی نمازی آگے بڑھ کر قمر پیش کرتا تو وہ رُک کر کہتے ”جزاک اللہ..... بارک اللہ..... اللہ کا روبرو میں برکت دے، مشکلیں آسان کرے۔ یہ دیکھو جی میاں نبی بخش نے دس روپے کا

آنکھوں میں آہستہ آہستہ چمک ابھرنے لگتی۔ بھیجنے ہوئے لب داہو جاتے۔ چہرے سے کرنٹنی تحلیل ہو کر اس پر ایک نور سا کھڑ جاتا۔ اس کے لب آہستہ آہستہ ہلنے لگتے اور وہ خود جیسے وجد کے سے عالم میں جھوم جھوم کر ذکر الہی میں مشغول ہو جاتا۔

”گمیا کام سے“ دوسرے دوست اس کی یہ حالت دیکھ کر مذاق سے قہقہے لگا کر کہتے مگر ظفر نہایت سنجیدگی سے کہتا۔

”ارے نہیں دوستو..... یہ تو اب واپس آ رہا ہے لیکن ایک نئے راستے سے..... یہ راستہ ذرا دشوار تو ہے لیکن اولیاء اللہ کی درگاہوں پر بے غرض پڑے رہنے والوں کو بھی خدا خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا۔ اب تم دیکھ لینا، آہستہ آہستہ ایک نیا شخص تشکیل پائے گا۔ وہ تو شکر ہے کہ یہ ہمیں مل گیا اور ہم اسے اٹھا لائے“ ظفر خوش ہو کر بولا۔

”جانے دو بار پھر ہم کچھ کہیں گے تو تم ناراض ہو گے“ ایک دوست ہنس کر بولا تو ظفر سنجیدہ ہو کر کہنے لگا۔

”میں نے بھی اپنا نظریہ بیان کیا ہے۔ باقی میں نے ہر کسی کی سوچ کی اجارہ داری تو نہیں لے رکھی ویسے“ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست والی بات ہے۔ اور واقعی جب محسن پوری طرح تندرست ہو کر چارپائی سے اٹھا تو اس کا دوسرا روپ جس نے دیکھا حیران رہ گیا۔ لوگ دیکھتے کہ ایک جوان سال ڈبلا پتلا لمبے قد کا انسان نظریں جھکائے دنیا و مافیہا سے بے خبر کسی فکر میں غلطاں و پچلاں اپنی ہی ذات میں گم جیسے کسی جتو نے مضطرب کر رکھا ہو۔ چہرے پر بے چینی اور تجسس لیے آہستہ خرازی سے کبھی بھی ادھر سے ادھر آتا جاتا نظر آتا ہے۔ ناواقف لوگ اس پر کبھی کبھار مزاحیہ فقرہ بھی چست کر دیتے جس کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ وہ نظریں جھکا کر دھیمے دھیمے لہجے



سیارہ ڈائجسٹ کی حسبِ روایت ایک اور عظیم پیشکش

شائع  
ہو گیا  
ہے۔

# والدین نمبر

قیمت 175 روپے

- ایک تاریخی دستاویز جو انشاء اللہ یقیناً ہر گھر کی کامیابی اور فلاح کا ذریعہ بنے گی۔
- جس میں قرآن اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں:
- والدین کے فضائل، آداب، حقوق، فرائض اور ان کے شایانِ شان مستند مواد اور محکم استنباط پر مبنی واقعات اور دیگر مواد کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

ہر گھر میں پیار و محبت  
کی تحریک کا آغاز کیجئے

خود بھی پڑھیے اور دوسروں  
کو بھی پڑھائیے

سیارہ ڈائجسٹ - 240 مین ماریٹ ریوارز گارڈن لاہور  
فون: 042-37245412

نوٹ دیا ہے“ اور پھر نعت کا بند دہرانے لگتے اور اب مولوی صاحب غصے سے بھرے ہوئے لاؤڈ سپیکر پر چلا رہے تھے۔

”ارے ارے یہ آپ لوگ دیکھ رہے ہیں ان کو، جو چندہ دیئے بغیر بھاگے جا رہے ہیں، ابی صاحب انہوں نے تو مسجد کو حجام سمجھ رکھا ہے۔ نہ لینا نہ دینا آئے اور نہائے چل بھی..... کیوں بھی کیا یہ ایک ایک روپیہ بھی مسجد کی مرمت کے لیے نہیں دے سکتے؟“

اتنے میں ایک شخص چادر میں منہ چھپائے ہوئے آگے بڑھا اور مولوی صاحب کو کچھ رقم دینے لگا۔ رقم دے کر جو نبی وہ پیچھے ہٹا۔ مسجد کی چٹائی سے اُلٹھ کر لڑکھڑایا اور اس کی چادر کی ہلکھل گئی۔

”حسن!“ تینوں دوست جو ابھی ابھی مسجد میں داخل ہو کر دروازہ میں قریب ہی کھڑے تھے بیک آواز بولے اور فوراً آگے بڑھ کر اس کو گھیرے میں لے لیا پھر اسے ایک طرف لے گئے اور پوچھنے لگے۔ ”کیوں بھی ہم تمہیں سارے شہر میں ڈھونڈ آئے اور تم یہاں چھپے بیٹھے ہو، کیا ہوا ہے بتاؤ نا.....؟“ رضائے کہا۔

حسن خاموش رہا مگر اس کے تیوروں سے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کہنا چاہتا ہو۔

زیر دیوار بیٹھے ہیں تیرا کیا لیتے ہیں ”معلوم ہوتا ہے قوطیت کا بھوت پھر سے سوار ہو گیا ہے سر پر۔ ارے میاں کچھ تو بول“ رضا جھنجھلا کر بولا۔

”ارے یہاں کیا تم اس سے تفتیش کر رہے ہو۔ گھر جا کر پوچھ لیتا نا۔ چلو بھی حسن“ ظفر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”میں نہیں جاؤں گا تمہارے ساتھ“ وہ ہاتھ چھڑا کر بولا ”کیوں کیا کسی نے کچھ کہہ دیا ہے تمہیں؟“ رضائے پوچھا ”آخر کیوں نہ جاؤ گے؟“

اسد نے کہا ”کیا اب اس مسجد میں ڈیرہ جمانے کا خیال ہے؟“

”بات دراصل یہ ہے کہ میں نے بہت دن بوجھ بن لیا تم پر۔ اب ہمیشہ ہی مجھے مفت کی روٹیاں توڑتے ہوئے شرم آتی ہے۔“

”تو نہ تو زو و مفت کی روٹیاں۔ تم کام بھی تو کر سکتے ہو نا“ اسد برس کر بولا۔

”میں نارل انسان نہیں ہوں۔ نامساعد حالات نے میرے قدموں کی طاقت چھین لی ہے۔ میرے حوصلے ٹوٹ چکے ہیں۔“ حسن نے دلگیر ہو کر کہا ”مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی کیا کروں؟“

”حوصلے ٹوٹ گئے تو کیا ہوا۔ یہ کیوں بولتے ہو؟ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے تمہیں ٹوٹ کر چاہا ہے اور اب بھی چاہ رہے ہیں۔ یہ یاد رکھو حسن۔ اگر ایک دفعہ پھر تم ہمارا ساتھ چھوڑ کر قوطیت کے گھنے جنگل میں کھو گئے تو پھر ہم تمہیں کبھی نہ پائیں گے۔ اس وقت ہم تمہیں جذبات کی دنیا سے نکال کر خائب و توازن دکھا رہے ہیں اور اگر تم نارل نہیں ہو تو ہم تو پریکٹیکل ہیں۔ تم ہم پر بھروسہ کرونا اور چلو ہمارے ساتھ۔ تم جس طرح چاہو گے اس طرح ہوگا۔ تم میری ہی فرم میں سے کوئی بھی کام پسند کر سکتے ہو۔“ اسد نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”اور پھر ایسا ہوا کہ اسد نے جو کہ بہت بڑے برنس کا مالک تھا، اسے چھوٹے چھوٹے کام دینے شروع کر دیئے جو حسن نے بہ احسن و خوبی کر دکھائے۔ جب اسد نے دیکھا کہ ابھی حسن کی صلاحیتوں کو زندگی نہیں لگا۔ تو کچھ وقفے کے بعد اسد نے منافع کی رقم حسن کو لوندا دی اور حسن نے تھوڑے سرمایہ سے اپنا ذاتی کام شروع کر دیا۔ جس میں اس کو کامیابی ہونا شروع ہو گئی۔ اور اس کے اثاثہ میں بتدریج اضافہ ہونے لگا۔ حسن کو اب دو ہی کام تھے

رہے تو پھر انسان کہاں رہتا ہے۔ انسان تو مہذب انسانوں میں پہچانا جاتا ہے۔ وہ اپنے کردار عمل کی بنا پر سماجی زندگی میں بحیثیت انسان گردانا جاتا ہے۔ درگاہوں کے تکیوں، تاریک کونوں کھدروں میں چھپ کر میری انگلیں میرے دلوں میری زندگی کے مقاصد غرض ہر چیز نشتے میں ڈوب کر تحلیل ہو جاتی تھی۔ پہلے میں سوچا ہی کرتا تھا مگر میں نے نوٹ کیا کہ جوں جوں میں نے سوچنا بند کر کے خود کو مکمل طور پر مدہوشی کے سپرد کر دیا جیسے بھری ہوئی لہروں سے لڑتے لڑتے ملال کشی لہروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دے، تو میں سب کچھ بھول گیا۔ دراصل میری بھی وہ بات تھی کہ جیسے آسمان سے گرا کھجور میں انک جائے اور جب کھجور سے اترنے لگے تو دلدل میں جا پھنسے۔ ہاں وہ دلدل ہی تو تھی۔“ باتیں کرتے کرتے پھر محسن کے جڑے بھینچنے لگے اور چہرے پر کرب نمودار ہونے لگا۔

”مجھے سمجھ نہیں آئی محسن، تم میدانِ عمل چھوڑ کر کیوں بھاگ لگے؟“ ظفر جو محسن کی باتیں چپ کیے سن رہا تھا، خشکی بھرے لہجے میں بولا ”کیا اس لیے کہ اس دنیا کے چند بے ضمیر اور گھٹیا کردار کے لوگوں نے تم سے misbehave کیا؟ یا پھر کیا ہوا! اس دنیا میں کیا کچھ نہیں ہوتا رہتا۔ تم کو پہلے آدمی تو نہ تھے۔ جس کے ساتھ ایسی انہونی ہوگئی اور پھر یہ مت بھولو کہ جو ہوا وہ سب دستِ غیب کا چکر تھا۔ خدا کے حکم کے بغیر تو پتا بھی نہیں مل سکتا اور پھر ہم نہیں سمجھ سکتے کہ خدا کے کس کام میں کس بہتری کا راز پوشیدہ ہے۔“ ظفر نے جلدی سے محسن کے ہاتھ میں تسبیح پکڑاتے ہوئے کہا۔

تسبیح پکڑتے ہی محسن کو دوبارہ ہوش آنے لگا۔ اس کے چہرے پر کھٹکی کی جگہ ایک نور سا پھیل گیا۔ وہ جلدی جلدی تسبیح کے دانے گرانے لگا۔ اس کے

دن بھر اپنے کاروبار میں محنت کرنا اور راتوں کو عبادت میں مصروف رہنا۔ وہ نہایت خاموشی سے سادہ زندگی گزارتا۔ دوست جب بھی اس کے ارد گرد گپ شپ لڑانا شروع کرتے، وہ خاموشی سے جیب سے تسبیح نکال کر پڑھنے لگتا۔

”ارے بھی کچھ تم بھی ادھر ادھر کی بات کیا کرو۔ دیکھو تو دنیا میں کیا ہو رہا ہے“ اس کے دوست اسے چھیڑتے ہوئے کہتے۔

”کچھ بھی مختلف نہیں ہے یارو۔ چھوڑو اب اس دنیا کے قصے نہ دہراؤ“ وہ بیزاری سے کہتا۔

”پھر بابا میں باز آیا اس دنیا سے۔ دنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں، اب دنیا دنیا کون کرے۔“

”لیکن بھئی یہ تمہارا چپ کار وزہ بھی تو ہمیں کھٹکتا ہے نا۔“ اسد ہنس کر کہتا۔

”دراصل بات یہ ہے کہ دوستو“ محسن کچھ سوچ کر بولا ”انسان اگر منہ سے چپ رہے تو ادراک کہاں کہاں لئے پھرتا ہے اور پھر میرے ایک بات نہ کرنے سے تمہیں کیا فرق پڑ جاتا ہے۔ اس پر ظفر پھڑک اٹھا ”واہ کیا بات سے بات نکالی ہے بھئی۔ وہ جو کیا کہتے ہیں کہ:-

صلائے عام ہے یا رانِ نکتہ دان کے لیے مگر یا محسن ہمیں تو ضرور فرق پڑتا ہے تمہارے بات نہ کرنے سے۔ دیکھو نا انسان کو سوشل اینٹیل کہا ہی اسی لیے جاتا ہے کہ وہ باہمی بات چیت میں حصہ لیتا ہے۔“ ظفر نے کہا۔

”شاید میں انسان ہی نہیں رہا سا تھو“ محسن کا ذہن متلاطم ہونے لگا۔ اسے ایسے لگ رہا تھا جیسے دور کوئی سسکیاں لے کر رو رہا ہو لیکن یہ اس کی اپنی ہی آواز تھی جو ماضی کے وحشت ناک کھنڈروں میں سے ابھر رہی تھی۔ وہ زہر خند مسکراہٹ سے جیسے کراہتے ہوئے بولا ”انسان انسانوں سے دور



کہہ کہہ کر جب ہار گئے اور حسہ ٹس سے مس نہ ہوئیں تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا اور حسہ ایم بی ایڈ کر کے مس ملک بن گئیں۔ اپنی غیر معمولی ذہانت اور خداداد صلاحیتوں کے طفیل پرنسپل کے عہدے پر پہنچنے میں دیر نہ لگی مگر تعلیم کی مزید گریاں حاصل کرنے میں وہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہو گئیں۔ ویسے بھی دنیا کی رنگینوں نے تو مرنے والے کے ساتھ ہی منہ موڑ لیا تھا۔ میک اپ سے بے نیاز چہرے پر لاناہی پلکوں والی اداس اداس بڑی بڑی آنکھوں سے جو دوسروں پر نگاہ ڈالتیں تو ہنسنے ہوئے چہرے بھی اک بار سنجیدہ ہو جاتے۔ اب آکر جو سٹڈی کرنے کی وجہ سے چند ایک چاندنی کے تار بالوں میں آگئے تھے، ان کو ایسے فخر سے ماتھے پر سجایا گویا یہ بھی کوئی ویسی ہی ثرافیاں ہوں جن سے ان کی الماری بھری ہوئی تھی۔ سابقہ زندگی کی ناکامی اور محرومی کے رد عمل نے ان کو زور و زنج بٹا دیا تھا۔ وہ اپنی حسرتوں کی لاش سینے پر لگائے غیر یقینی مستقبل کے دھندلکے میں اس ویران راہ گزر پر کھڑی تھیں جہاں کسی نئی آہنگ، نئی تھمنا کا چاند طلوع نہیں ہوتا۔

آج کافی تھکا دینے والے آفس ورک کے بعد گھر آکر وہ ذرا آرام کرنے لیٹتی تھیں کہ باہر سے پھر شور کی آوازیں آتی شروع ہو گئیں۔ کوشش کے باوجود وہ جب سونے لگیں تو آواز دے کر آیا کو نکلیا۔

”آیا، باہر سے کیا شور و غل کی آوازیں آ رہی ہیں؟ میں ایک منٹ کے لیے نہیں سو سکی۔“

”مس صاحب یہ جو سامنے سکول کی نئی عمارت بن رہی ہے نا۔ اچھی بھلی، اس کی کافی اونچی دیواریں بن چکی تھیں۔ تو اب اس کا ٹھیکیدار ان کو پھر گرا رہا ہے یہ سب وہی شور ہے“ آیا نے بتایا۔

(جاری ہے)

ہونٹ آہستہ آہستہ اللہ کے ذکر سے ہلنے لگے اور آنکھیں منہ لگیں تو سب اسے اس کے حال پر چھوڑ کر آپس میں دھیمے دھیمے باتیں کرنے لگے۔

”یار ایسا انسان جو کہ اللہ کا نام سنتے ہی پھل کر موم ہو جاتا ہے، یہ سوچ کر حیرت کے ساتھ ترس بھی آتا ہے کہ کس طرح اتنی بڑی آزمائش سے دوچار ہو گیا“ اسد نے آہستگی سے کہا۔

مگر ظفر نے یہ کہہ کر بات کا رخ تبدیل کر دیا ”ارے بھی اب چھوڑو بھی اس موضوع کو کوئی اور بات کرو۔“

ڈوبتا تھا سو ناؤ ڈوب گئی  
کیا کہیں کس کی ناخداہی تھی؟

گورنمنٹ ہائی سکول فار گرلز کی پرنسپل مس حسہ ملک سکول کی وسیع و عریض بلڈنگ سے ملحقہ اوپر کے تین کمروں میں رہتی تھیں کیونکہ تیس سال کی عمر میں پہنچنے کے باوجود وہ فی الحال ”مس“ ہی تھیں لہذا اکیلی جان اور تنہائی کے خیال سے دور رہنا پسند نہ کرتیں۔ ان کے پرنسپل اور باوقار سر آپے کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ وہ جوانی میں خاصی قیامت ہوں گی۔ ان کی تمام زندگی میں صرف ایک ہی شخص ان کی دل کی دھڑکنیں تیز کرنے میں کامیاب ہو سکا۔ وہ ان کا منگیترا تھا۔ ایک نڈر جیالا اور خیر و ہوا باز جو 1965ء کی جنگ میں دشمن کے جہاز پر شاہین کی طرح لپکا تھا مگر خود اس کو زمین پر صحیح و سلامت آنا نصیب نہ ہو سکا تھا۔ مس حسہ بے چاری زندگی کی خوشیوں سے اس وقت محروم ہوئیں جب ان کے ارمانوں کے پھول کھلنے والے تھے۔ قسمت نے نجانے کیسا سنگین مذاق کیا تھا ان سے اور پھر اس کے بعد حسہ کی نگاہوں میں کوئی بھی نہ سا سکا۔ اور اب تک شادی نہ کرنے کی یہی وجہ تھی۔ مگر والے